یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

جواب حاضر ہے

آیت اللہ سید عبد الحسین دستغیب
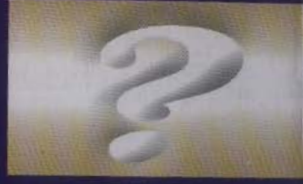
حسن علی بک ڈپو

جواب حاضر ہے
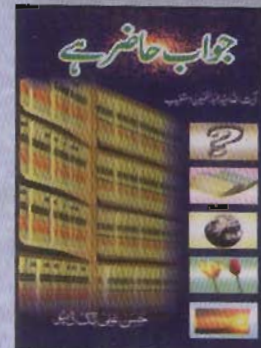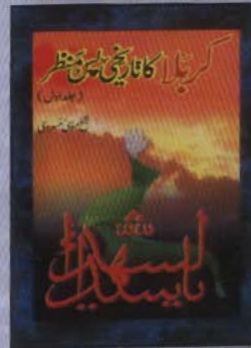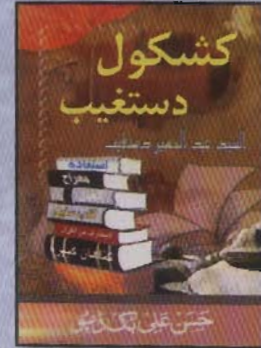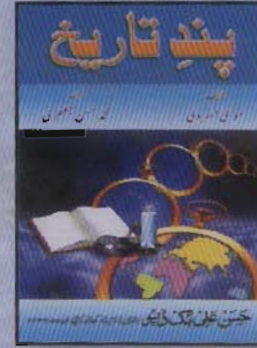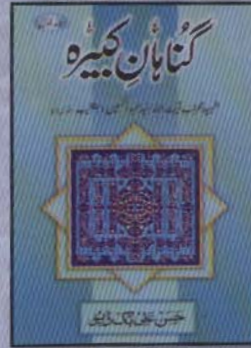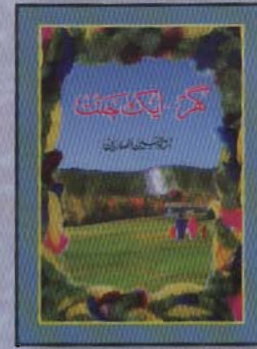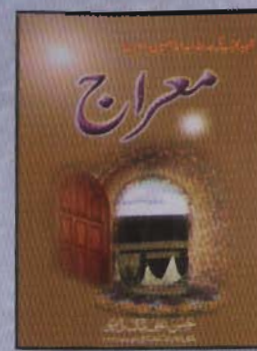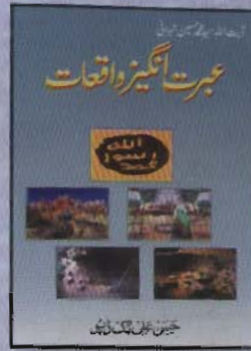
حسن علی بک ڈپو

کیسٹ نذر عباس

۸۲ مسئلے

جواب حاضر ہے

شہید محراب آیت اللہ

سید عبد الحسین دستغیب

محمد علی بک ڈپو

اینڈ آڈیو، ویڈیو، سی۔ڈی۔سینٹر
زوہرا گارڈن، دوکان نمبر 2، سولجر بازار،
نزد محفل شاہِ خراسان، کراچی۔
فون:021-2242091 موبائل:0300-2985928

حسن علی بک ڈپو

بالمقابل بڑا امام باڑہ۔ کھارادر کراچی فون ۲۴۳۳۰۵۵

محمد علی بک ایجنسی (اسلامی ثقافتی مرکز)

امام بارگاہ امام الصادق G-9/2 اسلام آباد ۔ 0321-5291921
امام بارگاہ حسینی سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی ۔ 0321-5291922
امام بارگاہ مرکزی چکوال ۔ [illegible]

کتاب ---------- جواب حاضر ہے

تالیف ---------- شہید محراب آیت اللہ دستغیب

ترجمہ ---------- محمد حسن جعفری

تصحیح و تکمیل ---------- سید فیضیاب علی

طبع اول ---------- ۲۰۰۱ء

فہرست عناوین

مصری اسکالر محمد قطب کے مقالے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مترجم

حضرت آیت اللہ سید عبدالحسین دستغیب شیرازیؒ کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کا شمار ایران کے اسلامی انقلاب کے معماروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے دروس سے لوگوں کی رہنمائی فرمائی، شکوک و شبہات کے بادل دور کیے اور لوگوں کی روحانی و اخلاقی اصلاح فرمائی۔

آپ کی کتابوں میں سے "گناہان کبیرہ" اور "قلب سلیم" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور مذکورہ کتابیں حسن علی بک ڈپو نے اردو زبان میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے جن سے ہزاروں افراد نے استفادہ کیا اور یہ سلسلہ انشاء اللہ قائم و دائم رہے گا۔

شہید محراب کی مذکورہ ضخیم کتابوں سے ان کے معلم اخلاق ہونے کا پتہ چلتا ہے اور کتاب ہذا آپ کے ماہر علم کلام[1] ہونے کی زندہ سند ہے۔ اس کتاب میں آپ علم الکلام کی بلند ترین چوٹی پر دکھائی دیتے ہیں۔

ہم نے اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ ترجمہ معیاری ہو اور کوئی مطلب ادا ہونے سے رہ نہ جائے۔ ہم اپنی بے بضاعتی سے پوری طرح باخبر ہیں کیونکہ ہمارا تعلق

کسی طرح سے بھی اہل زبان سے نہیں ہے۔ اس لئے اگر آپ کو کتاب ہذا میں اردوئے معلی کی بجائے "اردوئے محلہ" دکھائی دے تو اس کی وجہ بھی ہماری یہی مجبوری ہے۔

کتاب ہذا کے ملحقات میں ولایت فقیہ اور قطبین میں اسلامی عبادات کی ادائیگی اور اسلام میں تصور غلامی پر مبنی تین مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور مسئلہ ولایت فقیہ میں امامت و خلافت کے ضمن میں ہم نے بحث کی تکمیل کے لئے کچھ تصرفات کئے ہیں اور بعض مقامات پر جہاں ہمیں اختلاف تھا وہاں ہم نے اپنے حواشی بھی لکھے ہیں اور کتاب میں جہاں صرف آیت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا ہم نے اس کی تکمیل کی ہے۔

بہر نوع اس کے لئے ہم سے جو کچھ بھی ممکن تھا وہ ہم نے بصد اخلاص سر انجام دیا اور ہم بارگاہ احدیت میں ملتمس دعا ہیں کہ وہ ہماری اس ناچیز کاوش کو قبول فرمائے اور اسے ہمارے لئے باقیات صالحات میں سے قرار دے اور ہمارے والدین کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ آخر میں ہم اپنے قارئین کو یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ کتاب ہذا کا آخری مقالہ مصری اسکالر محمد قطب کا تحریر کردہ ہے جن کا تعلق مذہب اہلسنت سے تھا اور اس مقالے میں بھی ان کا تسنن عیاں ہے۔ لہذا مقالہ ہذا کو کسی لحاظ سے بھی مذہب تشیع کے لئے سند نہ بنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی اور ہماری توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ آمین

نوٹ: جو عبارات بریکٹس کے درمیان نظر آئیں انہیں مترجم کی طرف سے اضافہ سمجھا جائے۔

والسلام
خادم ملت جعفریہ
محمد حسین جعفری

مقدمہ

از فرزند مؤلف

اسلام دین فطرت ہے اور اسلام ہی رہتی دنیا تک انسانیت کا رہنما ہے۔ اسلام صرف ایک محدود وقت کے لئے نہیں آیا تھا۔ اسلام کی ابدی و آفاقی تعلیمات ہر دور اور ہر زمانہ کے عین مطابق ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو ہی تمام انسانیت کے لئے پسند کیا اور اسلام کے علاوہ اللہ کو کوئی دوسرا ضابطہء حیات پسند نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اعلان فرمایا:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ. (سورہٴ آل عمران آیت ۸۵) "اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

اس آیت مجیدہ میں لفظ "لَنْ" یعنی نفی مؤکد کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام دیا ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین ہرگز قابل قبول نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسلام کو دنیا کی رہنمائی کے لئے پسند کیا ہے۔ اسی لئے پیغمبر اسلامؐ کو بھی اللہ نے آخری پیغمبر ہونے کا شرف عطا کیا اور اعلان فرمایا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا. (سورہٴ الاحزاب آیت ۴۵) "محمدؐ تم مردوں میں سے کسی ایک کے (بھی) باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسولؐ اور سلسلہء انبیاءؑ کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔"

پیغمبر اکرمؐ کے خاتم الانبیاءؑ ہونے کا یہی مقصد ہے کہ اسلام دین جاودانی ہے۔ جب اسلام دین جاوید ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ کامل و اکمل ہے۔ اگر خدانخواستہ اسلام دین کامل نہ ہوتا تو اللہ اسے ہمیشہ کے لئے برقرار نہ رکھتا اور اس کے پیغمبر کو خاتم النبیینؐ کے منصب پر سرفراز نہ کرتا۔

اسلام کے کامل ہونے کا گواہی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں ان الفاظ سے دی: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (سورہٴ مائدہ آیت ۳) "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کردیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنادیا ہے۔"

اس آیت مجیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دین کامل ہے اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی و بیشی اور افراط تفریط نہیں ہے اور دین اسلام نہ صرف نزول آیت کے وقت کامل تھا بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کامل و اکمل رہے گا اور کامل ہونے کی وجہ سے یہ جاودانی دین ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اور اس کی تکمیل کے لئے نہ تو کسی نئے دین کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی نبی و رسول کی احتیاج ہے۔

حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَحَرَامُهٗ حَرَامٌ اَبَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (اصول کافی ج۱۔ ص ۵۸) "حلال محمدؐ قیامت تک حلال اور حرام محمدؐ قیامت تک حرام رہے گا۔"

اسلام ہر پہلو اور ہر زاویے سے کامل ہے۔ اسلام اعتقاد، اخلاقیات، سیاسی احکام، اجتماعی و انفرادی مسائل اور عبادت و اقتصاد غرضیکہ ہر جہت سے کامل اور اکمل ہے۔ احکام اسلام کا بیان قرآن مجید میں موجود ہے اور اس کی تفصیل ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے قول و فعل میں موجود ہے۔

اسلام کا محافظ خدا ہے

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو قیامت تک کے لئے باقی رکھنا ہے اسی لئے وہ ہر دور میں اسلام و قرآن کا محافظ رہا ہے اور اس نے حفاظت قرآن کو اپنی ذمہ داری قرار دیتے ہوئے فرمایا:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔ (سورۂ حجر آیت ۹) "ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

یہ آیت مجیدہ دراصل رب العالمین کی طرف سے عظمت قرآن کا اعلان ہے کہ اسے ہم نے ہی نازل کیا ہے اور اس میں کسی بندے کا ایک حرف یا ایک آیت کے برابر حصہ نہیں ہے۔ پھر ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں کہ اس میں باطل کی آمیزش یا اس کی تباہی و بربادی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ واضح اعلان ہے کہ قرآن میں کسی طرح کی تحریف ممکن نہیں ہے نہ اس میں سے کوئی آیت کم ہوسکتی ہے اور نہ زیادہ ہوسکتی ہے۔ اس کی ترتیب بھی وحی الٰہی کے مطابق ہے اگرچہ تنزیل کے مطابق نہیں کیونکہ تنزیل حالات کے اعتبار سے ہوئی ہے اور ترتیب مقصد اور مضامین کے اعتبار سے ہوئی ہے۔ جس طرح کہ انسان مکان کی تعمیر کے لئے سارے سامان مختلف اوقات میں جمع کرتا ہے اور اس کے بعد تعمیر عمارت کے سلیقہ ہی سے کرتا ہے، خریداری کی ترتیب سے نہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے اہلبیت طاہرین کو قرآن کا وارث بنایا اور ائمہ اہلبیت نے اپنی

وراثت کی مکمل حفاظت فرمائی۔ زنادقہ و ملحدین نے اسلام کے حلیہ کو بگاڑنے کی بہتیری کوششیں کیں لیکن اہلبیت طاہرین نے اپنے افعال و اقوال سے ان کی ہر کوشش کو ناکام بنادیا اور یوں دشمنان اسلام مغلوب ہوئے اور اسلام غالب رہا۔

اگر آپ زندیقوں و ملحدوں کے اشکالات کے جواب پڑھنا چاہیں تو اس موضوع کی کتاب "احتجاج طبرسی" کا مطالعہ فرمائیں۔

حضرت ولی عصر ارواح العالمین لہ الفدا کی غیبت کبریٰ کے دور میں دین کی حفاظت و تبلیغ کی ذمہ داری علماء و فقہاء پر آن پڑی جنھوں نے پر آشوب ادوار میں اپنی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ سرانجام دیا اور یوں خدا اور رسول کا پیغام امت اسلامیہ تک پہنچایا۔

معدوم پہلوی حکومت اور بے دینی کی اشاعت

عالمی استعمار نے ماضی قریب میں ایران میں پہلوی حکومت، ترکی میں کمال پاشا اور حجاز میں آل سعود کو اپنا مہرہ بنایا اور مذکورہ حکومتوں نے کھل کر اسلام کی اصلی اور حقیقی تعلیمات کی مخالفت کی اور کیمونزم کا سیلاب بھی انہی ایام میں نمودار ہوا جس کی وجہ سے نوجوانوں کے اذہان کو فکری طور پر مسموم کیا گیا اور ان کے یقین کو شک سے بدلنے کیلئے ہر کوشش بروئے کار لائی گئی چنانچہ ہزاروں سال پرانے سوالات کو کتابوں سے نکال کر نئی آب و تاب سے پیش کیا گیا حالانکہ دین اسلام اور تشیع پر وارد کیے گئے ان سوالات میں سے کوئی سوال بھی نیا نہیں تھا بس پرانی شراب کو نئی بوتل میں بند کرنے کی سعی نافرجام کی گئی جبکہ اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ ان تمام تر سوالات کے جواب علمائے اعلام نے ایک مدت قبل اپنی کتابوں میں لکھ دیئے تھے مگر مارکسیت اور وہابیت اور بہائیت نے جان بوجھ کر مذہب حقہ کے خلاف محاذ سا کھول دیا اور پہلوی حکومت نے ان کی خوب حوصلہ افزائی کی، ان تمام تر مساعی مذمومہ کا مقصد صرف یہی تھا کہ نوجوان نسل اسلام اور تشیع سے منحرف ہو جائے لیکن علماء

نے اس موقع پر امت اسلامیہ کی مکمل رہنمائی فرمائی اور انہیں ہر طرح کی کج فکری سے محفوظ رکھا اور اپنی شرعی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے بے دینی کے سیلاب کے سامنے سد سکندری بن گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ استعمار کو سخت ناکامی ہوئی اور نوجوان نسل گمراہ ہونے سے محفوظ رہی اور اسلام کی صداقت زیادہ آشکار ہو کر سامنے آئی۔

خالصی روشن فکر اور اہل مطالعہ تھے

جن دانشوروں نے دین اسلام کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی ان میں مرحوم محمد خالصی ایک منفرد مقام رکھتے تھے اور آج سے پندرہ برس قبل انہوں نے تہران میں وفات پائی۔ مرحوم روشن فکر دانشور اور اہل مطالعہ تھے اور علمائے اعلام کے خرمن دانش کے خوشہ چیں تھے اور مرحوم نے بہت سے گمراہ فرقوں کے مبلغین سے کئی بار علمی مباحثے کئے اور ہر بار انہیں شکست فاش سے دوچار کیا اور کتاب ہذا کے سوال نمبر تیس کے ضمن میں عیسائیت کے متعلق ان ایک کا استدلال پیش کیا گیا ہے۔

مرحوم خالصی نے اپنے مکالمات پر مبنی ایک کتاب تصحیح اور اشاعت کی غرض سے مجھے روانہ فرمائی تھی مگر میں نے سوچا کہ باطل کو جواب نہ دینا ہی اس کا جواب ہے اسی لئے میں نے کتاب کی اشاعت مناسب نہ سمجھی۔

مرحوم خالصی ہمارے والد قبلہ گاہی عالم ربانی حضرت آیت اللہ شہید حاج عبدالحسین دستغیب کے بڑے مداح اور شیدائی تھے اور والد معظم کی محافل میں اکثر و بیشتر شریک ہوتے تھے اور انہوں نے کتاب ہذا کے سوالات مرتب کر کے والد معظم کی خدمت میں روانہ کئے اور شہید والد نے ان کے جوابات لکھ کر شائع کرا دیئے تھے۔

مرحوم خالصی ان جوابات کی اشاعت سے بے حد خوش ہوئے تھے۔ والد مرحوم کی یہ کتاب کچھ عرصہ قبل تقریباً نایاب ہو چکی تھی اور والد معظم کی شدید خواہش

تھی کہ اس کتاب کو جدید اضافہ کے ساتھ ازسرنو شائع کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور ذوات قادسہ و مقدسہ کے فیوض باطنی کی وجہ سے مذکورہ کتاب کی دوبارہ اشاعت کی توفیق ہوئی اور اس کا اضافہ شدہ نسخہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

اس ایڈیشن کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں مذکورہ بیاسی (۸۲) مسائل کے علاوہ دو اہم مسائل کا اضافہ کیا گیا ہے جن میں سے پہلا مسئلہ قطبین (قطب شمالی و قطب جنوبی) میں احکام اسلامی کی ادائیگی کے متعلق ہے اور ہم نے اس کے جواب کے لئے آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کے مقالے سے استفادہ کیا ہے اور دوسرا مسئلہ اسلام میں غلام اور غلامی کے متعلق ہے اور اس کے لئے ہم نے سید قطب مصری کے مقالے سے استفادہ کیا ہے اور مذکورہ مسائل کو بالترتیب ۵۷، ۵۸ مسائل کے تحت بیان کیا گیا ہے اور ولایت فقیہ کے مسئلہ کی وضاحت ہم نے کتاب کے آخر میں کی ہے۔

والسلام

سید محمد ہاشم دستغیب

مؤلف کتاب آیت اللہ دستغیب اور مترجم کے والدین کیلئے سورۂ فاتحہ کی التماس ہے۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

محمد حسن جعفری

بحثِ توحید

سوال ا

درج ذیل حدیث کی وضاحت فرمائیں اور اس کے ضمن میں یہ بھی واضح کریں کہ وحدت الوجود کے قائل افراد اس سے کیا استدلال کرتے ہیں اور ان کا جواب کیا ہے؟

دَاخِلٌ فِی الْاَشْیَآءِ لَا کَشَیْءٍ دَاخِلٍ فِی الشَّیْءِ وَخَارِجٌ مِّنَ الْاَشْیَآءِ لَا کَشَیْءٍ خَارِجٍ مِّنْ شَیْءٍ. "وہ اشیاء میں داخل ہے لیکن جیسے ایک شے دوسری شے میں داخل ہوتی ہے وہ اس طرح سے داخل نہیں ہے اور وہ اشیاء سے خارج ہے لیکن جس طرح سے کوئی شے کسی شے سے خارج ہوتی ہے وہ اس طرح سے خارج نہیں ہے۔"

جواب

سوال میں حدیث کا جو ٹکڑا بیان کیا گیا ہے یہ امیرالمومنین علیہ السلام کی حدیث کا مختصر اقتباس ہے۔ اصول کافی میں اس حدیث کو امیرالمومنینؑ کی سند سے نقل کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے حق تعالیٰ کی تنزیہ بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ذات حق جسم و جسمانیات کے اوصاف و احوال سے پاک و منزہ ہے اور مکمل حدیث یہ ہے:

سُئِلَ اَمِیْرُالْمُؤْمِنِیْنَ عَلَیْهِ السَّلَامَ بِمَ عَرَفْتَ رَبَّكَ فَقَالَ بِمَا عَرَّفَنِیْ نَفْسَهٗ

قِیْلَ وَکَیْفَ عَرَّفَكَ نَفْسَهٗ قَالَ: لَا یُشْبِهُهٗ صُوْرَةٌ وَلَا یُحَسُّ بِالْحَوَاسِ وَلَا یُقَاسُ بِالنَّاسِ، قَرِیْبٌ فِیْ بُعْدِهٖ بَعِیْدٌ فِیْ قُرْبِهٖ فَوْقَ کُلِّ شَیْءٍ وَلَا یُقَالُ شَیْءٌ فَوْقَهٗ اَمَامَ کُلِّ شَیْءٍ وَلَا یُقَالُ لَهٗ اَمَامٌ دَاخِلٌ فِی الْاَشْیَآءِ لَا کَشَیْءٍ دَاخِلٍ فِیْ شَیْءٍ وَخَارِجٌ مِّنَ الْاَشْیَآءِ لَا کَشَیْءٍ خَارِجٍ مِّنْ شَیْءٍ سُبْحَانَ مَنْ هُوَ هٰکَذَا وَلَا هٰکَذَا غَیْرُهٗ وَلِکُلِّ شَیْءٍ مُبْتَدِءٌ. (اصول کافی ج ا۔ ص ۸۶)

ترجمہ: امیرالمومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپؑ نے اپنے پروردگار کو کس چیز سے پہچانا؟ آپؑ نے فرمایا: میں نے اسے ویسے پہچانا جیسا کہ اس نے اپنی ذات کی مجھے خود پہچان کرائی۔ کہا گیا کہ ذات حق نے اپنی پہچان آپؑ کو کس طرح کرائی؟ تو آپؑ نے فرمایا: اللہ نے مجھے اپنی پہچان یوں کرائی کہ کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے اور حواس کے ذریعے سے اسے محسوس نہیں کیا جاسکتا اور اس کا قیاس انسانوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی وہ جسم نہیں ہے اور وہ مخلوق کی صفات سے منزہ ہے اور وہ اپنی قدرت اور احاطہء علمی کے ذریعے سے تمام مخلوق کے قریب ہے اور وہ ذات و صفات کے اعتبار سے تمام ممکنات سے بعید ہے اور عقول و اوہام و افہام کے احاطہ سے بہت دور ہے اور اس کے باوجود وہ ہر چیز کے قریب ہے کیونکہ تمام اشیاء اسی کی وجہ سے قائم ہیں اور ذات حق کو قدرت و غلبہ و کمال کے اعتبار سے ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کے اوپر ہے۔ (واضح رہے کہ لفظ "فوق" بالحاظ مکان نہیں بلکہ رتبہ و کمال کے اعتبار سے ہے) "داخل فی الاشیاء" کائنات کی کوئی چیز اور اجزائے عالم میں سے کوئی چیز اور اجزائے عالم میں سے کوئی بھی جزو اس کے تصرف و تدبیر اور ذات حق کے حضورِ علمی اور افاضہِ فیضِ وجود سے خالی نہیں ہے۔ "لا کشیئ داخل فی الشیئ" وہ اس طرح سے داخل نہیں ہے جیسے ایک جز اپنی کل میں داخل ہوتا ہے جیسا کہ گھی دودھ میں داخل ہوتا ہے اور وہ

اس طرح سے بھی داخل نہیں ہے جیسے عارض معروض میں داخل ہوتا ہے اور وہ کسی مکان میں متمکن کی طرح سے بھی اشیاء میں داخل نہیں ہے یا جیسا کہ کوئی تخت پر بیٹھا ہوا ہو وہ یوں بھی نہیں ہے یا جس طرح حرارت پانی میں داخل ہوتی ہے وہ اس طرح سے بھی اشیاء میں داخل نہیں ہے کیونکہ دخول کی مذکورہ تینوں اقسام کا تعلق جسم و جسمانیات کے اوصاف سے ہے اور ذات حق ان اوصاف سے پاک و پاکیزہ ہے۔

"خارج عن الاشیاء" یعنی وہ ذات حق اشیاء کی مقارنت و ملابست سے خارج ہے اور ان کی صفات سے متصف ہونے سے پاک و پاکیزہ ہے۔

"لا کشئ خارج من شئ" یعنی اس کے خروج کی وہ کیفیت ہرگز نہیں ہے جو اشیاء کے بُعدِ مکانی و محلی کے خروج کی ہوتی ہے۔ بالجملہ معیت قیّومیت الٰہیہ کائنات کی تمام اشیاء کے ساتھ ہے اور اسکے شدت قرب اور احاطہ ء کلیہ کی شبیہ و نظیر نہیں ہے۔ اسی لئے اشیائے عالم سے اسکی مباینت کی بھی کوئی شبیہ و نظیر نہیں ہے۔

البتہ ذہن کے قریب کرنے کے لئے اس کی مثال کے لئے روح اور نفس ناطقہ کی مثال بعض وجوہ سے بیان کی جاسکتی ہے کیونکہ نفس اجزائے بدن میں سے ہر جزو کا متصرف اور مدبر ہے مگر اس کے باوجود کسی خاص جزو سے اسے منسوب کرنا درست نہیں ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ روح اس میں قیام پذیر ہے۔ یقیناً روح تمام بدن میں موجود ہے اور بدن سے باہر بھی موجود ہے۔ مگر اس کے دخول و خروج کا وہ انداز ہرگز نہیں ہے جو کہ اجسام کے دخول و خروج کا ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

اور روح کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ تصرف و احاطہ کے اعتبار سے بدن کے قریب ہے لیکن اس کے باوجود وہ مقام ذات کی حیثیت اور عوارض بدنی کے اعتبار سے بدن سے دور ہے۔

واضح رہے کہ حق تعالیٰ کی دوری اور نزدیکی کی بھی وہی حیثیت ہے جو روح کی بدن کے دور و نزدیک ہونے کی ہے اور جب انسان روح کے قرب و بعد کی ماہیت و حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے تو وہ ذات حق کے قرب و بعد کی کیفیت کو سمجھنے سے عاجز ترین ہے۔ اسی لئے کاشفِ اسرار حق امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں کیا ہی خوبصورت الفاظ ارشاد فرمائے:

اَلَّذِیْ لاَ یُدْرِکُہٗ بُعْدُ الْھِمَمِ وَلاَ یَنَا لُہٗ غَوْصُ الْفِطَنِ. "ذات حق کو نہ بلند پرواز ہمتیں پاسکتی ہیں اور نہ عقل و فہم کی گہرائیاں اس کی تہ تک پہنچ سکتی ہیں۔"[1]

عقیدۂ وحدت الوجود رکھنے والوں کا موقف

سوال کے ضمن میں وحدت الوجود کے نظریے کے متعلق پوچھا گیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ لفظ "وحدت الوجود" کی کئی تعبیریں کی گئی ہیں اور ان میں سے

۱۔ اور اس عدم رسائی کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کی مکمل حقیقت و ماہیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اس چیز پر برتری اور احاطہ حاصل ہو اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ مخلوق کو خالق پر برتری اور احاطہ حاصل نہیں ہے اسی لئے مخلوق اس کی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہے۔ اگر کوئی انسان یہ تصور کر لے کہ وہ ذات حق کی حقیقت کو سمجھ چکا ہے تو وہ امر محال کا دعویدار قرار پائے گا۔ جبکہ یہاں تو ذوات عالیہ ہمیں یہ کہتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ. "ہم سے تیری معرفت کا حق ادا نہیں ہوا۔" اسی لئے یہاں کمالِ معرفت یہ ہے کہ انسان اپنی عاجزی کا اقرار کرلے کہ میں ذات حق کی معرفت سے قاصر ہوں۔ اصول کافی میں امام محمد باقرؑ کا فرمان ہے: تَکَلَّمُوْا فِیْ خَلْقِ اللّٰہِ وَلاَ تَتَکَلَّمُوْا فِی اللّٰہِ فَاِنَّ الْکَلاَمَ فِی اللّٰہِ لاَ یَزْدَادُ صَاحِبَہٗ اِلاَّ تَحَیُّرًا. (الکافی ج۱۔ ص ۹۲) "خلق خدا کے متعلق گفتگو کرو اور ذات خدا کے متعلق گفتگو نہ کرو کیونکہ یہ گفتگو اپنے متکلم کی حیرانی و سرگردانی میں اضافہ کرے گی۔

اور دوسری روایت میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے واضح کیا گیا:

مَنْ نَظَرَ فِی اللّٰہِ کَیْفَ ھُوَ ھَلَکَ. "جس نے اللہ کے متعلق یہ غور و خوض کیا کہ وہ کیسا ہے اور اس کی کیفیت کیا ہے تو وہ ہلاک ہو گیا۔"

اسی لئے ذات حق کی کیفیت اور اس کے قرب و بعد کی کیفیت کے متعلق (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مشہور تعبیر تو یہ ہے کہ حقیقی وجود ذات حق کا ہے اور باقی تمام وجود اس کی نمائش و تجلی ہیں اور اس نظریے کے قائل افراد وجود کی وحدت و کثرت کی مثال سمندر اور اس سے اٹھنے والی لہروں سے دیتے ہیں اور اہل عقل کے نزدیک یہ تعبیر انتہائی غلط ہے کیونکہ کوئی بھی عقلمند یہ ماننے پر ہرگز آمادہ نہیں ہوسکتا کہ تمام موجودات نظر و فکر کا واہمہ ہیں اور وجود بس ایک ہی ہے اور سمندر کی موجوں اور حباب کی یہ خود ساختہ مثالیں ذات احدیت کے حضور بے باکی کا کھلم کھلا مظاہرہ ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِهِ شَیْءٌ ، سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ. "خدا کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔ تیرا رب العزت ان کے وصف سے کہیں پاک و پاکیزہ ہے۔" (سورۂ صافات آیت ۱۸۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

غور وخوض کا نتیجہ حیرانی وسرگردانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اسکی بجائے ہمیں ذات حق کی لامحدود قدرت وحکمت کے متعلق غور وخوض کرنا چاہیئے جو کہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے کہ:

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقش دفتریست معرفت کردگار

یعنی درختوں کا ہر پتہ معرفت کردگار کا ایک دفتر ہے۔

اس کے ساتھ انسان کو اپنی عاجزی وناتوانی مد نظر رکھنی چاہیئے اور انسان کو چاہیئے کہ اپنی معمولی سی ہستی کا وسیع و عریض کائنات سے موازنہ کرے، پھر اسے معلوم ہوگا کہ اس کی حیثیت سمندر کے مقابلے میں ایک قطرۂ آب سے بھی کم ہے اور جب اسے اپنی بے بضاعتی کا یقین ہو جائے تو پھر اسے سوچنا چاہیئے کہ جس طرح سے اس کی حیثیت کائنات کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح سے اس وسیع و عریض کائنات کی حیثیت قدرت خداوندی کے سامنے کچھ نہیں ہے اور ایک حقیر ذرے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اتنی بڑی کائنات کے خالق و مالک کی حقیقت و ماہیت کے متعلق غور وخوض کرتا پھرے۔ اس کیلئے سلامتی کا فقط یہی راستہ ہے کہ اپنی عاجزی وناتوانی کا اظہار کرے اور اپنے چھوٹے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور ہم اس مقام پر یہ واضح کرنا اپنا شرعی فریضہ سمجھتے ہیں کہ وحدت الوجود کی یہ تعبیر دین سے انحراف اور صریح کفر و زندیقی ہے۔

اسی لئے مشہور مرجع عالی قدر حضرت آیت اللہ محسن الحکیم رضوان اللہ علیہ نے عروۃ الوثقیٰ کی شرح میں وحدت الوجود کے اقوال بیان کرنے کے بعد لکھا:

حسن الظن بهؤلاء القائلين بالتوحيد الخاص و الحمل على الصحة المامور به شرعا يوجبان حمل هذه الاقوال على خلاف ظاهرها والافكيف يصح على هذه القوال وجود الخالق والمخلوق والآمر والمامور والراحم والمرحوم. (المستمسک ج ا۔ ص ۳۹۱)

شریعت طاہرہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ہر مسلمان کے متعلق حسن ظن رکھیں اور اس کے ساتھ شریعت نے ہمیں یہ حکم بھی دیا ہے کہ مسلمانوں کی بات کو

(گزشتہ سے پیوستہ)

سے ذہن پر اتنا بڑا بوجھ ہرگز نہ ڈالے۔

در محفلی کہ خورشید اندر شمار، ذرہ است
خود را بزرگ دیدن شرط ادب نباشد

جس محفل میں سورج بھی ذرہ نظر آتا ہو وہاں اپنے آپ کو بڑا قرار دینا خلاف ادب ہے۔

بعض کم عقل کہتے ہیں کہ جب خدا کو دیکھا نہیں جاسکتا اور اس کی حقیقت کو سمجھا بھی نہیں جاسکتا تو آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ موجود ہے؟

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ انسان آج تک حقیقت حیات کو سمجھ نہیں سکا۔ انسان حیات کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ بس اس کے آثار کا ہی مشاہدہ کر سکتا ہے تو کیا ہمیں حیات کا انکار کر دینا چاہیئے؟ اسی طرح سے آج تک انسان روح کی حقیقت کو نہیں سمجھ پایا تو کیا اس عاجزی کی وجہ سے روح کا انکار کر دینا چاہیئے؟

اور ہم ایسے ہی خود ساختہ "بقراطوں" سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ عقل رکھتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ وہ عقل رکھتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ کیا تم نے عقل دیکھی ہے اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح ترین مفہوم پر محمول کریں ان دونوں اسباب کے تحت وحدت الوجود کے اقوال کی ہمیں صحیح تاویل کرنی ہوگی ورنہ وحدت الوجود کے قائلین کے ظاہری الفاظ انتہائی غلط ہیں کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خالق بھی وہی ہو اور مخلوق بھی وہی ہو اور حاکم بھی وہی ہو اور محکوم بھی وہی ہو اور رحم کرنے والا بھی وہی ہو اور جس پر رحم کیا جارہا ہے وہ بھی وہی ہو۔ غرضیکہ یہ جملے شریعت طاہرہ کے منافی ہیں۔

ہم ان لوگوں کے متعلق بس یہی کہہ سکتے ہیں : وما قدروا اللّٰہ حق قدرہ۔ (سورۂ انعام آیت ۹۱)۔[۱]

پاک از آنہا کہ عاقلان گفتند
پاک تر زانکہ غافلان گفتند

یعنی جو کچھ اہل عقل نے کہا وہ اس سے پاک ہے اور جو کچھ غافلوں نے کہا وہ اس سے پاک تر ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

کیا تم اس کی حقیقت و ماہیت کو جانتے ہو؟ جب تم نے عقل کو دیکھا ہی نہیں اور اس کی حقیقت و ماہیت سے بھی واقف نہیں ہو تو اپنے لئے عقل کا دعویٰ کیوں کرتے ہو اور اس کی نفی کیوں نہیں کرتے؟ اگر اس سوال کے جواب میں وہ یہ کہیں کہ ہم عقل نہیں رکھتے تو ایسے عقل دشمنوں سے بحث ہی فضول ہے۔

جہاں متفق بر الہیتش فرومانده درکنہ ماہیتش
نہ ادراک درکنہ ذاتش رسد نہ فکرت بہ غور صفاتش رسد
نہ براوج ذاتش پرد مرغ وہم نہ در ذیل وصفش رسد دست فہم
کہ خاصان دراین رہ فرس رانده اند بلا احصی از تک فرومانده اند

سارا جہاں اس کی الوہیت پر متفق ہے اور اس کی کنہ ماہیت سے عاجز ہے۔ اس کی کنہ ذات تک ادراک کی رسائی نہیں اور اس کے صفات کی تہ تک فکر کی پرواز نہیں ہے۔ طائر فکر اس کے اوج ذات تک پرواز کرنے سے قاصر ہے اور دستِ فہم اس کے اوصاف کے دامن کو پکڑنے سے عاجز ہے۔ جن خاص افراد نے اس راہ میں اپنے گھوڑے دوڑائے ہیں وہ بھی تھک ہار کر واپس آئے ہیں۔

۱۔ علاوہ ازیں کچھ دیگر حکمائے اسلام نے وحدت الوجود کے لفظ کی اور (بقیہ اگلے صفحہ پر)

دَور و تسلسل کا بطلان

سوال ۲

"دَور" اور "تسلسل" کا بطلان واضح فرمائیں؟

جواب

"دَور" کی تعریف یہ ہے کہ "وقوف الشیٔ علی نفسہ" ایک چیز اپنی ذات پر ہی متوقف ہو خواہ وہ توقف اسی چیز پر ہو یا بالواسطہ ہو اور فلاسفہ و علم معقول کی اصطلاح میں دَور عبارت ہے کہ دو امر ایک دوسرے پر متوقف ہوں جس کے نتیجے کے طور پر کوئی چیز اپنی ہی ذات پر متوقف نظر آئے اور پھر دَور کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ دَور مصرح: کہ دو امر ایک دوسرے پر متوقف ہوں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ "الف" کے وجود کا سبب "با" ہے اور "با" کے وجود کا سبب "الف" ہے۔ اور یوں "الف" اور "با" کا توقف خود اسکی ذات پر لازم آئیگا جو کہ بالبداہت باطل ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی علت اور معلول قرار پاتے ہیں اور یہ چیز غیر ممکن ہے کہ ایک چیز اپنی ہی علت ہو اور اس علت کی خود ہی معلول ہو کیونکہ جب ہم یہ کہیں گے

(گزشتہ سے پیوستہ)

توجیہات بھی کی ہیں اور انہوں نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے وہ وحدت مراد ہے جس کے مختلف مراتب ہیں۔ جیسا کہ لفظ نور حقیقت واحدہ ہے لیکن قوت و ضعف کے اعتبار سے اس کے مختلف مراتب ہیں اور اسی طرح سے لفظ وجود کے بھی مختلف مراتب ہیں۔ کبھی وجود، واجب الوجود ہوتا ہے اور کبھی وجود حی بالذات اور عالم بالذات کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی وجود ممکن اور حادث کی شکل میں ہوتا ہے اور یوں عالم بالغیر اور قادر بالغیر ہوتا ہے اور پھر ممکنات میں بھی وجود کے بہت سے مراتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر حکماء نے اس لفظ کی کچھ اور انداز سے تشریح و توضیح کی ہے جن کا ذکر طول کلام کا موجب ہے۔ اسی لئے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔

کہ "الف، با" پر موقوف ہے تو اسکا مقصد یہ ہے کہ "با، الف" پر موقوف ہے تو اس صورت میں "الف" علت قرار پائے اور "با" اسکا معلول بن جائیگا اور یہ چیز باطل ہے۔

۲۔ دَور مضمر: وہ دور جس میں ایک چیز کا کئی واسطوں سے اپنی ہی ذات پر توقف لازم آئے۔ مثلاً ہم یہ کہیں کہ "الف، با" پر موقوف ہے اور "با، تا" پر موقوف ہے اور "تا، الف" پر موقوف ہے۔ اس مثال میں بھی ایک چیز کا اپنے نفس پر متوقف ہونا لازم آتا ہے اور یہ بھی باطل ہے۔

تسلسل کی تعریف

تسلسل سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز دوسری پر موقوف ہو اور دوسری تیسری پر موقوف ہو اور تیسری چوتھی پر موقوف ہو اور یوں ان کی کوئی انتہا نہ ہو اور سلسلہ ممکنات کہیں بھی اختتام پذیر نہ ہو۔ تسلسل بھی عقلاء کے نزدیک باطل ہے۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ ہم سلسلۂ ممکنات کے اختتام کو تسلیم کریں اور علت العلل کا اقرار کریں جو کہ بالذات واجب الوجود ہے۔

دور اور تسلسل کے بطلان کے لئے آپ اس مثال پر غور فرمائیں: گندم کی پیداوار گندم کے بیج پر موقوف ہے اور مرغی کا وجود انڈے پر موقوف ہے اور خود گندم کا بیج گندم کی پیداوار اور انڈے کا وجود خود مرغی پر موقوف ہے۔ سادہ الفاظ میں اس سوال کو یوں دہرایا جاسکتا ہے کہ انڈہ پہلے ہے یا مرغی پہلے ہے اور اسی طرح سے گندم کا بیج پہلے ہے یا گندم پہلے ہے یا آم کی گٹھلی پہلے ہے یا آم پہلے ہے؟ اگر ہم یہ کہنا شروع کریں کہ مرغی انڈے پر موقوف ہے اور انڈہ مرغی پر موقوف ہے تو یہ دَور ہوگا جو کہ بالبداہت باطل ہے اور اگر ہم یہ کہیں یہ مرغی فلاں انڈے سے پیدا ہوئی اور وہ انڈہ فلاں مرغی سے پیدا ہوا اور یوں اس سلسلے کو طویل کرتے جائیں اور اس کی حد آخر مقرر نہ کریں تو یہ تسلسل ہوگا اور تسلسل بھی محال ہے۔ اس کا آخری

حل یہی ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے مرغی کو پیدا کیا تھا جس سے انڈہ پیدا ہوا اور اس انڈے سے مزید مرغیوں کی نسل جاری ہوئی۔ اسی طرح سے ہم یہ تسلیم کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آم کے پیڑ کو پیدا کیا جس پر آم لگے اور اس سے گٹھلیاں وجود میں آئیں اور وہ گٹھلیاں آم کی افزائش نسل کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔ جب تک ہم علت العلل اور واجب الوجود پر ایمان نہ لائیں گے اس وقت تک ہم دَور اور تسلسل سے نجات حاصل نہیں کرسکیں گے۔

حضرت موسیٰؑ نے دیدار کا سوال کیوں کیا؟

سوال ۳

قرآن مجید کی آیت ہے:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِیْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّا اَفَاقَ قَالَ سُبْحَانَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (الاعراف ۱۴۳)

"اور جب موسیٰؑ ہمارا وعدہ پورا کرنے آئے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا تو انہوں نے کہا کہ پروردگار مجھے اپنا جلوہ دکھادے۔ ارشاد ہوا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ قائم رہ گیا تو پھر مجھے دیکھ سکتے ہو۔ اسکے بعد جب پہاڑ پر پروردگار کی تجلی ہوئی تو پہاڑ چور چور ہوگیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ پھر جب انہیں ہوش آیا تو کہنے لگے کہ پروردگار تو پاک و پاکیزہ ہے میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔"

درج بالا آیت کو پیش نظر رکھ مامون الرشید نے امام علی رضاؑ سے پوچھا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسول تھے اور وہ جانتے تھے کہ خدا دیکھنے کی چیز نہیں ہے اس کے باوجود انہوں نے دیدار کی خواہش کیوں کی تھی؟

اس کے جواب میں امام علی رضاؑ نے جو توجیہات پیش کر کے اسے مطمئن کیا تھا وہ جواب بیان فرمائیں۔

جواب

امام علی رضاؑ کا جواب کتاب عیون الاخبار الرضا میں مرقوم ہے۔ آپؑ نے مامون کے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا:

واقعہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا کہ ذات احدیت قابل مشاہدہ نہیں ہے لیکن جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور انہیں اپنا مقرب بنایا تو انہوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ نے ان سے کلام کیا ہے۔

بنی اسرائیل نے کہا: جب تک ہم خود اللہ کا کلام نہ سن لیں اس وقت تک آپ کی تائید نہیں کریں گے۔

اس کے بعد آپؑ نے سات لاکھ افراد میں سے ستر ہزار افراد کا انتخاب کیا اور ستر ہزار میں سے سات سو افراد کو چنا اور سات سو میں سے ستر افراد کو منتخب کیا اور انہیں اپنے ساتھ کوہِ طور پر لے گئے اور انہیں دامنِ کوہ پر ٹھہرایا اور خود طور کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو اپنا کلام سنائے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی جسے ان تمام لوگوں نے اوپر، نیچے اور دائیں، بائیں سے سنا۔

اور جب وہ اللہ کا کلام سن چکے تو انہوں نے کہا: ہم آپؑ پر اس وقت تک

ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم اپنے پروردگار کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ ذات خداوندی کو دیکھنا محال ہے مگر وہ جاہل اپنی ضد پر اڑے رہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا یہ نامعقول مطالبہ پیش کرتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے ان لوگوں کی گفتگو سن لی ہے۔ تم ان کا مطالبہ مجھ تک بلا خوف و خطر پہنچاؤ میں تمہارا کوئی مؤاخذہ نہیں کروں گا۔

اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کا مطالبہ کیا تو اللہ نے فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ تم پہاڑ کی جانب نگاہ کرو اگر پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہا تو تم عنقریب مجھے دیکھ لو گے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات میں سے ایک آیت کا پہاڑ پر جلوہ دکھایا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے۔ جب ہوش میں آئے تو کہا: خدایا! تو پاک ہے۔ میں تیرے حضور اپنے سابقہ عقیدہ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ تو قابل رؤیت نہیں ہے اور اپنی قوم کی جہالت کے لئے توبہ کرتا ہوں اور تیرے غیر مرئی ہونے پر میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

مامون نے حضرت کا یہ جواب سن کر کہا تھا: ابوالحسن! اللہ آپؑ کو جزائے خیر عطا فرمائے آپؑ نے میری تشویش کو دور کر دیا ہے۔

بحث عدل

مکرِ بندہ و مکرِ خداوندی کا فرق

سوال ۴

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَاللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ. (آل عمران ۵۴)

"اور انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے۔"

اس آیت مجیدہ کے ضمن میں واضح فرمائیں کہ انسانی مکر اور خدائی مکر میں کیا فرق ہے؟

جواب

جب کسی بندے کے لئے مکر کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے اس کا فریب اور دھوکہ مراد ہوتا ہے جو وہ اپنے غلط مقصد کے حصول کے لئے بجالاتا ہے۔

جب لفظ مکر کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے لئے کیا جائے تو اس سے اس کی ایک مخصوص قسم کی عقوبت و انتقام مراد ہوتی ہے جو وہ اپنے بدکردار بندوں کو دیتا ہے۔

مکر الٰہی اس سزا اور عقوبت کو کہا جاتا ہے جو اس انداز سے بندہ پر وارد ہو کہ بندہ کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بن چکا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکر الٰہی دو طرح کا ہوتا ہے:

ایک ڈھیل دینا اور دوسرا استدراج۔

۱۔ ڈھیل دینا:

اللہ تعالیٰ بعض اوقات کفار اور بدکار افراد کو ڈھیل دے دیتا ہے تاکہ وہ دل کھول کر گناہ کرلیں اور پھر گناہوں کی وجہ سے ان کا مواخذہ کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (آل عمران ۱۷۸)

"اور خبردار کفار یہ نہ سمجھیں کہ ہم جس قدر انھیں ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے حق میں کوئی بھلائی ہے۔ ہم تو صرف اس لئے انھیں ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ مزید گناہ کرلیں اور ان کے لئے رسواکن عذاب ہے۔"

امام علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: وَاللّٰهِ مَا عَذَّبَهُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ اَشَدَّ مِنَ الْاِمْلَاءِ. "یعنی خدا کی قسم ڈھیل دینے سے بڑھ کر اللہ نے انھیں زیادہ سزا نہیں دی۔"

مقصد یہ ہے کہ ڈھیل دینا اللہ کا سخت ترین عذاب ہے تاکہ اس ڈھیل کی وجہ سے ان کے گناہ زیادہ ہو جائیں اور وہ زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق قرار پائیں۔

۲۔ استدراج:

کبھی مکر الٰہی استدراج کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور استدراج کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کی طرف سے جس قدر گناہوں میں اضافہ ہو خدا کی طرف سے انتہائی نعمتوں میں اضافہ ہو اور اضافہ نعمت کی وجہ سے انسان توبہ و استغفار کی طرف متوجہ تک نہ ہو۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا فَاَذْنَبَ ذَنْبًا اَتْبَعَہٗ بِنِقْمَۃٍ وَ یُذَکِّرُہُ الْاِسْتِغْفَارَ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ شَرًّا فَاَذْنَبَ ذَنْبًا اَتْبَعَہٗ بِنِعْمَۃٍ لِیُنْسِیَہُ الْاِسْتِغْفَارَ وَ یَتَمَادٰی بِہٖ وَھُوَ قَوْلُہٗ تَعَالٰی سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ.

"یعنی جب اللہ تعالیٰ کو کسی بندے کی بھلائی مطلوب ہوتی ہے اور ایسا بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً اسے کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے اور اسے استغفار کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف جب اللہ کو کسی بندے کی برائی مطلوب ہوتی ہے اور ایسا بندہ گناہ کرتا ہے تو اللہ اس پر اپنی نعمت نازل کر دیتا ہے تاکہ وہ استغفار کی جانب متوجہ نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے: سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ وَ اُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ. (الاعراف ۱۸۲۔۱۸۳) "ہم انہیں اس طرح لپیٹ لیں گے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوگا اور میں تو انہیں ڈھیل دے رہا ہوں کہ میری تدبیر بہت مستحکم ہوتی ہے۔"

عقوبت الٰہی کی دونوں قسموں یعنی ڈھیل دینے اور استدراج کو مکر کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سزا اس مکر کے مشابہ ہوتی ہے جو بندے ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں لیکن واضح رہے کہ یہ سزا جو کہ یقیناً عدل و انصاف کے تقاضوں پر مبنی ہوتی ہے شکل و صورت کی وجہ سے مکر دکھائی دیتی ہے لیکن غرض و مقصد کے اعتبار سے ہرگز مکر و دھوکہ دہی پر مبنی نہیں ہوتی۔

بندوں کے مکر اور رحمانی مکر میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ انسان کا مکر کبھی کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام ہوتا ہے لیکن مکر الٰہی یعنی رحمانی تدبیر کبھی بھی ناکامی سے دوچار نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تدبیر و مکر کے متعلق فرمایا ہے:

۱۔ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ. (آل عمران ۵۴) "اللہ بہترین مکر (تدبیر) کرنے والا ہے۔"

۲۔ وَاِذَا اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَۃً مِّنْ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْھُمْ اِذَا لَھُمْ مَّکْرٌ فِیْ اٰیَاتِنَا قُلِ اللّٰہُ اَسْرَعُ مَکْرًا اِنَّ رُسُلَنَا یَکْتُبُوْنَ مَا تَمْکُرُوْنَ. (یونس ۲۱) "اور جب تکلیف پہنچنے کے بعد ہم نے لوگوں کو ذرا رحمت کا مزہ چکھا دیا تو فوراً ہماری آیتوں میں مکاری کرنے لگے تو آپ کہہ دیجئے کہ خدا تم سے تیز تر مکر (تدبیر) کرنے والا ہے اور ہمارے نمائندے تمہارے مکر کو برابر لکھ رہے ہیں۔"

۳۔ وَاُمْلِیْ لَھُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ. (الاعراف ۱۸۳) "میں تو انہیں ڈھیل دے رہا ہوں، یقیناً میری تدبیر بہت مستحکم ہوتی ہے۔"

عقوبت الٰہی کو لفظ مکر سے تعبیر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی یہ عقوبت بندہ کے مکر کے جواب میں نازل ہوتی ہے اسی لئے اسے بھی لفظ مکر سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کی مثال کیلئے اس آیت مجیدہ کے الفاظ پر خصوصی توجہ فرمائیں:

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا. (الشوریٰ ۴۰) "برائی کا بدلہ اس جیسی ہی برائی ہے۔"

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بدلہ میں جو برائی کی جائے گی وہ عین عدل ہوگی، حقیقتاً برائی نہیں ہوگی۔ مگر لفظی طور پر اسے برائی سے تعبیر کرنا درست ہے اور یہ الفاظ صحیح ہیں کہ بدی کا بدلہ بدی ہے۔ تو اسی قاعدے کے تحت مکر کے بدلے کو بھی لفظ مکر سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ وہ مکر مذموم نہیں بلکہ عین عدل ہے اور اسی لئے بندے کے مکر کو مذموم الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے تعبیر کیا ہے:

وَلَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَھْلِہٖ. (فاطر ۴۳) "بری چالیں چالباز کو ہی اپنے گھیرے میں لے لیتی ہیں۔"

اس مقام پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ مکر و حیلہ جب چارہ جوئی اور مخفی اسباب سے کام لینے سے عبارت ہو تو اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں: اچھی تدبیر اور بری تدبیر۔ اچھی تدبیر وہ ہے جسے جائز منفعت کے لئے صحیح طریقہ سے استعمال میں لایا

جائے اور اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو دشمن کے شر سے محفوظ رکھا جائے اور ایسی تدبیر جس کا طریقہ بھی درست ہو اور جس کا ہدف بھی صحیح ہو یقیناً قابل تعریف ہوتی ہے اور اس تدبیر کو مکر رحمانی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے برعکس بری تدبیر وہ ہے جس میں ناجائز ذرائع استعمال کر کے کسی کو ناحق تنگ کیا جائے اور اس کا مقصد صرف اذیت پسندی ہو اور ایسی تدبیر کو قرآن مجید میں ابلیسی مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

رحمانی تدبیر ہر لحاظ سے صحیح اور قابل مدح ہوتی ہے اور اس کا مقصد ابلیس اور اس کے پیروکاروں کے منصوبوں کو خاک میں ملانا ہوتا ہے اور ان کی مکر کی بازی کو ان پر پلٹنا ہوتا ہے تاکہ ابلیس اور اس کے پیروکار رسوا ہوں اور دین سے وابستہ افراد کامیاب و کامران ہوں۔

آسان لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مکر دراصل شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کے جواب میں خدائی تدبیر وقوع پذیر ہوتی ہے جسے جزا اور طریقہ کار کی وجہ سے لفظ مکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مکرالٰہی کی کیفیت و نوعیت کی وضاحت کے لئے ہم قرآن مجید میں سے دو مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین کو بخوبی معلوم ہوسکے کہ مکر الٰہی خدا کی طرف سے کوئی دھوکہ اور چالبازی نہیں بلکہ کفار کی چالبازی کا جواب ہے۔

مکر الٰہی کی پہلی مثال

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ. (آل عمران ۵۴) "اور انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا اور اللہ بہترین مکر کرنے والا ہے۔"

اس آیت مجیدہ کا تعلق حضرت مسیح علیہ السلام کے واقعے سے ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد کا نام یہودا تھا جو کہ دلی طور پر منافق تھا اور اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازش کی تھی کہ انہیں

گرفتار کرا کے پھانسی دلادی جائے۔ جب وہ یہودیوں کو اس مکان تک لے آیا جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام موجود تھے اور اس نے یہودیوں سے کہا کہ تم یہاں رک جاؤ میں اندر جاکر عیسیٰ علیہ السلام کو باہر لاؤں گا پھر تم انہیں گرفتار کر لینا اور پھر صلیب پہ چڑھا دینا۔ چنانچہ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا اور یہودا کو ان کی شبیہ بنادیا۔ لوگوں نے اسے گرفتار کرلیا اور وہ فریاد کرتا رہا کہ میں تمہارا دوست یہودا ہوں عیسیٰ نہیں ہوں لیکن لوگوں نے اس کی بات کو تسلیم نہ کیا اور اس کو سولی پر چڑھا دیا گیا اور جب وہ سولی پر مر گیا تو اللہ نے اس کو اس کی اصلی شکل پر پلٹا دیا اور یوں خدائی انتقام واضح ہوگیا۔ یقیناً خدا ہر ظالم کے مکر کو اس کی طرف پلٹا دیتا ہے اور حق کی اس طرح سے نصرت کرتا ہے جس کے متعلق اہل باطل سوچ بھی نہیں سکتے۔

واقعہ ہجرت مکر الٰہی کی دوسری مثال

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ وَ يَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ. (انفال ۳۰)

"اور پیغمبر! آپؐ اس وقت کو یاد کریں جب کفار تدبیریں کرتے تھے کہ آپؐ کو قید کرلیں یا شہر بدر کردیں یا قتل کردیں اور ان کی تدبیروں کے خلاف خدا بھی ان کے خلاف انتظام کر رہا تھا اور وہ بہترین انتظام کرنے والا ہے۔"

اہل مدینہ کے اسلام قبول کرنے پر کفار مکہ میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے "ندوہ" میں اپنا اجلاس کیا۔

ابوالبختری نے تجویز پیش کی کہ محمدؐ کو قید کردیا جائے اور روزانہ اسے کھانا پانی دیتے رہنا چاہئے اور اسے قید سے نہیں نکالنا چاہئے یہاں تک کہ وہ ہماری مخالفت ترک کردے یا اسے موت آجائے۔

شیخ نجدی نے کہا: یہ تجویز بالکل نامعقول ہے کیونکہ بنی ہاشم اسے زندان سے رہا کرالیں گے۔

ہشام بن عمرو نے کہا: میری تجویز یہ ہے کہ اسے ایک اونٹ پر باندھ دیا جائے اور اونٹ کو کسی صحرا میں چھوڑدیاجائے جہاں وہ بھوک اور پیاس سے مر جائے۔

شیخ نجدی نے کہا: یہ تجویز نامعقول ہے کیونکہ کوئی نہ کوئی عرب اسے رسیوں سے آزاد کردیگا اور وہ محمدؐ کو اپنے قوم قبیلہ میں لے جائے گا اور جب محمدؐ باہر پہنچ گیا تو عربی قبائل کو اپنا ہمنوا بنالے گا اور تھوڑے عرصے بعد مکہ پر یورش کردیگا۔

ابو جہل نے کہا: میری تجویز یہ ہے کہ مکہ کے تمام قبائل کے چیدہ افراد مل کر محمدؐ پر حملہ کریں اور اسے قتل کردیں اور اس طرح سے بنی ہاشم انتقام نہ لے سکیں گے۔

شیخ نجدی نے یہ تجویز سن کر ابو جہل کو داد دی اور کہا: یہ دانشمندانہ تجویز ہے تمہیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔

بعض روایات میں ہے کہ ابلیس لعین نے جو کہ ندوہ کے اجتماع میں شیخ نجدی کے روپ میں موجود تھا، اس نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی جسے تمام کافر سربراہوں نے سراہا اور اس منصوبہ کے تحت مکہ کے تمام قبائل میں سے افراد کا انتخاب کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کو کفار کے منصوبہ سے آگاہ کیا۔

حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلایا اور خود ہجرت کی اور غار ثور میں پہنچ گئے۔

خون کے پیاسے ساری رات ننگی تلواریں لے کر گھر کو گھیرے میں لئے کھڑے رہے اور جب وہ رات کے آخری حصے میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور چادر ہٹائی تو بستر پر حضرت علیؑ تھے۔

کافروں نے پوچھا: محمدؐ کہاں ہیں؟ شیر خدا نے فرمایا: کیا تم میرے حوالے کر گئے تھے کہ اب وصول کرنے آگئے ہو؟

غرضیکہ شرمندہ ہو کر باہر آئے۔ پھر انہوں نے ایک سراغ رساں کھوجی کی خدمات حاصل کیں اور وہ آنحضرتؐ کے نقش قدم کو دیکھتے ہوئے غار ثور تک انہیں لے آیا۔ ادھر قدرت نے اپنے حبیبؐ کی حفاظت کے لئے یہ انتظام کردیا تھا کہ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تنا ہوا تھا اور کبوتری نے انڈے دیئے ہوئے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر انہوں نے کہا کہ اگر محمدؐ یہاں آئے ہوتے تو مکڑی کا یہ جالا یوں تنا ہوا نہ ہوتا اور یہ کبوتری یوں بے خوفی سے یہاں انڈے نہ دیتی۔

یہ سوچ کر بے نیل و مرام واپس چلے آئے اور یوں اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تدبیر کو اپنے مکر سے تعبیر کیا۔

ان واقعات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہود و مشرکین کے منصوبے مکر شیطانی کے مظہر تھے جب کہ خدائی تدبیر عین عدل پر مبنی تھی۔

انسان مجبور ہے یا آزاد؟

سوال ۵

لاَ جَبْرَ وَلاَ تَفْوِیْضَ بَلْ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ۔ (اصول کافی ج۱، ص۱۴۰، ح۱۳)

"نہ تو جبر صحیح ہے اور نہ ہی تفویض درست ہے بلکہ معاملہ دو معاملات کے درمیان ہے۔"

درج بالا حدیث کی مثالوں سے وضاحت فرمائیں۔

جواب

معصوم کے اس فرمان میں جبر و تفویض کی نفی کی گئی ہے۔ چنانچہ فرمان کا پہلا حصہ یہ ہے: "لاَ جَبْرَ" یعنی جبر نہیں ہے۔

مقصد یہ ہے کہ مخلوق اپنے اچھے اور برے اعمال کے بجالانے میں مجبور محض نہیں ہے اور ان کی حیثیت ارادہ خداوندی کے سامنے ایک آلہ کی نہیں ہے اور مخلوق کسی قصاب کے ہاتھ کی چھری نہیں ہے کہ وہ جدھر اور جس پر اسے پھیرتا چلا جائے وہ پھرتی چلی جائے۔

جبر کا باطل ہونا بدیہیات میں سے ہے اور ہر شخص کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ وہ افعال و اعمال میں مجبور محض نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے افعال کے ارادہ و عزم اور بجالانے یا نہ بجالانے میں اپنے آپ کو آزاد اور صاحب اختیار محسوس کرتا ہے اور ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اس کے اعمال و افعال رعشہ کے مریض کی حرکت کی طرح سے بلاارادہ اس سے ہرگز صادر نہیں ہوتے۔

اسی لئے حضرت محقق قمی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب قوانین میں لکھا: گو جبری اپنے موقف کی تائید کے لئے ہزار دلیلیں بھی کیوں نہ پیش کریں پھر بھی انسانی وجدان کے مقابلے میں وہ لغو اور بے اثر ثابت ہوں گی۔

نظریہ جبر کو صحیح مان لینے سے یہ قباحت لازم آتی ہے کہ جزا و سزا کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے کیونکہ انسان کو مجبور محض تسلیم کرلیا جائے تو کسی نیک کی نیکی قابل مدح نہیں رہتی اور کسی برے شخص کی برائی لائق مذمت نہیں رہتی کیونکہ نیک نیکی کرنے میں مجبور تھا اسی لئے وہ کسی جزا کا حقدار نہیں رہتا اور برا شخص برائی کرنے میں مجبور تھا لہٰذا وہ اپنی برائی کی وجہ سے سزا کا حقدار نہیں رہتا اور جب معاملہ ہی یہ صورت اختیار کرلے تو پھر جنت و دوزخ کا وجود عبث ہے اور روز جزا ہی بے فائدہ ہے۔

اگر اس نظریہ کو درست مان لیا جائے تو ہابیل رحمت کا حقدار نہیں رہتا اور قابیل لعنت کا مستحق نہیں رہتا کیونکہ ہابیل شہید ہونے میں مجبور تھا اور قابیل قتل کرنے پر مجبور تھا اور اس نظریے کے تحت ابراہیم علیہ السلام قابل مدح نہیں رہتے اور نمرود لعین قابل مذمت نہیں رہتا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام اپنے فعل میں مجبور تھے اور نمرود بھی اپنے فعل میں مجبور تھا۔

الغرض اس فاسد نظریے کو مان لینے سے دنیا کی کوئی نیکی نیکی نہیں رہتی اور دنیا کی کوئی برائی برائی نہیں رہتی جبکہ انسانی ضمیر و وجدان کا ہر دور میں یہ فیصلہ رہا ہے کہ نیکی لائق ستائش اور برائی قابل ملامت ہے اور نیکوکار لائق صلہ اور بدکار لائق عقوبت ہے اور اگر انسان اپنی تنہائی کے لمحات میں بھی کوئی غلط کام سرانجام دے تو پھر بھی اس کا ضمیر بشرطیکہ مر نہ چکا ہو، اسے ملامت ضرور کرتا ہے اور ضمیر کی یہ ملامت اس عقیدہ کا ثبوت ہے کہ نظریہ جبر غلط ہے۔

معصوم کے فرمان کا دوسرا حصہ یہ ہے: "وَلاَ تَفْوِيضَ" یعنی تفویض بھی نہیں ہے۔

تفویض سے مراد یہ ہے کہ انسان کو کلی اختیارات دے دیئے گئے ہوں اور وہ ہر خواہش کو پورا کرنے پر قادر ہو اور تمام امور میں "فاعل مایشاء" (جو چاہے کرسکے) ہو۔

جس طرح سے عقیدہ جبر انسانی ذہن و ضمیر کے خلاف ہے کیونکہ ہر صاحب شعور اپنی زندگی کے کئی مراحل سے بخوبی واقف ہے کہ اس نے کسی کام کے کرنے کا عزم بالجزم کیا تھا لیکن بعد میں اس کا ارادہ بدل گیا یا اس کے اور اس کے ارادہ کے درمیان چند امور حائل ہوگئے جس کی وجہ سے اسے اپنا ارادہ بدلتے ہی بنی۔

اور ہر انسان کی زندگی میں ایسے بے شمار مواقع موجود ہیں کہ اس نے کسی

امر کو سرانجام دیا ہو اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ اسی طرح سے ہر انسان کی زندگی میں ایسے مواقع موجود ہیں کہ اس نے کسی کام کو سرانجام دینے کے متعلق سوچا تک نہ ہو یا مذکورہ کام نہ کرنے کا خواہش مند ہو مگر اسے وہ کام سرانجام دینا پڑ گیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ جب کسی نے سراللہ فی العالمین حضرت امیر المومنینؑ سے پوچھا تھا کہ آپؑ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا؟ تو اس کے جواب میں حضرتؑ نے ارشاد فرمایا تھا: عَرَفْتُ اللّٰهَ سُبْحَانَهُ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَ حَلِّ الْعُقُوْدِ وَ نَقْضِ الْهِمَمِ۔ (نہج البلاغہ، قصار الحکم ۲۵۰) "یعنی میں نے اللہ سبحانہ کو پہچانا ارادوں کے ٹوٹ جانے، نیتوں کے بدل جانے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔"

(ارادوں کے ٹوٹنے اور ہمتوں کے پست ہونے سے خداوند عالم کی ہستی پر اس طرح استدلال کیا جاسکتا ہے کہ مثلاً ایک کام کے کرنے کا ارادہ ہوتا ہے مگر وہ ارادہ فعل سے ہمکنار ہونے سے قبل ہی بدل جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی اور ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ارادوں کا بدلنا اور ان میں تغیر و انقلاب کا رونما ہونا اس کی دلیل ہے کہ ہمارے ارادوں پر ایک بالادست قوت کار فرما ہے جو انہیں عدم سے وجود اور وجود سے عدم میں لانے کی قوت و طاقت رکھتی ہے اور یہ امر انسان کے احاطہء اختیار سے باہر ہے۔ لہٰذا اسے اپنے سے مافوق ایک طاقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ جو ارادوں میں ردوبدل کرتی رہتی ہے۔ مترجم اردو)

کون عاقل خود کو نتیجہ آور اور جو چاہے کرنے کے قابل سمجھتا ہے جبکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ "لا يملك لنفسه نفعاً ولا ضراً ولا موتا ولا حيوةً ولا نشوراً" (مفاتیح الجنان، تعقیبات نماز عصر) یعنی اسے اپنے لئے کسی فائدہ، نقصان، موت، زندگی یا دوبارہ پیدا ہونے کا اختیار نہیں ہے۔

فرقہ معتزلہ تفویض کا قائل تھا اور اس نظریے کو تسلیم کرنے سے یہ

قباحت لازم آتی ہے کہ اگر مخلوق کو بالکل ہی ہر لحاظ سے خود مختار اور فاعل مایشاء مان لیا جائے تو اس صفت فاعلیت میں مخلوق خدا کی شریک قرار پائے گی جو کہ محال ہے اور بعض معتزلہ نے تو اس سلسلے میں یہاں تک کہا ہے کہ مقدراتِ عباد سے قدرت خداوندی کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

جبر اور تفویض کے دونوں نظریے یک طرفہ اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں لیکن صحیح راستہ کو معصوم نے ان الفاظ سے واضح کیا: بَلْ اَمْرٌ بَیْنَ اَمْرَیْنِ. "یعنی معاملہ دونوں کے درمیان میں ہے۔" مخلوق مسلوب الاختیار اور تام الاختیار نہیں ہے۔

اس سے زیادہ صریح الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مخلوق اپنے تمام اختیاری افعال میں اس بات کی محتاج ہے کہ مشیت خدا ان کے کام میں ان کے موافق ہو ورنہ اختیاری فعل بھی سرزد نہ ہو سکے گا اور تمام نیک افعال کی ادائیگی کے لئے مخلوق توفیق پروردگار کی محتاج ہے۔ اگر ذات حق کی طرف سے توفیق میسر نہ ہوئی تو انسان کوئی نیکی کا کام سرانجام نہ دے سکتا۔

اور برائی کرنے کی صورت میں انسان "خذلان" (بے یاوری و بے مددگاری) کے زیر اثر ہوتا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ "توفیق و خذلان" کے اسباب بندہ خود ہی فراہم کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ جب ایک شخص نے مولائے متقیان حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلاَّ بِاللّٰهِ" کا مقصد دریافت کیا تو آپؑ نے ارشاد فرمایا: لَاحَوْلَ بِنَا عَنْ مَعَاصِی اللّٰهِ اِلاَّ بِعِصْمَةِ اللّٰهِ وَلَا قُوَّةَ لَنَا عَلٰی طَاعَةِ اللّٰهِ اِلاَّ بِعَوْنِ اللّٰهِ. "یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی ہمارے اندر کوئی طاقت نہیں ہے جب تک وہ خود محفوظ نہ رکھے اور ہمیں اللہ کی اطاعت کی قوت نہیں ہے جب تک وہ خود ہماری امداد نہ فرمائے۔"

ایک اور حدیث میں اس مسئلہ کو ان الفاظ سے واضح کیا گیا ہے:

"اَلْخَیْرُ بِتَوْفِیْقِ اللّٰهِ وَالشَّرُّ بِخِذْلَانِ اللّٰهِ."

"خیر" اللہ کی توفیق سے اور "شر" اللہ کی طرف سے چھوڑ دینے کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے۔

جن لوگوں نے اسلام کا نام تک نہ سنا ہو کیا ان کا محاسبہ کیا جائے گا؟

سوال ۶

اگر کوئی شخص براعظم افریقہ، امریکہ یا آسٹریلیا کے دور دراز علاقے میں رہتا ہو جہاں اس نے عمر بھر اسلام کا نام تک نہ سنا ہو یا اگر بالفرض سنا بھی ہو تو اسلام کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو تو کیا ایسے شخص سے اسلام کے متعلق باز پرس کی جائے گی؟

جواب

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایسے افراد کو موت کے بعد عذاب نہیں دیا جائیگا اور ان سے اسلام کے متعلق سوال نہیں کیا جائیگا اور ایسے افراد عقاب وعتاب کے مستحق نہیں ہونگے اور عقل و نقل سے یہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ ایسے افراد کا مواخذہ عدل الٰہی کے خلاف ہے کیونکہ ان پر حجت تمام نہیں ہوئی اسی لئے ان کا مواخذہ درست نہیں ہے اور قرآن مجید میں اللہ تعالٰی کا فرمان ہے:

اِلاَّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لاَ یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً

وَّلاَ یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلاً فَاُولٰٓئِكَ عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا.

(النساء ۹۸-۹۹) "علاوہ ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے جن کے اختیار میں کوئی تدبیر نہ تھی اور وہ کوئی راستہ نہ نکال سکتے تھے یہی وہ لوگ ہیں جن کو عنقریب خدا معاف کردے گا کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے"

کفایۃ الموحدین میں مرقوم ہے: مستضعف مرد اور عورتوں سے وہ قاصر العقول افراد مراد ہیں جن کے عقل کی کمزوری کی وجہ سے ان پر اتمام حجت نہ ہوا ہو یا ایسے افراد مراد ہیں جن کے کانوں تک اسلام اور ایمان کے الفاظ تک نہ پہنچے ہوں اور ان میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جنہیں اسلام وایمان کے حاصل کرنے کی قدرت حاصل نہ ہوئی ہو۔ پاگل، بے وقوف، بہرے، گونگے اور زمانہ جاہلیت میں مرجانے والے افراد ان میں شامل ہیں اور خلاصہ یہ کہ مستضعف سے ایسے تمام افراد مراد ہیں جن پر حجت تمام نہ ہوئی ہو۔

مستضعف کفار یعنی وہ افراد جنہوں نے اپنی زندگی میں خدا و آخرت پر ایمان کی سعادت حاصل نہ کی ہو اور حالت کفر میں مرجائیں اور فُساق یعنی خلاف عقل و شریعت افعال بجالانے والے افراد اگر توبہ کئے بغیر مرجائیں تو ایسے افراد اپنے قصور اور تقصیر کے تابع ہوں گے۔ اگر وہ زندگی بھر اسلام و ایمان سے قاصر رہے ہوں گے تو انہیں عذاب نہیں دیا جائے گا اور اگر ان کی طرف سے تقصیر واقع ہوئی ہوگی تو تقصیر کی مقدار کے مطابق سزا پائیں گے۔

اس مقام پر قاصر اور مقصر کے فرق کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ قاصر وہ ہے جو کسی چیز کے حاصل کرنے سے بالکل معذور ہو اور مقصر وہ ہے جو معذور نہ ہو بلکہ اس نے حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔ اس سے زیادہ آسان الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "قصور" کو تاہ ہونے کو کہتے ہیں اور "تقصیر" کو تاہی کرنے کو کہتے

ہیں۔ مثلاً اگر ایک شخص کا قد و قامت ایک میٹر ہو اور اسے دو میٹر طعام یا دوا کی ضرورت ہو لور ایسا شخص اپنی فطری کوتاہی کی وجہ سے طعام و دوا کو حاصل نہ کرسکنے کی وجہ سے مرجائے تو یہ قاصر کہلائے گا لور اگر کسی شخص کا قد و قامت دو میٹر ہو لور اسے طعام یا دوا کے لئے بھی دو میٹر کی ضرورت ہو لیکن ایسا شخص طعام لور دوا کے لئے اپنی جگہ سے حرکت تک کرنا گوارا نہ کرے لور یوں بھوک یا بیماری کی وجہ سے مرجائے تو ایسا شخص مقصر کہلائے گا۔ قاصر سے کوئی بازپرس نہ ہوگی جبکہ مقصر اپنی موت کے اسباب کا خود ذمہ دار ہے۔ لہٰذا اس سے اس کی خودکشی کے متعلق پوچھا جائے گا لور اسے عذاب بھی دیا جائے گا۔

اب اس مثال کو سامنے رکھیں اور اس کی روشنی میں یہ سمجھیں کہ جو لوگ عقل کی کمی کی وجہ سے خدا و رسول و یوم آخرت پر ایمان نہ لائے لور اسی حالت میں ان کی موت واقع ہوگئی تو ایسے افراد "قاصر" قرار پائیں گے لور انہیں کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا لور اسی طرح سے جن لوگوں نے پوری زندگی میں ایمان و اسلام کا نام تک نہ سنا ہو یا اگر انہوں نے اتفاق سے یہ نام سنا بھی ہو تو بھی اسلام و ایمان کے اجمال و تفصیل سے بے خبر رہے ہوں لور انہیں ایمان و اسلام کی وضاحت سننے کا کوئی موقع میسر نہ آیا ہو تو ایسے افراد عاجز لور قاصر قرار پائیں گے کیونکہ ان کی طرف سے کسی طرح کی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ اسی لئے انہیں اسلام و ایمان نہ لانے کی وجہ سے کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا۔

لیکن گناہ و فسق کے اعتبار سے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں کچھ گناہ وہ ہیں جنہیں شریعت نے گناہ قرار دیا ہے۔ مثلاً زکوۃ ادا نہ کرنا لور خمس لوا نہ کرنا لور کچھ گناہ ایسے ہیں جنہیں انسانی فطرت گناہ قرار دیتی ہے۔ مثلاً کسی کو ناحق قتل کرنا۔ تو اگر کوئی کافر قاصر ایسا گناہ کرے جسے شریعت نے گناہ قرار

دیا ہے تو اس سے کوئی بازپرس نہ ہوگی لیکن اگر کوئی کافر قاصر ایسا گناہ کرے جسے انسانی فطرت گناہ قرار دیتی ہو تو یقیناً اس سے اس گناہ کی بازپرس کی جائے گی۔

بالفاظ دیگر کافر قاصر سے ایمان و اسلام لور نماز و زکوۃ کی پرسش نہ ہوگی لیکن اگر اس نے کسی کو ناحق قتل کیا ہوگا تو اس سے قتل کی بازپرس ضرور کی جائیگی۔

کیا ہدایت و گمراہی خدا کی طرف سے ہے؟

سوال ۷

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۤءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۤءُ۔ (المدثر ۳۱)

"اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے لور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔"

آیت بالا عقل سلیم کو کچھ "گراں" سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب

۱۔ یہ آیت ہدایت و ضلالت پر اللہ کی قدرت کی خبر دیتی ہے۔ یعنی اللہ جس کو چاہے طوعاً یا کرہاً ہدایت دینے پر قادر ہے۔ یعنی چاہے تو اسے خیر عطا کرے اور اگر چاہے تو اسے شر میں مبتلا کردے لیکن بندے سے اختیار کو سلب کرلینا حکمت الٰہیہ کے منافی ہے۔ لہٰذا وہ ایسا نہیں کرتا کیونکہ اگر انسان کو ہدایت و گمراہی میں مجبور مان لیا جائے تو ثواب و عقاب کا استحقاق ختم ہو جاتا ہے لہٰذا آیت بالا قدرت الٰہیہ کی خبر ہے اس کے وقوع کی خبر نہیں ہے۔

۲۔ اس آیت میں ہدایت سے مراد صرف بھلائی کی راہ دکھانا نہیں ہے کیونکہ

راستہ دکھانے کی ذمہ داری انبیاءؑ کی ہے اور انبیاءؑ و اوصیاء نے تمام مکلفین کی راہنمائی کردی ہے اور یہاں ہدایت "ایصال الی المطلوب بدون اختیار عبد" بھی مراد نہیں ہے[1] کیونکہ اگر اللہ کسی کو اس کی مرضی اور خواہش کے بغیر مطلوب تک پہنچا دے تو بھی اس صورت میں بندہ لائق اجر قرار نہیں پاتا۔ لہٰذا اس آیت میں ہدایت و ضلالت سے مراد توفیق و خذلان ہے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے توفیق و خذلان کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

توفیق کیا ہے؟

توفیق سے مراد یہ ہے کہ اللہ کسی بندے کو اپنے لطف و کرم کا مورد بنا دے۔ راہِ سعادت کو اس کے لئے آسان بنادے۔ اسے معصیت سے دور رکھنے والے اسباب بھی فراہم کردے اور اس کے دل کو نیکی اور بھلائی کی جانب مائل کردے۔ توفیق کا کامل مرتبہ یہ ہے کہ اللہ اپنے بندے کو اطاعت کی حلاوت اور معصیت کے کڑوے پن سے آشنا کردے اور یہ بات بدیہی ہے کہ ہدایت کی یہ قسم یعنی راہ سعادت کا آسان ہونا، بندے کے اختیار کے منافی نہیں ہے۔ اسی لئے اس آیت مجیدہ کا مفہوم یہ ہوگا: "اللہ تمام اسباب سعادت کی جسے چاہتا ہے توفیق عطا فرما دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسباب سعادت سے محروم کردیتا ہے۔" (یعنی اسے اس کے اپنے نفس کے حوالے کردیتا ہے)۔

---

[1] ہدایت کے دو معنی ہیں۔ ایک راستہ دکھانا اور دوسرا مطلوب تک پہنچانا۔ پہلے معنی پر قرآن مجید کی یہ آیت دلالت کرتی ہے: اما ثمود فهديناهم فاستحبوا العمى على الهدى. "ہم نے ثمود کو ہدایت کی لیکن انہوں نے تاریکی کو ہدایت پر ترجیح دی۔"
یہاں لفظ ہدایت راستہ دکھانے کے معنی میں ہے اور دوسرے معنی کے لئے قرآن مجید کی یہ آیت دلالت کرتی ہے: انك لا تهدى من احببت. "آپ جس سے محبت رکھیں اسے ہدایت نہیں دے سکتے۔" یہاں لفظ ہدایت مطلوب تک پہنچانے کے معنی میں ہے۔ (س۔ المترجم عفی عنہ)

واضح رہے کہ ہدایت و ضلالت کے لئے مشیت خداوندی مطلقاً بے اثر نہیں ہے اور اس مشیت کا تعلق پھر بھی انسان کے ذاتی ارادہ و اختیار کے ساتھ ہے۔ یعنی جو لوگ انبیاءؑ کی دعوت کو قبول کرتے ہیں تو اللہ انہیں اپنے الطاف و عنایات کا مستحق قرار دیتا ہے جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ اٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ. (محمدؐ ۱۷)

"اور جن لوگوں نے ہدایت حاصل کرلی خدا نے ان کی ہدایت میں اضافہ کردیا اور ان کو مزید تقویٰ عنایت فرمادیا۔"

ہدایت و توفیق کے بہت سے مدارج و مراتب ہیں۔ جب کوئی بندہ ہدایت کے ایک درجہ پر پہنچ جائے اور ہدایت کے حصول پر اللہ کا شکر بجالائے تو اللہ اسے ہدایت کے بلند تر رتبہ پر فائز کردیتا ہے۔ اور اس کے برعکس بدنصیب افراد اپنے ہی غلط انتخاب کی وجہ سے توفیق ایزدی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ان دو معانی کے علاوہ آیتِ مجیدہ میں کچھ دیگر معانی کا بھی احتمال ہے البتہ ہم سردست انہی دو معانی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ابلیس موحد ہونے کی بنا پر قابل بخشش ہے یا نہیں؟

سوال ۸

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا. (النساء ۱۱۶)

"خدا اس بات کو معاف نہیں کرسکتا کہ اس کا شریک قرار دیا جائے اور اس

کے علاوہ جس کو چاہے بخش دے اور جو کوئی خدا کا شریک قرار دیتا ہے وہ گمراہی میں بہت دور تک چلا گیا ہے۔"

اس آیت مجیدہ کے تحت سوال یہ ہے کہ شیطان موحد تھا اور اب بھی وہ موحد ہے تو کیا وہ اس آیت مجیدہ کی نوید میں شامل ہے یا نہیں ہے؟

جواب

یہ درست ہے کہ ابلیس ابتداء میں مشرک نہیں تھا کیونکہ شرک خلق یا اطاعت یا عبادت میں خداوند عالم کے ساتھ کسی کو شریک ماننے کا نام ہے اور ابتدائے امر میں ابلیس میں شرک کی مذموم صفت موجود نہیں تھی لیکن اس ملعون نے شرک سے بھی بدتر کام یعنی کفر سرانجام دیا اور کفر عناد و تکبر کی بنا پر اللہ کی اطاعت کو ترک کرنے کے عمل کو کہا جاتا ہے اور نص قرآن سے واضح ہوتا ہے کہ ابلیس لعین کافر تھا اور کافر مشرک سے بھی بدتر ہے۔

اَبٰی وَاستَکبَرَ وَکَانَ مِنَ الکَافِرِینَ۔ (البقرہ ۳۴) "اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے تھا۔"

زرارہ نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے آپؑ نے فرمایا:

وَاللّٰهِ اِنَّ الکُفرَ لَاَقدَمُ مِنَ الشِّرکِ وَاَخبَثُ وَ اَعظَمُ قَالَ ثُمَّ ذَکَرَ کُفرَ اِبلِیسَ حِینَ قَالَ اللّٰهُ لَهُ اسجُد لِاٰدَمَ فَاَبٰی اَن یَّسجُدَ فَالکُفرُ اَعظَمُ مِنَ الشِّرکِ۔
(اصول کافی ج ۴۔ ص ۹۳۔۹۴)

"خدا کی قسم کفر، شرک سے زیادہ پرانا اور زیادہ خبیث اور زیادہ جرم ہے۔ پھر آپؑ نے ابلیس کے کفر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا چنانچہ معلوم ہوا کہ کفر، شرک سے بھی زیادہ برا ہے۔"

وَعَن اَبِی عَبدِاللّٰهِ عَلَیهِ السَّلَامُ وَسُئِلَ عَنِ الکُفرِوَالشِّرکِ اَیُّهُمَا اَقدَمُ فَقَالَ الکُفرُاَقدَمُ وَذٰلِكَ اِنَّ اِبلِیسَ اَوَّلُ مَن کَفَرَوَکَانَ کُفرُهُ غَیرُشِرکٍ لِاَنَّهُ لَم یَدعُ اِلٰی عِبَادَةِ غَیرِ اللّٰهِ وَاِنَّمَادَعٰی اِلٰی ذٰلِكَ بَعدُفَاَشرَكَ۔ (اصول کافی ج ۴۔ ص ۹۷)

"امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کفر و شرک میں سے اولیت کسے حاصل ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: کفر، شرک سے مقدم ہے کیونکہ ابلیس نے سب سے پہلے کفر کیا تھا اور اس وقت اس کے کفر میں شرک شامل نہیں تھا اور اس نے اس وقت غیر اللہ کی عبادت کی دعوت نہیں دی تھی البتہ اس نے بعد میں غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دی تو پھر مشرک بھی بن گیا۔"

اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان صرف کافر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مشرک بھی ہے۔ اس کے کفر کی دلیل یہ ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اور ضد کرتے ہوئے اللہ کے فرمان کو ٹھکرایا اور اس نے ایسا کر کے حقیقت میں خداوند عالم کی الوہیت اور استحقاق اطاعت و معبودیت کا انکار کیا۔ امام علی رضا علیہ السلام کی ایک حدیث میں ایسے کفر کو "کفر الجحود" یعنی وہ کفر جو سراسر نافرمانی اور انکار پر مشتمل ہو، قرار دیا گیا۔

ابلیس لعین مشرک بھی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے راندہ درگاہ بنایا اور اس پر لعنت کی تو اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لئے شرک کی ترغیب دی اور دنیا میں پایا جانے والا تمام تر شرک اسی کا ایجاد کردہ ہے اور یہ بات انتہائی واضح ہے کہ صرف مشرک ہونا اتنا بڑا جرم نہیں ہے جتنا کہ شرک کی دعوت دینا جرم ہے۔ اسی لئے اس پر لعنت ہے کہ وہ کافروں میں پہلا اور سردار مشرکین ہے۔

اس سوال میں یہ پوچھا گیا ہے کہ شرک کسی قیمت پر قابل بخشش نہیں ہے لیکن شرک کے علاوہ باقی تمام گناہ اگر خدا چاہے تو بخشے جاسکتے ہیں اور ابلیس لعین

مشرک نہیں تھا۔

اس سوال کا واضح جواب ہے کہ ابلیس پہلے پہل کافر تھا اور انسانوں کو کفر کی دعوت دیتا تھا لیکن بعد میں وہ مشرک بھی بن گیا اور لوگوں کی شرک کی دعوت دینے لگا اور روز اول سے لے کر آج تک وہ ایک لمحے کے لئے بھی اللہ پر ایمان نہیں لایا۔

کیونکہ صرف خدا کے وجود کو مان لینا ہی ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ اور تمام جہان کو خدا کی مخلوق تصور کرے اور خدا کو ہی رازق و تربیت کنندہ سمجھے اور اپنی اور تمام جہان کی حیات کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہو اور صرف خدا کو ہی عبادت کے قابل سمجھے اور اپنے آپ کو حکم خداوندی کے سامنے خاشع و خاضع قرار دے۔ اس کے برعکس جو اپنی ہستی کو مستقل بالذات سمجھے، خدا کو بندگی کے قابل تصور نہ کرے، حکم خداوندی کے مقابلے میں اپنی رائے اور خیال کو پیش کرے اور اپنی رائے کو حکم خدا سے بھی بہتر سمجھے تو یقیناً ایسا شخص باری تعالیٰ کی الوہیت و ربوبیت و معبودیت کا منکر ہے اور ایسے فرد کا ٹھکانہ دوزخ کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔ ایسے ہی افراد کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔ (غافر ۶۰) "یقیناً جو لوگ میری عبادت سے اکڑتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔"

روزِ الست اور عالمِ ذر

سوال ۹

بیان کیا جاتا ہے کہ عالمِ ذر میں ارواح نے سعادت و شقاوت کو قبول کیا تھا۔
اب سوال یہ ہے کہ اگر انہیں مجبور کر کے شقاوت قبول کرائی گئی تھی تو یہ ظلم ہے

اور اگر ارواح صاحب شعور تھیں تو انہوں نے شقاوت کو قبول ہی کیوں کیا تھا اور اگر انہوں نے بے شعوری کی وجہ سے شقاوت کو اختیار کیا تو اس کی وجہ سے مواخذہ و عقوبت کیسی؟ ازراہِ کرم عالمِ ذر کی کیفیت کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے بحارالانوار کی جلد سوم میں طینت اور عالمِ ذر کی بہت سی روایات نقل فرمائی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے قیامت تک پیدا ہونے والے افراد کو ذرات کی صورت میں باہر نکالا اور وہ ذرات چیونٹی کی مانند چھوٹے چھوٹے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان ذرات کے ساتھ ان کی ارواح کو وابستہ فرمایا اور انہیں کمالِ عقل و شعور اور ارادہ و اختیار کی مکمل صلاحیتوں سے مالامال کیا اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرانے کے لئے فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟"

اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے انبیاءؑ و اوصیاء کی صداقت کے متعلق بھی ان سے اقرار لیا۔ ان میں جو سعید ارواح تھیں انہوں نے اپنی رضا و رغبت سے "بَلٰی" کہا۔ یعنی "بے شک تو ہمارا رب ہے اور تیرے بنائے ہوئے ہادی ہمارے رہبر ہیں۔" اور بدنصیب ارواح نے بڑی بے رغبتی اور بے زاری سے "بَلٰی" کہا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا اور ان کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ ظاہر کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ تم اس میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ سعید ارواح بلا کسی خوف و خطر کے اس آگ میں کود پڑیں اور قدرت خدا سے وہ آگ ان کے لئے سلامتی بن گئی اور باقی ارواح اس حکم کو بجا نہ لائیں۔ تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امتحان لیا گیا۔

طینت اور عالمِ ذر اور میثاق کے متعلق علماء کے تین نظریات ہیں:

۱۔ پہلا مسلک محدثین اور اخباری علماء کا ہے اور ان کا ان روایات کے متعلق موقف یہ ہے کہ یہ متشابہ قسم کی احادیث ہیں اور ان کی حقیقت و ماہیت کا ادراک ہمارے عقل و فہم سے بہت بلند ہے اور ہم ان پر اجمالی ایمان رکھتے ہیں اور اس کی حقیقت کو اہلبیت طاہرین کے سپرد کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا مسلک شیخ مفید، سید مرتضیٰ علم الہدیٰ، شیخ طبرسی صاحب مجمع البیان اور دیگر مفسرین کا ہے اور اس سلسلے میں ان بزرگواروں کا موقف یہ ہے کہ طینت کی متعلقہ احادیث و آیات کنایہ اور مجاز و استعارہ پر مبنی ہیں اور اس کی تفصیل بحار اور شرح کافی میں موجود ہے۔

شیخ مفید علیہ الرحمۃ عالم ذر کے متعلق فرماتے ہیں : خبر صحیح میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ذریت آدمؑ کو حضرت آدمؑ کی پشت سے ذرات کی صورت میں برآمد کیا جس سے پورا افق بھر گیا اور کراں تا کراں ذرات پھیل گئے۔ آدمؑ کی پشت سے خارج ہونے والے ذرے تین طرح کے تھے۔ ان میں سے کچھ ذرے نور محض کی صورت میں تھے اور وہ ذرات انبیاءؑ و اوصیاء کے تھے۔ کچھ ذرے مکمل تاریک تھے اور یہ ذرے کفار کے تھے اور تیسرے قسم کے کچھ ایسے ذرے بھی تھے جن میں نور و ظلمت کی آمیزش تھی اور یہ ان مومنین کے تھے جنھوں نے اپنی مستقبل کی زندگی میں نیک و بد دونوں طرح کے اعمال سرانجام دینے تھے اور اس مخلوق کو ذرات کی صورت میں نمودار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کو ان کی کثرتِ نسل سے مطلع کرنا چاہتا تھا۔

اسی عالم ذر کے حوالے سے "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کے خدائی میثاق اور ان کے جواب کے متعلق جتنی بھی روایات ہیں ان کا تعلق "اخبار احاد" سے ہے جن پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر روایات خود ساختہ ہیں اور

قرآن مجید کی اس آیت : وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غَافِلِيْنَ اَوْتَقُوْلُوْا اِنَّمَا اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ. (الاعراف ۱۷۲۔۱۷۳)

"اور جب تمہارے پروردگار نے فرزندان آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو لے کر انھیں خود ان کے اوپر گواہ بناکر سوال کیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں تو سب نے کہا: بے شک ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ عہد اس لئے لیا کہ روز قیامت یہ نہ کہہ سکو کہ ہم اس عہد سے غافل تھے۔ یا یہ کہہ دو کہ ہم سے پہلے ہمارے بزرگوں نے شرک کیا تھا اور ہم صرف ان کی اولاد میں تھے تو کیا اہل باطل کے اعمال کی بناء پر تو ہم کو ہلاک کردے گا۔"

اس آیت میں جس عہد و پیمان کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ لفظی اور نطقی پیمان نہیں تھا اور یہ صرف حضرت آدمؑ کے زمانے میں ہی واقع نہیں ہوا تھا یہ پیمان دراصل تکوینی پیمان ہے جو کہ ہر بشر کی فطرت سے لیا گیا ہے۔ یہ دراصل تمثیلی پیمان ہے کہ قدرت نے تمام اولاد آدمؑ کو اس فطرت اور مزاج کا حامل بناکر پیدا کیا ہے کہ اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ تمہارا خدا کون ہے تو پروردگار کے علاوہ کسی کا نام نہ لیں گے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ نے ہر انسان میں خدا جوئی اور خدا شناسی کی حسِ ودیعت کردی ہے۔

دور جدید کے ماہرین روحانیات اس امر پر متفق ہیں کہ انسان میں قدرتی طور پر مذہبی حس پائی جاتی ہے اور اسی حسِ کی وجہ سے انسان کو خدا شناسی کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور اگر ہر انسان اپنے وجدان و ضمیر کی طرف رجوع کرے تو وہ یہ تسلیم کریگا کہ یقیناً کوئی اس کا خالق و مربی موجود ہے اور وہ اس کے ساتھ یہ بھی اقرار

کریگا کہ اس کا خالق صرف اسی کا نہیں بلکہ کائنات کے ذرے ذرے کا خالق ہے۔

انسانی فطرت میں یہ حسِ موجود ہے کہ وہ اثر کو دیکھ کر موثر کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور عطا کو دیکھ کر معطی کی طرف دھیان دیتا ہے۔ آپ تین سالہ بچے کے سامنے کوئی کھلونا رکھیں، بچہ جیسے ہی کھلونے کو دیکھے گا تو اس کے فوراً بعد کھلونا لانے والے کو دیکھے گا۔ یہ انسان کی ازلی فطرت ہے اور اسی فطرت کو تمثیلی انداز میں پیمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳۔ اس مسئلے کے متعلق تیسرا موقف متقدمین و متاخرین علماء کی اس اکثریت کا ہے جو طینت اور عالم ذر اور میثاق کی روایات کو حقیقت پر محمول کرتے ہیں اور انہیں لفظاً و معناً درست سمجھتے ہیں اور ان میں کسی طرح کی تاویل کے روادار نہیں ہیں۔ اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ مذکورہ روایات اصول دین اور قواعد عقلی کے کسی طرح بھی معارض نہیں ہیں۔

اگر اس مقام پر اس نظریے کے حامل علماء پر یہ اعتراض کیا جائے کہ ان روایات سے نظریہ جبر کی تائید ہوتی ہے کیونکہ عالم ذر میں ارواح نے جو اقرار کیا تھا مجبوراً کیا تھا اور اس میں ان کے اختیار کا کوئی دخل نہ تھا تو اس سوال کے جواب میں یہ عرض کریں گے :

۱۔ ارواح نے عالم ذر میں جو اقرار کیا تھا وہ مکمل شعور و اختیار سے کیا تھا جیسا کہ سابقہ روایت میں بیان کیا جاچکا ہے بلکہ بعض روایات میں تو یہاں تک الفاظ وارد ہیں کہ اس وقت انہیں جتنا شعور حاصل تھا وہ انہیں اس دنیا میں کبھی حاصل نہیں ہوا۔ لہذا ارواح کا اقرار مکمل شعور و اختیار کے تحت تھا۔ اسی لئے مذکورہ روایات کسی طرح سے بھی نظریہ جبر کی مؤید نہیں ہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں مروی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضروری نہیں

ہے کہ جو کچھ ارواح نے وہاں اقرار کیا تھا یہاں بھی وہ اس پر قائم رہیں۔ انہیں اس جہان میں اس اقرار کے خلاف عمل کرنے کی بھی کامل آزادی ہے جیسا کہ امیرالمومنینؑ سے مروی ایک روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں : وَشَرَطَ فِیْ ذٰلِكَ الْبِدَآءَ فِیْهِمْ. یعنی اللہ نے اصحاب شمال (دوزخ جانے والوں) کے لئے بداء کی شرط رکھی۔ یعنی اگر عالم ذر میں کسی نے سرکشی کی تھی اور اپنی اس سرکشی کی وجہ سے "اصحاب شمال" میں سے قرار پایا تھا تو اس کے لئے اس جہان میں توبہ و انابت کی گنجائش موجود ہے۔ اگر وہ چاہے تو انبیاءؑ کی پیروی کر کے اپنی شقاوت کو ختم کر کے سعادت حاصل کر سکتا ہے اور یوں دوزخی بننے کی بجائے جنتی بن سکتا ہے۔

اسی لئے ماہ رمضان المبارک کی دعاؤں میں ہمیں یہ الفاظ دکھائی دیتے ہیں :

وَاِنْ کُنْتُ مِنَ الْاَشْقِیَآءِ فَامْسِحْنِیْ مِنَ الْاَشْقِیَآءِ وَاکْتُبْنِیْ مِنَ السُّعَدَآءِ فَاِنَّكَ قُلْتَ وَقَوْلُكَ حَقٌّ (یَمْحُوا اللّٰهُ مَایَشَآءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْکِتَابِ)

"پروردگار! اگر میں اشقیاء (بدنصیبوں) میں سے ہوں تو اشقیاء سے میرا نام مٹا کر مجھے "سعداء" (خوش نصیبوں) میں لکھ دے کیونکہ تیرا فرمان ہے اور تیرا فرمان حق ہے۔ (اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یا برقرار رکھتا ہے کہ اصل کتاب اسی کے پاس ہے)۔" (الرعد ۳۹)

اس مقام پر یہ سوال قائم کرنا کہ اگر وہ صاحب عقل تھے تو انہوں نے اپنے لئے نقصاندہ فیصلہ کیوں کیا تھا؟ اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان اپنے اختیار و شعور کے تحت اپنے لئے نقصان کا فیصلہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جو شخص سگریٹ پیتا ہے تو کیا اسے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ میرے لئے نقصاندہ ہے اور کیا اس کا ایسا کرنا اس کی مجبوری ہوتی ہے یا وہ اختیار سے سگریٹ پیتا ہے؟ وغیرہ۔ اور بعد میں اس پر پشیمان بھی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بات

بھی بخوبی معلوم ہے کہ ابلیس نے اپنے شعور و ارادے سے ہی فرمانِ حق کو ٹھکرا لیا تھا اور اپنے لئے سرکشی کی راہ کو اپنایا تھا۔

کیا امام حسینؑ کے قاتلوں کو دوبارہ قتل کیا جائے گا؟

سوال ۱۰

دعائے ندبہ میں یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں:

اَیْنَ الطَّالِبُ بِدَمِ الْمَقْتُوْلِ بِکَرْبَلَا۔

"مقتول کربلا کے خون کا قصاص طلب کرنے والا (امام مہدیؑ) کہاں ہے؟"

اب سوال یہ ہے کہ حضرت مختار ثقفی نے امام مظلوم کے قاتلوں کو قتل کیا تھا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں بدترین سزا دے گا۔ تو کیا امام مہدیؑ کے زمانہ ظہور میں قاتلین امام حسینؑ زندہ کئے جائیں گے اور انہیں از سر نو سزا دی جائے گی؟

جواب

۱۔ احادیث اہلبیتؑ سے جو چیز واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امام مہدیؑ اپنے دور ظہور میں امام مظلوم کے قاتلوں کی ان اولاد کو جو کہ اپنے آباء کے فعل پر راضی ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں یا نیت اور قول و فعل میں ان کے شریک ہوں گے قتل کریں گے لیکن اصل قاتلوں کو قتل کرنے کے متعلق ہمارے پاس کوئی مسلم دلیل نہیں پہنچ سکی کہ امام عالی مقام انہیں زندہ کر کے قتل کریں گے۔

البتہ عمومی طور پر روایات میں یہ چیز ملتی ہے کہ دشمنان آل محمدؐ کے ایک گروہ کو رجعت میں زندہ کیا جائے گا تاکہ وہ بدبخت آل محمدؐ کی سلطنت کو دیکھ سکیں اور ان سے انتقام لیا جائے گا۔ اسی عمومی روایت کے تحت ممکن ہے کہ قاتلین امام حسینؑ

بھی اس میں شامل ہوں۔

قاتلین امام حسینؑ کے متعلق یہ کہنا کہ مختار ثقفی نے انہیں قتل کر دیا تھا، پورے طور پر صحیح نہیں ہے۔ امیر مختار نے مشہور قاتلوں کو ضرور سزا دی تھی لیکن تمام قاتل ان کی گرفت میں نہیں آئے تھے اور ممکن ہے کہ ایسے قاتلوں کو حضرت امام مہدیؑ قتل کریں۔

۲۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جن ملاعین کو امیر مختار نے قتل کیا تھا، امام زمانہؑ انہیں آکر دوبارہ قتل کریں کیونکہ نبی و امام کے قاتل کو اگر ہزار بار بھی قتل کیا جائے پھر بھی اس کے جرم کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ البتہ قصاص میں "القتل بالقتل" قتل کا بدلہ قتل، صرف اس لئے ہے کہ قاتل کو دوبار قتل کرنا ممکن نہیں ہوتا لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ نبی و امام کا قاتل ایک بار قتل ہونے کی وجہ سے اپنی پوری سزا پالیتا ہے اور اگر امام مہدیؑ ان تمام قاتلوں کو جنہیں اگرچہ امیر مختار نے بھی قتل کیا تھا، زندہ کر کے دوبارہ قتل کریں تو امامؑ اس کا مکمل حق رکھتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے جواب کی ابتداء میں بتایا ہے کہ یہ چیز روایات سے ثابت نہیں ہے اور مزید وضاحت کے لئے "**ومن قتل مظلوما** ..."[1] کی آیت کی تفسیر کے لئے تفسیر البرہان کا مطالعہ کریں۔

مسئلہ بدا

سوال ۱۱

مسئلہ بدا کی تسلی بخش وضاحت فرمائیں۔

۱۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت ۳۳۔

جواب

جیسا کہ "دینی احکام" میں ناسخ و منسوخ ہوتا ہے اسی طرح "تکوینی امور" میں بداء ہوتا رہتا ہے۔

شرعی امور میں مصلحت کے پیش نظر حکم سابق کو تبدیل کر کے نیا حکم جاری کرنا "نسخ" کہلاتا ہے۔ اسی طرح مصلحت کی تبدیلی کی وجہ سے خالق کائنات بندوں کے امور میں جو تبدیلی کرے اس کو "بدا" کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ احادیث میں ہے کہ صلہ رحم اور دعا اور صدقہ کی وجہ سے عمر میں اضافہ ہو جاتا ہے چنانچہ قوم یونسؑ پر عذاب کا فیصلہ ہو چکا تھا مگر ان کی گریہ و زاری اور توبہ کی وجہ سے اللہ نے اپنے عذاب کو ان سے ہٹا دیا۔

بحارالانوار میں حضرت امام صادقؑ سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی شخص صلہ رحمی کرتا ہے تو اگر اس کی عمر تین سال باقی ہوتی ہے تو اللہ اسے تیس سال کی عمر عطا کر دیتا ہے اور قطع رحمی کرنے والے شخص کی اگر عمر تیس سال باقی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے کم کر کے تین سال بنا دیتا ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: يَمْحُوا اللّٰهُ مَايَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ. (الرعد ۳۹)

"اللہ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یا بر قرار رکھتا ہے کہ اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔"

بحارالانوار کی جلد ۷۸ میں ہے: قَالَ اَمِيْرُالْمُؤْمِنِيْنَ: مَوْتُ الْاِنْسَانِ بِالذُّنُوْبِ اَكْثَرُ مِنْ مَّوْتِهٖ بِالْاَجَلِ وَ حَيَاتُهٗ بِالْبِرِّ اَكْثَرُ مِنْ حَيَاتِهٖ بِالْعُمْرِ.

"لوگ اپنی مقرر کردہ موت کی بہ نسبت گناہوں کی وجہ سے زیادہ مرتے ہیں اور مقرر کردہ عمر کی بہ نسبت نیکی کی وجہ سے زیادہ عمر پاتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ بندوں کی مصلحت اور ان کی تضرع و زاری اور نیکی و صلہ رحمی کی وجہ سے ان کی تقدیر میں تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے ہادیانِ دین نے اس مسئلہ کو خاصی اہمیت دی ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے: مَاعُبِدَاللّٰهُ بِشَيْءٍ مِثْلَ الْبَدَآءِ.

"بدا سے بڑھ کر اللہ کی اور کسی چیز سے عبادت نہیں کی گئی۔"

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں: مَا عُظِّمَ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِثْلَ الْبَدَآءِ.

"بدا سے بڑھ کر اللہ کی کسی اور چیز سے تعظیم نہیں کی گئی۔" (الکافی ج ۱۔ ص ۱۴۶)

الکافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے: مَا اَرْسَلَ اللّٰهُ نَبِيًّا مِنْ اَنْبِيَائِهٖ اِلٰى اَحَدٍ حَتّٰى يَاْخُذَ عَلَيْهِ ثَلَاثَةَ اَشْيَآءٍ قُلْتُ: وَاَيُّ شَيْءٍ هُوَ يَا سَيِّدِيْ قَالَ اَلْاِقْرَارُلِلّٰهِ بِالْعُبُوْدِيَّةِ وَالْوَحْدَانِيَّةِ وَاَنَّ اللّٰهَ يُقَدِّمُ مَايَشَآءُ وَيُؤَخِّرُ مَايَشَآءُ.
(بحارالانوار ج ۲۷ ص ۲۸۶ بحوالہ الکافی)

اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے تین باتوں کا عہد لیا۔ میں نے عرض کیا وہ کیا ہیں؟ فرمایا: (۱) اپنی بندگی کا۔ (۲) اپنی توحید و یگانگت کا۔ (۳) اس اعتقاد کا اقرار کہ وہ جسے چاہتا ہے آگے کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے پیچھے کر دیتا ہے۔

الکافی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: لَوْعَلِمَ النَّاسُ مَافِي الْقَوْلِ بِالْبَدَآءِ مِنَ الْاَجْرِ مَافَتَرُوْا عَنِ الْكَلَامِ فِيْهِ. (کافی ج ۱۔ ص ۱۴۸)

"اگر لوگوں کو عقیدہ بدا کے اقرار کی فضیلت کا پتہ چل جاتا تو وہ بدا کے اظہار و تکلم میں ہرگز سستی روا نہ رکھتے۔"

اور بدا کے لفظی معنی یہ ہیں: ظُهُوْرُ الشَّيْءِ بَعْدَ الْخَفَاءِ. "کسی چیز کا مخفی ہونے کے بعد ظاہر ہونا۔"

واضح رہے کہ بدا کے لئے ذات احدیت کے حق میں ندامت کے معنی کفر

ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی مصلحت کے پیش نظر بندہ کے حالات میں تبدیلی لاتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے : "بَدَا اللّٰهُ فِیْ شَانِهٖ کَذَا." یعنی خدا کو فلاں کے متعلق بدا ہوا ہے۔ یعنی اللہ نے اس امر کو ظاہر کیا جو کہ اس سے قبل لوگوں پر پوشیدہ تھا کیونکہ لوگوں کو جدید امر کے علل و اسباب کا علم نہیں ہوتا اسی لئے وہ بے خبر ہوتے ہیں۔

بدا میں بے خبری کی نسبت مخلوق کی طرف ہوتی ہے خالق کی طرف نہیں ہوتی اور امام جعفر صادقؑ کے اس فرمان کا بھی یہی مقصد ہے : مَا بَدَا اللّٰهُ فِیْ شَیْءٍ کَمَا بَدَا اللّٰهُ فِیْ اِسْمَاعِیْلَ. یعنی جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کے متعلق (جو آنجنابؑ کے فرزند تھے) جدید فیصلہ کیا ہے ایسا کسی کے متعلق فیصلہ نہیں کیا تھا۔

مذکورہ حدیث دراصل ایک دوسری حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: کَانَ الْقَتْلُ قَدْ کُتِبَ عَلٰی اِسْمَاعِیْلَ مَرَّتَیْنِ فَسَاَلْتُ اللّٰهَ فِیْ رَفْعِهٖ عَنْهُ فَرَفَعَهٗ. اسماعیلؑ کے لئے دو مرتبہ قتل کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن میں نے ہر بار اللہ سے اس فیصلہ کے ہٹانے کی درخواست کی تو اللہ نے اس کی قتل سے گلوخلاصی کر دی۔

معذور و اپاہج افراد کے پیدا کرنے کی حکمت

سوال ۱۲

سیاہی اور سفیدی، اندھا پن اور بینائی، بد صورتی اور خوبصورتی، عقلمندی اور دانائی، بظاہر عدل کے خلاف دکھائی دیتی ہیں کیونکہ ایک بد صورت یا اندھا شخص اکثر

دنیاوی خواہشات کی تکمیل سے محروم رہتا ہے اور معذور افراد اکثر نیکیوں سے بھی بے بہرہ رہتے ہیں۔ تو کیا ان کی محرومیوں کا آخرت میں ازالہ کیا جائے گا؟

اور اگر کوئی معذور شخص کافر ہو کر مرے تو کیا اسے آخرت میں بھی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا اور یوں وہ دنیا و آخرت میں بد نصیب بن جائے گا۔ آخر اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟

جواب

بنی نوع انسان کا خوبصورتی و بد صورتی، کامل الاعضاء ہونے یا ناقص الاعضاء ہونے کا اختلاف اور دیگر عوارضات مثلاً غربت و امارت اور صحت و سلامتی کے اعتبار سے ان میں جو فرق پایا جاتا ہے اور اس فرق میں جو حکمتیں پوشیدہ ہیں ہم ان میں سے چند حکمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ دنیا کا قاعدہ ہے : تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِهَا. "چیزوں کی پہچان ان کی ضدوں سے ہوتی ہے۔"

اگر بد صورتی نہ ہوتی تو خوبصورتی کی دنیا میں کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی اور اگر معذور اور اپاہج نہ ہوتے تو خلقت میں مکمل ہونے کی نعمت کا لوگوں کو پتہ ہی نہ چلتا اور اگر دنیا میں نابینا افراد نہ ہوتے تو بینائی کی کوئی اہمیت ہی نہ ہوتی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اظہار کیلئے لطف و قہر دونوں صفات ضروری ہیں۔

۳۔ بعض افراد کی بہتری ہی اس میں ہے کہ وہ معذور ہوں یا غریب و مفلس ہوں۔

ایک روایت میں وارد ہے کہ ایک نبی کا گزر کسی ندی کے پاس سے ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ بہت سے بچے اس ندی میں نہا رہے تھے اور ان بچوں کے درمیان ایک نابینا بچہ بھی نہانے میں مصروف تھا۔ دوسرے بچے اسے تنگ کر رہے تھے اور اسے پانی میں غوطے دے رہے تھے اور وہ بے چارہ چلا رہا تھا۔

نبی کو اس پر ترس آیا اور بارگاہ احدیت میں درخواست کی کہ وہ اس بچے کو بینائی عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا کو قبول کیا اور بچہ بینا ہوگیا۔

جیسے ہی اسے بینائی ملی تو اس نے بچوں کو پکڑ کر غوطے دینے شروع کئے بچے جتنا بھی چیختے چلاتے وہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا اور یوں اس نے تھوڑی سی دیر میں کئی بچوں کو ہلاک کردیا۔

جب نبی نے اس منظر کو دیکھا تو بارگاہ احدیت میں عرض کی کہ خدایا اسے دوبارہ نابینا بنادے یہ بینا ہونے کے قابل ہی نہیں ہے اور اپنی مخلوق کے متعلق تو خود ہی بہتر جانتا ہے۔

اس موضوع کے بے شمار شواہد ہیں۔

۴۔ بنی نوع انسان کے حالات کا یہ اختلاف دراصل بندگان خدا کا امتحان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی کو معذور و مجبور بناکر اس کے صبر کا امتحان لیا ہے اور کسی کو صحت و دولت عطا کر کے اس کے شکر کا امتحان لیا ہے اور اس ذریعے سے وہ اپنے بندوں کو آزمارہا ہے کہ اس کی آزمائش پہ کون پورا اترتا ہے اور کون ناکام ہوتا ہے۔

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً اَتَصْبِرُوْنَ. (الفرقان ۲۵)

"اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیا تم صبر کروگے؟"

کیا معذور افراد کی تلافی کی جائے گی؟

اس حقیقت میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی معذور مخلوق کی باحسن وجوہ تلافی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم "جبّار" ہے جس کے معنی ہیں کہ جبران کرنے والا یعنی تلافی کرنے والا اور علم کلام میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ذات حق پر ازروئے لطف واجب ہے کہ وہ مصائب و آلام اور محرومیوں کا

اس طرح سے ازالہ کرے کہ بندہ راضی ہوجائے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ مصیبت و معذوری خدا کی طرف سے ہو بندہ کی اپنی پیدا کردہ نہ ہو۔

الکافی میں اس موضوع کی مناسبت سے ایک مکمل باب موجود ہے جس کا عنوان ہے "شدة ابتلاء المؤمن" مؤمن کی آزمائش کا شدید ہونا۔ اس باب میں ابن ابی یعفور کا بیان مرقوم ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں اپنے دردوں کی شدت کا تذکرہ کیا۔ (ابن ابی یعفور ہمیشہ مختلف قسم کے درد میں مبتلا رہتے تھے)۔ امام علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا: يَا عَبْدَاللهِ لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَالَهُ مِنَ الْاَجْرِ فِي الْمَصَائِبِ لَتَمَنّٰى اَنَّهُ قُرِضَ بِالْمَقَارِيْضِ. "اے عبداللہ! اگر مومن کو معلوم ہو جائے کہ مصائب کا اجر کیا ہے تو وہ تمنا کرنے لگے گا کہ اسے قینچی سے ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے۔" (الکافی ج ۳۔ ص ۲۵۴)

بحارالانوار کی گیارہویں جلد میں مرقوم ہے کہ ابوبصیر جو کہ مشہور راوی حدیث تھے پیدائشی نابینا تھے۔ ایک بار وہ امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: کیا آپؑ مردہ کو زندہ کرسکتے ہیں اور کیا آپؑ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح سے مبروص کو تندرستی دلا سکتے ہیں؟

امام علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! اللہ کے اذن سے ہم یہ کرسکتے ہیں۔

ابوبصیر کے اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ وہ بینا ہوجائیں۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: ابوبصیر! میرے قریب آؤ۔

ابوبصیر کہتے ہیں کہ میں اپنے آقا و مولا کے قریب ہوا تو امامؑ نے اپنا دستِ شفا میری آنکھوں پر پھیرا جس کے بعد میں سب کچھ دیکھنے لگ گیا۔

پھر امام علیہ السلام نے فرمایا: اَتُحِبُّ اَنْ تَكُوْنَ هٰكَذَا وَلَكَ مَا لِلنَّاسِ وَعَلَيْكَ مَا عَلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَوْ تَعُوْدَ كَمَا كُنْتَ وَلَكَ الْجَنَّةُ خَالِصًا. "اگر تمہیں یہ

حالت پسند ہو تو تم اسی حالت میں رہ جاؤ، تمہیں باقی لوگوں کی طرح سے حقوق و فرائض کا سامنا کرنا ہوگا اور اگر اپنی پہلی حالت پر واپس جانا چاہو تو تمہیں حساب کے بغیر جنت ملے گی۔"

میں نے کہا: "مولاؑ! میں نابینا ہونے کو حساب آخرت پر ترجیح دیتا ہوں۔"

پھر امامؑ نے دوبارہ میری آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو میں دوبارہ نابینا ہوگیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اندھے پن کی تکلیف کی تلافی اللہ نے اس طریقے پر فرمائی کہ اسے روز آخرت کے حساب سے محفوظ کردیا۔

بہت سی روایات میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ معذور افراد اور جن کی دعاؤں کا ثمر انہیں دنیا میں نہ ملا تھا ان سے فرمائے گا: "میں نے تمہیں آزمائش میں مبتلا کیا تھا اب میں تمہاری تمام آرزوئیں پوری کر کے اسکی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔"

اور جب لوگ ایسے لوگوں پر اللہ کی بے شمار نعمات کا نزول ملاحظہ کریں گے تو وہ یہ تمنا کریں گے کہ اے کاش دنیا میں ہماری کوئی حاجت پوری نہ ہوئی ہوتی تو ہم بھی یہ مقام حاصل کر لیتے۔

علاوہ ازیں جہاں تک سوال کے اس جز کا تعلق ہے کہ اگر کوئی معذور شخص کافر بھی ہو اور اس کی موت بھی حالت کفر پر واقع ہوئی ہو تو کیا اللہ تعالیٰ اس کی معذوری کی بھی تلافی کرے گا؟ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ آخرت کا نیک اجر مومنین و متقین کے لئے ہے کافروں کے لئے نہیں ہے اور ایسے افراد دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

ہم اپنے جواب کا اختتام قرآن مجید کی اس آیت پر کرتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ. (یونس ۴۴) "بے شک اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا لیکن لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔"

ساٹھ برس اور تیس برس کی عمر

سوال ۱۳

دو نیک شخص ہیں ایک کو خدا نے تیس برس کی عمر عطا کی اور دوسرے کو ساٹھ برس کی عمر عطا کی۔ جب تیس سال زندگی رکھنے والا شخص خدا کے حضور پیش ہوا تو اس نے کہا: تو نے میری عمر زیادہ کیوں نہیں کی تاکہ میں بھی اپنے بھائی کی طرح سے زیادہ عرصے تک تیری عبادت کرتا اور زیادہ درجات کا حقدار قرار پاتا؟

واضح کریں کہ اگر بالفرض ایسا سوال کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کیا جواب دے گا؟

جواب

اس سوال کے متعلق ہم تین جواب دیں گے:

۱۔ ہر چیز کے متعلق دو چیزوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ (۱) کمیت۔ (۲) کیفیت۔

کمیت کا مقصد یہ ہے کہ مثلاً ایک انسان ایک سال مسلسل نماز شب ادا کرتا ہے اور پنجگانہ نمازوں کی تعقیبات پڑھتا ہے اور روزانہ قرآن حکیم کی تلاوت سے بھی مشرف ہوتا ہے اور فضول خرچی سے پرہیز کرتا ہے اور اپنی فاضل دولت راہ خدا میں خرچ کرتا ہے۔

کیفیت کے متعلق یہ سمجھیں کہ مثلاً ایک شخص نماز مغرب و عشاء کو پورے اخلاصِ قلب اور آداب ظاہری کے ساتھ ادا کرتا ہے اور یوں اس کی نماز خشوع و ادب کا نمونہ بن جاتی ہے۔ پھر یہ شخص سو جاتا ہے اور پھر نماز فجر کو کامل اخلاص قلب اور خشوع و آداب کے ساتھ پڑھتا ہے۔ تو ایسی نماز کی اللہ کے ہاں بڑی قدر و قیمت ہے اور یہ نماز بے دلی سے ادا کی گئی تمام رات کی نمازوں سے کئی گنا بہتر ہے۔ تو ثابت ہوا کہ عمل کے اجر کے لئے صرف کمیت کو ہی مد نظر نہیں رکھا جاتا

بلکہ کیفیت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔

اسی لئے حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: صَلاَةُ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ فِيْ تَمَكُّنٍ خَيْرٌ مِنْ قِيَامِ لَيْلَةٍ. (بحار ج ۸۴۔ ص ۲۶۴) ”دو ہلکی پھلکی رکعت پر مشتمل نماز کو سکون سے پڑھنا پوری رات کے قیام سے بہتر ہے۔“

اس حدیث سے یہی مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں کمیت کی بجائے کیفیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم عرض کریں گے کہ ممکن ہے جس شخص کو اللہ نے تیس سال کی زندگی عطا فرمائی ہو اسے اخلاص عمل کی دولت سے مالامال کردیا ہو جو کہ ساٹھ سال رکھنے والے کو میسر نہ ہو اور یوں تیس سال رکھنے والا شخص ان مراتب و منازل کو حاصل کر لے جو کہ ساٹھ سال والے کو بھی حاصل نہ ہوئے ہوں۔ لہذا اسے یہ سوال کرنے کی نوبت ہی پیش نہیں آئے گی۔

۲۔ جس شخص کو اللہ نے تیس سال کی عمر میں موت دی ہے ممکن ہے کہ اس میں یہ حکمت کارفرما ہو کہ اگر یہ مزید عرصہ تک زندہ رہا تو اس کے حالات بدل جائیں گے اور وہ عمل خیر کو جاری نہ رکھ سکے گا بلکہ پہلے سے بجالائے ہوئے عمل بھی تباہ کر بیٹھے گا۔ اسی لئے اسے تیس برس میں موت دینا ہی بہترین فیصلہ ہے اور یوں جب وہ شخص اپنے اس فائدے کو دیکھے گا تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

۳۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ تیس سال میں مرنے والے کی عمر اللہ نے پہلے زیادہ مقرر کی ہو لیکن اس سے قطع رحمی سرزد ہوئی ہو جس کی وجہ سے اللہ نے اس کی عمر کو گھٹا کر اسے تیس سال میں بدل دیا ہو اور اسی طرح سے ساٹھ سال عمر پانے والے کے لئے بھی یہ احتمال موجود ہے کہ اللہ نے اس کی عمر کم رکھی ہو لیکن اس نے صلہ رحمی کی ہو جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر کو طویل کردیا ہو کیونکہ

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: اپنے مقررہ وقت پر مرنے والوں سے زیادہ تعداد گناہ کر کے مرنے والوں کی ہوتی ہے اور اپنی مقرر شدہ زندگی سے زیادہ تعداد نیکی کر کے زندہ رہنے والوں کی ہوتی ہے۔ (بحارالانوار ج ۷۳۔ ص ۳۵۴)

اور جب قیامت کے دن حقائق کھلیں گے تو اس قسم کے سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

شیطان جنت میں کیسے چلا گیا؟

سوال ۱۴

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جنت سے نکال دیا تھا لیکن اس کے بعد وہ جنت میں کیسے داخل ہوگیا اور حضرت آدمؑ کو کیسے پھسلایا؟

اور جنت میں اس کا جانا مسلّم ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ راندۂ درگاہ نہیں تھا، اگر وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا کیوں کرنے دیا اور جنت کے نگہبان غفلت میں کیوں پڑے رہے اور انہیں شیطان کی آمد کا پتہ تک کیوں نہ چلا؟ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ کو جس باغ میں ٹھہرایا تھا وہ جنت موعود کا باغ نہیں تھا بلکہ وہ زمین کا ایک باغ تھا۔ اسی لئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ شیطان جنت میں داخل ہوگیا تھا۔

چنانچہ کلینی، صدوق اور قمی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اِنَّ جَنَّةَ آدَمَ مِنْ جِنَانِ الدُّنْيَا تَطْلَعُ فِيْهِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَلَوْ

بلکہ کیفیت کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔

اسی لئے حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: صَلاَۃُ رَکْعَتَیْنِ خَفِیْفَتَیْنِ فِیْ تَمَکُّنٍ خَیْرٌ مِنْ قِیَامِ لَیْلَۃٍ. (بحار ج ۸۴۔ ص ۲۶۴) "دو ہلکی پھلکی رکعت پر مشتمل نماز کو سکون سے پڑھنا پوری رات کے قیام سے بہتر ہے۔"

اس حدیث سے یہی مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں کمیت کی بجائے کیفیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم عرض کریں گے کہ ممکن ہے جس شخص کو اللہ نے تیس سال کی زندگی عطا فرمائی ہو اسے اخلاص عمل کی دولت سے مالامال کردیا ہو جو کہ ساٹھ سال رکھنے والے کو میسر نہ ہو اور یوں تیس سال رکھنے والا شخص ان مراتب و منازل کو حاصل کر لے جو کہ ساٹھ سال والے کو بھی حاصل نہ ہوئے ہوں۔ لہذا اسے یہ سوال کرنے کی نوبت ہی پیش نہیں آئے گی۔

۲۔ جس شخص کو اللہ نے تیس سال کی عمر میں موت دی ہے ممکن ہے کہ اس میں یہ حکمت کارفرما ہو کہ اگر یہ مزید عرصہ تک زندہ رہا تو اس کے حالات بدل جائیں گے اور وہ عمل خیر کو جاری نہ رکھ سکے گا بلکہ پہلے سے بجالائے ہوئے عمل بھی تباہ کر بیٹھے گا۔ اسی لئے اسے تیس برس میں موت دینا ہی بہترین فیصلہ ہے اور یوں جب وہ شخص اپنے اس فائدے کو دیکھے گا تو وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔

۳۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ تیس سال میں مرنے والے کی عمر اللہ نے پہلے زیادہ مقرر کی ہو لیکن اس سے قطع رحمی سرزد ہوئی ہو جس کی وجہ سے اللہ نے اس کی عمر کو گھٹا کر اسے تیس سال میں بدل دیا ہو اور اسی طرح سے ساٹھ سال عمر پانے والے کے لئے بھی یہ احتمال موجود ہے کہ اللہ نے اس کی عمر کم رکھی ہو لیکن اس نے صلہ رحمی کی ہو جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر کو طویل کردیا ہو کیونکہ

امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: اپنے مقررہ وقت پر مرنے والوں سے زیادہ تعداد گناہ کر کے مرنے والوں کی ہوتی ہے اور اپنی مقرر شدہ زندگی سے زیادہ تعداد نیکی کر کے زندہ رہنے والوں کی ہوتی ہے۔ (بحارالانوار ج ۴۷۔ ص ۳۵۴)

اور جب قیامت کے دن حقائق کھلیں گے تو اس قسم کے سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

شیطان جنت میں کیسے چلا گیا؟

سوال ۱۴

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جنت سے نکال دیا تھا لیکن اس کے بعد وہ جنت میں کیسے داخل ہوگیا اور حضرت آدمؑ کو کیسے پھسلایا؟

اور جنت میں اس کا جانا مسلّم ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ راندۂ درگاہ نہیں تھا، اگر وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر گیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ایسا کیوں کرنے دیا اور جنت کے نگہبان غفلت میں کیوں پڑے رہے اور انہیں شیطان کی آمد کا پتہ تک کیوں نہ چلا؟ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ کو جس باغ میں ٹھہرایا تھا وہ جنت موعود کا باغ نہیں تھا بلکہ وہ زمین کا ایک باغ تھا۔ اسی لئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ شیطان جنت میں داخل ہوگیا تھا۔

چنانچہ کلینی، صدوق اور قمی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اِنَّ جَنَّۃَ آدَمَ مِنْ جِنَانِ الدُّنْیَا تَطْلَعُ فِیْہِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَلَوْ

كَانَتْ مِنْ جِنَانِ الْاٰخِرَةِ اَوِ الْخُلْدِ لَمَا اُخْرِجَ مِنْهَا. "آدم علیہ السلام جس جنت میں رہتے تھے وہ آخرت کی جنت نہیں تھی وہ اسی دنیا کا ایک باغ تھی جہاں سورج اور چاند چمکا کرتے تھے۔ اگر وہ آخرت والی جنت ہوتی یا ہمیشہ رہنے والی جنت ہوتی تو آدمؑ کو اس سے کبھی باہر نہ نکالا جاتا۔

اور جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے کہ ابلیس سانپ کی شکل میں جنت میں داخل ہوا تھا یا سانپ کے منہ میں مکھی کی صورت میں بیٹھ کر جنت میں داخل ہوا تھا تو ان روایات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس موضوع کی تمام تر روایات ضعیف ہیں اور قابل قبول نہیں ہیں۔

بعض علماء نے ان روایات کو کنایہ و اشارہ پر محمول کیا ہے۔ اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے تفسیر المیزان کی طرف رجوع کیا جائے۔

کیا شیطان صاحبِ اولاد ہے؟

سوال ۱۵

کیا شیطان وہی اصلی اور پرانا شیطان ہے اور کیا اس کی اولاد اور نسل بھی ہے اور اگر وہ صاحبِ اولاد ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس ملعون کو اللہ نے راندۂ درگاہ کردیا تھا اس کو صاحبِ اولاد ہونے کی اجازت کیوں دی؟

جواب

جی ہاں! شیطان وہی اصلی اور پرانا شیطان ہے اور یہ وہی ابلیس ہے جس نے آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا تھا اور اسکا اصل نام عزازیل ہے اور وہ تاقیامت زندہ رہے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ

الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ. (الحجر ۳۷-۳۸) "اللہ تعالیٰ نے کہا: تجھے وقت معلوم کے دن تک مہلت دی جارہی ہے۔"

شیطان صاحب اولاد ہے، اس کی ذریت بھی موجود ہے اور اس کے صاحب اولاد ہونے کی قرآن مجید گواہی دیتا ہے جیسا کہ ارشاد قدرت ہے: اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَآءَ ..... الخ. (الکھف ۵۰) "تو کیا تم اسے اور اس کی نسل کو سرپرست بناتے ہو؟"

دوسری آیت میں فرمان خداوندی ہے: ..... اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ..... (الاعراف ۲۷) "یقیناً وہ اور اس کا خاندان تمہیں دیکھتا ہے جب کہ تم انہیں نہیں دیکھ پاتے۔"

شیاطین و کفار کی پیدائش کے متعلق گزارش یہ ہے کہ جو چیز اپنے وقوع پذیر ہونے کی صلاحیت و استعداد رکھتی ہو تو خدا اسے خلعت وجود سے آراستہ کرتا ہے اور کفار و شیاطین سے جو شر ظاہر ہوتے ہیں تو وہ تمام تر شر ان کے غلط انتخاب کے نتیجے میں صادر ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں وہ خود قابل مذمت قرار پاتے ہیں، خالق قابل مذمت نہیں قرار پاتا۔

بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شیاطین و کفار کو پیدا کیا اور انہیں ایسے امور بجالانے کا حکم دیا جو کہ ان کی سعادت و خوش بختی کا سبب ہیں لیکن انہوں نے مخالفت کی اور اپنے آپ کو بھلائیوں سے محروم کر دیا اور برائیوں کا سرچشمہ بن گئے۔ لہٰذا اللہ کی طرف سے جو کچھ ظاہر ہوا وہ تمام تر خیر و بھلائی پر مبنی تھا اور جہاں تک مذمت کا تعلق ہے وہ ان کی اپنی پیدا کردہ ہے۔

اس مقام پر اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر تمام تر کافر نسل پیدا کرنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس نسل میں ہام بن ہیم کی طرح

سے کچھ صالح اور باایمان افراد بھی پیدا ہوئے۔ اگر اس پوری نسل میں ایک بھی مومن ہو تو بھی کافی ہے۔

کتاب کافی میں ہے کہ اگر پوری روئے زمین پر صرف ایک ہی مومن ہو تو بھی زمین کی غرض تخلیق کے لئے کافی ہے۔

اور شیاطین کے پیدا کرنے میں بھی بہت سی مصلحتیں موجود ہیں:

۱۔ شیاطین صالح اور غیر صالح کی تمیز کا ذریعہ ہیں۔ جیسا کہ رب العزت کا فرمان ہے: وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ اِلاَّ لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شَكٍّ (سبا ۲۱) "اور شیطان کو ان پر کوئی اختیار حاصل نہ تھا مگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں مبتلا ہے۔"

۲۔ شیاطین کی ترغیب مومنین کی سعادت کے اضافہ کی موجب ہے کیونکہ جو صاحبان ایمان شیاطین کی ترغیب کو پس پشت ڈال کر اطاعت الٰہی میں مصروف رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے درجات میں اضافہ کرتا ہے اور انہیں ملائکہ مقربین سے بھی بلند تر مقام عطا کرتا ہے۔

تقدیر و تدبیر کا دائرۂ کار

سوال ١٦

لوح محفوظ اور لوح محو اثبات اور تقدیر و تدبیر کا فرق بیان فرمائیں اور اسکے ضمن میں یہ بھی بیان کریں کہ دعا اور گریہ وزاری سے تقدیر بدل سکتی ہے یا نہیں؟

جواب

لوح محفوظ اور لوح محواثبات کے متعلق علمائے اعلام نے بہت کچھ لکھا ہے۔

اس موضوع کے متعلق حضرت علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اصول کافی کی شرح میں لکھا ہے کہ آیات و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو لوحیں پیدا کی ہیں اور ان میں آنے والے واقعات تحریر فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام لوح محفوظ ہے اور دوسری کا نام لوح محو اثبات ہے۔ لوح محواثبات میں تبدیلی اور ترمیم کی گنجائش موجود ہے جبکہ لوح محفوظ میں تبدیلی اور ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور لوح محفوظ کی تحریر خدا کے علم ازلی کے مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ لوح محواثبات میں ایسی چیزیں لکھتا ہے جن میں کسی حکیمانہ مصلحت کے تحت تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ لکھتا ہے کہ زید کی عمر پچاس برس ہوگی، بشرطیکہ اس نے کوئی ایسا فعل سرانجام نہیں دیا جو طولِ عمر یا عمر کی کمی کا موجب ہو۔ اس کے بعد اگر زید مثلاً صلہ رحمی کرتا ہے تو اللہ اس کی عمر ساٹھ سال لکھ دیتا ہے یا وہ قطع رحمی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عمر چالیس سال کر دیتا ہے۔

جبکہ لوح محفوظ میں معاملات کو مشروط انداز میں نہیں لکھا جاتا۔ مثلاً خدا کو پہلے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ زید، حسن کے ساتھ صلہ رحمی کرے گا جس کی وجہ سے اس کی عمر ساٹھ برس ہوگی تو وہ اسے اپنے علم ازلی کے تحت پہلے سے ہی ساٹھ سال لکھتا ہے۔ اور اس کے برعکس اللہ کو اپنے علم ازلی سے معلوم ہوتا ہے کہ زید، حسن سے قطع رحمی کرے گا اس کی عمر چالیس برس ہو جائے گی۔ اسی لئے وہ پہلے سے ہی لوح محفوظ میں اس کی عمر چالیس سال لکھ دیتا ہے۔

(لوح محواثبات کی تفصیل کے لئے مسئلہ بدا کی طرف رجوع فرمائیں جسے مسئلہ نمبر گیارہ میں بیان کیا گیا ہے)۔

اس وضاحت کے بعد اگر یہ سوال کیا جائے کہ حتمی تحریر تو وہی ہے جو لوح محفوظ میں لکھی گئی ہے تو پھر لوح محواثبات کا آخر فائدہ ہی کیا ہے؟

اس کے متعلق ہم یہ عرض کریں گے کہ لوح محو واثبات میں بھی بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں اور علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی کئی حکمتیں تحریر فرمائی ہیں :

۱۔ جب ملائکہ حکم خداوندی کے تحت اس لوح کی عبارت میں تبدیلی و ترمیم کرتے ہیں تو انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا علم ہوتا ہے۔

۲۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے انبیاءؑ و اوصیاء کو لوگوں کے متعلق خبر دیتا ہے کہ فلاں شخص کی عمر اتنی باقی تھی لیکن اس کے فلاں نیک عمل کی وجہ سے اس کی زندگی میں اتنے سالوں کا اضافہ کردیا گیا ہے تو اہل ایمان کو نیک اعمال بجالانے کی ترغیب ملتی ہے اور برائیوں سے بچنے کی ان میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔

لوح محو واثبات کی ترمیم و تبدیلی کے لئے صدقہ و دعا انتہائی موثر ہیں اور احادیث میں ان کی خصوصی تاکید کی گئی ہے اور ہم یہاں الکافی کی صرف ایک حدیث لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں :

عن الصادق علیه السلام: اِنَّ الدُّعَآءَ یَرُدُّ الْقَضَآءَ یَنْقُضُهُ کَمَا یُنْقَضُ السِّلْکُ وَقَدْ اُبْرِمَ اِبْرَامًا. (اصول کافی ج ۴۔ ص ۲۱۵)

”امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: دعا قضا کو ٹال دیتی ہے اور دعا سے قضا کی محکم گانٹھیں یوں کھل جاتی ہیں جیسا کہ رسی کی گرہیں کھول دی جاتی ہیں۔“

یعنی دعا حتمی قضا کو دور کردیتی ہے جیسا کہ قوم یونسؑ کے لئے عذاب کا فیصلہ ہوچکا تھا مگر دعا اور گریہ و زاری کی وجہ سے اللہ نے یقینی عذاب کو دور کردیا۔

بحث نبوت

کیا آبائے پیغمبرؐ موحد تھے؟

سوال ۱۷

زیارت امام حسین علیہ السلام میں ہم یہ الفاظ کہتے ہیں :

اَشْهَدُ اَنَّکَ کُنْتَ نُوْرًا فِی الْاَصْلَابِ الشَّامِخَةِ. ”میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بلند و برتر اور شریف اصلاب میں بصورت نور متمکن تھے۔“

اس جملے کی رو سے سوال یہ ہے کہ کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام آباء و اجداد موحد تھے اور کیا آبائے پیغمبر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے اور کیا وہ حضرت عیسیٰؑ کے دین پر ایمان لائے تھے؟

اگر بالفرض وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت پر ایمان لائے تھے تو اس قاعدے کی رو سے حضرت عبدالمطلب اور ان کے بزرگ عیسائی ہوں گے اور اگر حضرت پیغمبرؐ کے بزرگ حضرت ابراہیمؑ کی ملت پر کاربند تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کے دین کی پیروی کیوں نہیں کی تھی اور حضرت حمزہ سیدالشہداء کے متعلق تو کتابوں میں ہمیں یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ وہ اسلام لانے سے قبل مشرک تھے۔ تو کیا یہ بات صحیح ہے؟ آپ اس مسئلے کی تسلی بخش وضاحت فرمائیں۔

جواب

فرقہ امامیہ کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت آدمؑ تک آنحضرتؐ کے جملہ آباء و اجداد موحد تھے۔

علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے حیات القلوب کی جلد دوم کی تیسری فصل میں لکھا ہے کہ علمائے امامیہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جملہ آباء اور امہات حضرت عبداللہؓ سے لے کر حضرت آدمؑ تک اور حضرت آمنہؓ سے لے کر حضرت حواؑ تک سب کے سب موحد اور مومن تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کا نور کسی مشرک کے صلب اور کسی مشرکہ کے رحم میں نہیں رہا اور آنحضرتؐ کے تمام تر بزرگ نکاح سے پیدا ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی بدکاری کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

عامہ و خاصہ سے منقول روایات متواترہ اسی مضمون پر نہ صرف دلالت کرتی ہیں بلکہ احادیث متواترہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے تمام بزرگ انبیاءؑ و اوصیاء تھے اور وہ سب کے سب دین خداوندی کے حامل تھے۔

آنحضرتؐ سے لے کر حضرت اسماعیلؑ تک آپ کے جتنے بھی آباء و اجداد تھے وہ سب کے سب حضرت ابراہیمؑ کے وصی تھے اور مکہ کی بادشاہی اور تولیت حرم ہمیشہ انہی کے پاس رہی تھی اور وہ ہمیشہ اپنے دور میں مرجع خلق تھے اور وہ ملت ابراہیمؑ کے پیروکار تھے اور حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی شریعت اور حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اولاد اسماعیل میں منسوخ نہیں ہوئی تھی اور وہ اس شریعت کے نگہبان تھے اور ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے تھے اور انبیاءؑ کے تبرکات و آثار کے امین تھے اور وہ ان تبرکات کو ایک دوسرے کے سپرد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تبرکات انبیاء حضرت عبدالمطلبؑ کو منتقل ہوئے اور عبدالمطلبؑ نے حضرت ابوطالبؑ کو اپنا

وصی مقرر کیا اور انبیائے سابقین کے تبرکات و آثار ان کے حوالے کئے اور جب حضرت محمد مصطفیٰؐ مبعوث بہ نبوت ہوئے تو حضرت ابوطالبؑ نے وہ تبرکات آپؐ کے حوالے کئے تھے۔

کتاب مذکورہ کے تیرہویں باب میں علامہ مجلسی رقم طراز ہیں: حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی وصایت کا سلسلہ حضرت عبدالمطلبؑ پر منتہی ہوا پھر یہ سلسلہ حضرت ابوطالبؑ کے ذریعے سے حضرت محمد مصطفیٰؐ تک پہنچا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اوصیائے ابراہیمؑ کی دو شاخیں تھیں۔ ایک شاخ اولاد اسحاقؑ کی تھی جس میں انبیائے بنی اسرائیل شامل تھے اور دوسری شاخ اولاد اسماعیلؑ پر مشتمل تھی جن میں آنحضرتؐ کے آبائے کرام شامل تھے اور وہ سب کے سب ملت ابراہیمؑ کے پیروکار تھے اور اسی شریعت کے نگہبان تھے اور وہ انبیائے بنی اسرائیل کی امت نہیں تھے۔ (کیونکہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام دونوں صرف بنی اسرائیل کے نبی تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو اپنی شریعت کی دعوت ہی نہیں دی تھی)۔

علامہ مجلسی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبدالمطلبؑ اور حضرت ابوطالبؑ، حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی شریعتوں کے مکلف نہیں تھے۔ دونوں بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصیاء تھے اور حجت پروردگار تھے۔

علامہ مجلسی نے بحارالانوار کی جلد ۳۵ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: یَبْعَثُ اللّٰهُ عَبْدَالْمُطَّلِبِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَ عَلَیْهِ سِیْمَاءُ الْاَنْبِیَاءِ وَ بَهَاءُ الْمُلُوْكِ۔ "اللہ تعالیٰ عبدالمطلبؑ کو قیامت کے دن انبیاءؑ کے چہرے اور شاہانہ شوکت کے ساتھ مبعوث کرے گا۔"

شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ اپنے اعتقادیہ میں رقم طراز ہیں:

وَقَدْرُوِیَ اَنَّ عَبْدَالْمُطَّلِبِ کَانَ حُجَّةً وَاَبَاطَالِبِ کَانَ وَصِیَّهُ. (اعتقادات صدوق ص ۸۵۔ باب ۴۰)

روایت کی گئی ہے کہ عبدالمطلبؑ حجت تھے اور ابو طالبؑ ان کے وصی تھے۔

طبرسیؒ نے کتاب اعلام الوریٰ میں حضرت حمزہ کے قبول اسلام کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ان کی فضیلت میں وارد احادیث کو نقل کیا اور اسلام اور رسول اسلام کے لئے ان کی جانثاری کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔[۱]

معجزاتِ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سوال ۱۸

سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات کی تلاوت فرمائیں:

وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهَارَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا. (بنی اسرائیل ۹۰ تا ۹۳)

۱۔ واضح رہے کہ جب علمائے امامیہ آبائے پیغمبر اکرمؐ کے موحد ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا مقصود صرف حضور اکرمؐ کے خالص باپ دادا ہوتے ہیں۔ ان کا مقصود دیگر خاندان نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم حضرت عبداللہؓ کو موحد اور مومن مانتے ہیں لیکن ابولہب کو موحد تسلیم نہیں کرتے۔ ہم صرف ان اصلاب و ارحام کو مومن و موحد مانتے ہیں جہاں آنحضرتؐ کا نور مرتکز رہا تھا۔ ان کے علاوہ ان کے تمام رشتہ داروں کے مومن و موحد ہونے کا ہم عقیدہ نہیں رکھتے۔ اسی لئے اگر حضرت حمزہؓ کے مشرک ہونے کی روایات صحیح بھی ہوں تو بھی ہمارے موقف پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ (من المترجم عفی عنہ)

"اور ان لوگوں نے کہا کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری نہ کردو، یا تمہارے پاس کھجور اور انگور کے باغ ہوں جن کے درمیان تم نہریں جاری کردو، یا ہمارے اوپر اپنے خیال کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرادو، یا اللہ اور ملائکہ کو ہمارے سامنے لاکر کھڑا کردو، یا تمہارے پاس سونے کا کوئی مکان ہو، یا تم آسمان کی بلندی پر چڑھ جاؤ اور اس بلندی پر بھی ہم ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب نازل نہ کردو جسے ہم پڑھ لیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہمارا پروردگار بڑا بے نیاز ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

معجزہ کے منکرین درج بالا آیات پیش کر کے استدلال کرتے ہیں کہ اہل مکہ نے آنحضرتؐ سے درج بالا معجزات طلب کئے تھے اور آنحضرتؐ نے ان معجزات کے اظہار سے اپنی عاجزی کا اظہار کیا تھا۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے سرے سے کوئی مادی معجزہ پیش ہی نہیں کیا تھا۔

آپ سے درخواست ہے کہ آیات بالا کا شان نزول اور معجزہ کے اظہار کے متعلق تسلی بخش جواب دیں۔

جواب

جو شخص خدا کی طرف سے نبوت و رسالت کا دعویدار ہو تو اس کے لئے عقلاً واجب ہے کہ وہ اپنی صداقت کے لئے معجزہ پیش کرے۔ یعنی وہ اپنے دعویٰ کی صداقت کو خارق عادت امر سے ثابت کرے۔

اگر نبوت و رسالت کا دعویدار جھوٹا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر نہیں کرے گا اور اگر سچا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی صداقت کے اظہار کے لئے معجزہ ظاہر کرے گا۔ کسی نبی کی نبوت کے اثبات کے لئے معجزہ ہی کافی ہے لیکن یہ

ضروری نہیں کہ نبی ہر شخص کی اناپ شناپ فرمائش پر معجزے دکھانا شروع کردے کیونکہ اگر نبی ایسا کرنے لگ جائے تو عالمِ تکوین درہم برہم ہوجائے اور انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق کے لئے روانہ کیا ہے عالم تکوین کو تباہ و برباد کرنے یا جغرافیائی حدود بدلنے کے لئے مبعوث نہیں کیا۔

آیات بالا کے متعلق عرض یہ ہے کہ جن لوگوں نے آنحضرتؐ سے طرفہ معجزات طلب کئے تھے وہ دراصل ایمان لانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف اپنے مادی فوائد کے حصول کے خواہش مند تھے اور مقام نبوت کا مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ علاوہ ازیں معجزہ کے متعلق یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ معجزہ اس خارق امر کو کہا جاتا ہے جو عادتاً محال ہو۔ معجزہ وہ نہیں ہوتا جو عقلاً محال ہو۔ اس تمہید کے بعد ہم اصل سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۱۔ کفار مکہ کے ان مطالبات کو خدا و رسولؐ نے کوئی اہمیت اس لئے نہیں دی تھی کیونکہ مذکورہ معجزات کا مطالبہ کرنے والے افراد وہ تھے جو ہمیشہ آنحضرتؐ کو اذیت دیا کرتے تھے اور اس مطالبہ سے پہلے بھی وہ آپؐ کی نبوت کے دسیوں معجزات دیکھ چکے تھے مگر ہر معجزہ ان کے مزید انکار و سرکشی کا موجب ثابت ہوا تھا۔

اگر مذکورہ افراد ایمان لانے کے خواہش مند ہوتے تو ان کے لئے صداقتِ محمدؐ کا ایک معجزہ قرآن مجید ہی کافی تھا۔ مگر قرآن جیسے معجزے کو دیکھ کر بھی وہ ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں وہ شق القمر جیسا عظیم معجزہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے مگر انہوں نے شق القمر کا معجزہ دیکھ کر کہا تھا کہ یہ "سحر مستمر" ہے یعنی محمدؐ سے اس طرح کے عجائبات کا تو ہمیشہ ظہور ہوا ہی کرتا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

مذکورہ معجزات طلب کرنے والے افراد ہرگز ایمان لانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف بہانے بازی اور مقام نبوت کے استہزا کے لئے ایسے بے سروپا امور کا مطالبہ کرتے آئے تھے۔ اسی لئے ان کے مطالبات کو اللہ نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

۲۔ ان کے طرفہ مطالبات میں کچھ امور ایسے بھی تھے جو کہ عقلاً محال تھے کیونکہ انہوں نے اپنے مطالبات کے ضمن میں یہ کہا تھا کہ تم خدا اور ملائکہ کو ہمارے سامنے لے آؤ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ کو دیکھنا عقلاً محال ہے کیونکہ اللہ جسم و جسمانیات سے پاک ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مطالبات کے ضمن میں وضع تکوینی کو زیروزبر کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان لوگوں نے کہا تھا: مکہ کے پہاڑوں کو ہٹا کر ہموار میدان بنادو، پھر زمین سے چشمہ جاری کرو اور تمہارے باغات ہونے چاہئیں جن کے پھلوں کو ہم جی بھر کر کھائیں۔ پھر ہم ایمان لائیں گے۔

دراصل یہ مطالبہ انتہائی عامیانہ قسم کا تھا (کیونکہ دنیا میں لاکھوں انسانوں کے پاس باغات موجود ہیں تو کیا باغات کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ نبی بن گئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ باغ کی ملکیت اور منصب نبوت کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ مترجم) انہوں نے یہ مطالبہ محض دشمنی اور جھگڑے کے لئے کیا تھا۔

۴۔ ان کے مطالبہ کو اہمیت نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عقل و خرد سے عاری ان افرلو نے مطالبہ ہی ایسا کیا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے پورا کردیتا تو قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا ہو جاتی کیونکہ ان کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہم آپ پر اس وقت ایمان لائیں گے جب آپ آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر گرائیں گے۔ اب ذرا چشم تصور سے نگاہ کریں اور سوچیں اگر ایسا ہو جاتا تو کیا زمین و آسمان تباہ نہ ہو جاتے؟ اسی لئے ان کی احمقانہ اور بچگانہ سوچ کو اللہ نے کوئی اہمیت

نہیں دی تھی۔

۵۔ ان لوگوں نے رسول خداؐ سے مطالبہ ہی غلط کیا تھا۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ ہمارے ایمان کی شرط یہ ہے کہ تمہارا گھر سونے کا ہونا چاہئے، یا اس سے زیادہ سادہ الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ تمہارا گھر سونے سے بھرا ہوا ہو تو ہم آپ کو رسول ماننے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

اور یہ سوال یقیناً ناقابل اعتنا ہے کیونکہ اس وقت قیصر و کسریٰ کے پاس سونے کے کئی گھر بھرے ہوئے تھے اور اگر وہ چاہتے تو سونے کے کئی مکان تعمیر کرسکتے تھے چنانچہ سونے کا مکان کسی شخص کی ثروت و امارت کی دلیل تو بن سکتا ہے لیکن نبوت کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا۔ اگر نبوت کے لئے یہی معیار بنالیا جائے تو انبیاءؑ کی اکثریت جن کا تعلق غریب طبقہ سے تھا، ان سب کی نبوت کا انکار لازم آئے گا اور ہر دولتمند کو نبی ماننا پڑے گا اور اس معیار کی موجودگی میں قارون تو نبی بن سکتا ہے، حضرت موسیٰؑ کی نبوت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

۶۔ ان لوگوں کے مطالبے کی غیر معقولیت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ انہوں نے آنحضرتؐ سے مطالبہ کرتے ہوئے کہا: اگر آپؐ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لائیں تو آپؐ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں اور آپ کا صرف آسمان پر چڑھنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ جب آپؐ واپس آئیں تو آپؐ کے ہاتھ میں لکھی ہوئی کتاب ہونی چاہئے جسے ہم پڑھ سکیں۔

اس مطالبے کو دیکھ کر ہر صاحب عقل یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذکورہ مطالبہ کوئی احمق ہی کرسکتا ہے۔ ہوش و حواس رکھنے والا کوئی بھی شخص اس قسم کے طرفہ معجزہ کا کبھی مطالبہ نہیں کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام مطالبات کو بڑی حقارت کے

ساتھ یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ حبیب آپؐ کہہ دیں کہ میرا پروردگار پاک و پاکیزہ ہے میں تو صرف ایک بشر ہوں جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

۷۔ ان لوگوں کے مطالبہ کو رد کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ پروردگار عالم کا یہ پرانا اصول رہا ہے کہ جس قوم کو ان کا مطلوبہ معجزہ دیا گیا ہو اور پھر اس قوم نے اس معجزہ کی قدر دانی نہیں کی ہو تو اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوجاتا ہے جیسا کہ قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے درخواست کی تھی کہ ہم آپ کو تب نبی مانیں گے جب آپ اس پہاڑ سے ایک ناقہ کو برآمد کریں اور وہ ناقہ ہمارے سامنے بچہ جنے اور اتنا دودھ دے کہ جو ہماری پوری قوم کے لئے کافی ہو۔

حضرت صالح نے اللہ تعالیٰ سے مذکورہ معجزہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ سے اونٹنی برآمد کی جس نے لوگوں کے سامنے بچہ دیا اور اس کے دودھ سے پوری قوم سیراب ہونے لگی تو شر پسند افراد نے اس اونٹنی کو ذبح کردیا جس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا عذاب آیا اور پوری قوم صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔

اب اگر رسول خداؐ ان لوگوں کی فرمائش کو مدنظر رکھ کر ان کے تمام مطالبات بھی پورے کردیتے اور پھر کفار مکہ ایمان نہ لاتے تو اس کا منطقی نتیجہ عذاب الٰہی کی صورت میں نمودار ہوتا جبکہ اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو دو وجوہات کی بناپر عذاب دینا نہیں چاہتا تھا۔

۱۔ ان میں سے اکثر لوگوں کو ایمان کی سعادت نصیب ہونی تھی۔

۲۔ ان کی نسل میں سے اہل ایمان نے ابھی پیدا ہونا تھا۔ اسی لئے کفار مکہ کے مذکورہ مطالبات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی شان رحیمی کی وجہ سے رد کردیا کہ کہیں یہ لوگ ان معجزات کی وجہ سے عذاب ظاہری کے مستحق نہ بن جائیں۔

لوگوں کے حسب منشا معجزات نہ دکھانے کی یہی وجہ بیان کرتے ہوئے اللہ

تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُرْسِلَ بِالْاٰيَاتِ اِلاَّ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ وَ اٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيَاتِ اِلاَّ تَخْوِيْفًا. (بنی اسرائیل ۵۹)

"اور ہمارے لئے منہ مانگی نشانیاں بھیجنے سے یہ بات مانع ہے کہ پہلے والوں نے تکذیب کی ہے اور ہلاک ہوگئے ہیں اور ہم نے قوم ثمود کو ان کی خواہش کے مطابق اونٹنی دیدی جو ہماری قدرت کو روشن کرنے والی تھی لیکن ان لوگوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو نشانیوں کو صرف ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں۔

اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ بھی ممکن ہے کہ ہم منہ مانگی نشانی اس لئے ظاہر نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہمیں علم ہے کہ یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور یوں ہمارے معجزات بے مقصد و بے فائدہ قرار پائیں گے۔

منکرینِ معجزات کی غلط فہمی

امت اسلامیہ کے نام نہاد روشن فکر افراد کی غلط فہمی ہے کہ انبیاءؑ صاحب معجزہ نہ تھے جبکہ پورا قرآن انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات سے بھرا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ. (الحدید ۲۵) "بے شک ہم نے اپنے انبیاءؑ کو معجزات کے ساتھ روانہ کیا۔"

قرآن مجید نے کھول کھول کر انبیائے کرامؑ کے معجزات کا تذکرہ کیا ہے اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزات کی نفی ہرگز نہیں کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے باقی انبیاءؑ کی بہ نسبت حبیب خداؐ کو زیادہ معجزات سے نوازا ہے۔

معجزاتِ مصطفیٰؐ کی ہلکی سی جھلک

حبیب خداؐ کا سب سے بڑا اور ابدی معجزہ قرآن مجید ہے جو رہتی دنیا تک

صداقت محمدؐ کی سب سے بڑی دلیل ہے اور جس کا چیلنج صدیوں سے لے کر آج تک قائم ہے کہ کائنات کے تمام انسان اور جنات مل کر بھی اس جیسا کلام نہیں بنا سکتے۔

قرآن مجید کے بعد اللہ تعالیٰ نے حبیب خداؐ کے بہت سے معجزات کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں سے ہم "مشتے از خروارے" کے تحت چند معجزات یہاں نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ معجزۂ معراج

معجزۂ معراج آنحضرتؐ کا عظیم الشان معجزہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت میں ارشاد فرمایا ہے: سبحان الذی اسریٰ بعبدہ ....الخ. "پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ (تجوو کے آخری نقطے) تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں۔ بے شک وہ پروردگار سب کی سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔"

علاوہ ازیں واقعہ معراج کا کچھ مزید تذکرہ سورۂ والنجم کی آیت میں بھی کیا گیا: علمه شديد القوىٰ .... ربه الكبرىٰ. (النجم ۵ تا ۱۸) "اسے نہایت طاقت والے نے تعلیم دی ہے۔ وہ صاحب حُسن و جمال جو سیدھا کھڑا ہوا جبکہ وہ بلند ترین افق پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ دو کمان یا اس سے کم کا فاصلہ رہ گیا۔ پھر خدا نے اپنے بندے کی طرف جو راز کی بات چاہی وحی کردی۔ دل نے اس بات کو جھٹلایا نہیں جس کو آنکھوں نے دیکھا۔ کیا تم اس سے اس بات کے بارے میں جھگڑا کر رہے ہو جو وہ دیکھ رہا ہے اور اس نے تو اسے ایک بار اور بھی دیکھا ہے، سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک، جس کے پاس جنت الماویٰ بھی ہے۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھ نہ بہکی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔

اس نے اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھی ہیں۔"

۳۔ معجزۂ شق القمر

مشرکین مکہ نے آنحضرتؐ سے اس آسمانی علامت کا مطالبہ کیا تھا اور کہا تھا کہ آسمان پر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔ اگر آپؐ نے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے تو ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ آنحضرتؐ نے اپنی انگشت مبارک اٹھائی تو چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ پھر آپؐ نے دوبارہ اشارہ کیا تو دونوں کٹے ہوئے ٹکڑے ایک دوسرے سے مل گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قمر میں اس معجزہ کا تذکرہ ان الفاظ سے کیا: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ. "قیامت قریب آگئی اور چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ یہ کوئی بھی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک مسلسل جادو ہے۔"

۴۔ مشت خاک کا پھینکنا

آنحضرتؐ نے ریت کی مٹھی لشکر کفار کی طرف پھینکی جسے اللہ نے تمام کفار کی آنکھوں اور ناک تک پہنچایا اور وہی مشت خاک ان کی شکست کا موجب ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى. (الانفال ۱۷) "پیغمبر (مشت خاک کو) آپ نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا ہے۔"

۵۔ غزوۂ احزاب میں آندھی آنا

غزوۂ احزاب میں جبکہ عرب کے تمام قبائل نے مل کر مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا تو اللہ تعالیٰ نے سخت تیز اور سرد ہوا چلائی جس کی وجہ سے ان کے خیمے اکھڑ گئے، ان کی جلائی ہوئی آگ بجھ گئی اور اتنی سردی پھیل گئی کہ لشکر کفار کے لئے وہاں مزید ٹھہرنا ممکن نہ رہا جس کی وجہ سے انہیں محاصرہ اٹھانا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا. (الاحزاب ۹) "ایمان والو! اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب کفار کے لشکر تمہارے سامنے آگئے اور ہم نے ان کی خلاف تمہاری مدد کے لئے تیز ہوا اور ایسے لشکر بھیج دیئے جن کو تم نے دیکھا بھی نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔"

۶۔ غزوۂ حنین میں نزول سکینہ

جنگ حنین کی ابتداء میں جب لشکر اسلام شکست کھا چکا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کی نصرت کے لئے ملائکہ کو نازل فرمایا اور مومنین کے دلوں میں تسکین نازل فرمائی جس کے بعد جنگ کا پانسہ مسلمانوں کے حق میں پلٹ گیا: لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّ يَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ. (التوبہ ۲۵-۲۶) "بے شک اللہ نے کثیر مقامات پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا لیکن اس (کثرت) نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور تمہارے لئے زمین اپنی وسعتوں سمیت تنگ ہوگئی اور اس کے بعد تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اس کے بعد خدا نے اپنے رسولؐ اور صاحبان ایمان پر سکون نازل کیا اور وہ لشکر بھیجے جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کفر اختیار کرنے والوں پر عذاب نازل کیا کہ یہی کافرین کی جزا اور ان کا انجام ہے۔"

۷۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی پیش گوئیاں فرمائیں جنہیں حبیب خداؐ نے وقتاً فوقتاً بیان کیا اور آپؐ کی بیان کردہ پیش گوئیاں حرف بحرف سچی ثابت ہوئیں۔ چنانچہ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ..... (والقمر ۴۵) "عنقریب یہ

جماعت شکست کھا جائے گی اور سب پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔" کفار کو اپنی طاقت پر بڑا غرور تھا اور بات بات پر رسول اکرمؐ کا مذاق اڑایا کرتے تھے لیکن انہیں پہلے ہی مقابلے میں طاقت کا حال معلوم ہوگیا جب وہ بدر کے معرکے میں نہتے مسلمانوں سے شکست کھا کر میدان سے فرار کر گئے اور ذلت ان کا مقدر بن گئی۔

علاوہ ازیں سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے خیبر اور دیگر فتوحات کا وعدہ کیا جو کہ حرف بحرف پورا ہوا: وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً (الفتح ۲۰) "اللہ تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کر چکا ہے۔"

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ کوثر میں حبیب خداؐ کی نسل کو جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا اور آپؐ کے دشمن کو بے نام و نشان رہنے کی وعید سنائی اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی پورا ہوا۔

مرحوم فخرالاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب بیان الحق کی پہلی جلد میں قرآن مجید کی تیس پیش گوئیاں بیان کیں اور حبیب خداؐ کی احادیث مبارکہ میں سے بیس پیش گوئیاں بیان کی ہیں جو کہ حرف بحرف پوری ہوئیں۔ (طالبان تحقیق اس کتاب کی طرف رجوع فرمائیں)۔

علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی آیات کو حیات القلوب میں جمع کیا ہے۔ نیز "انیس الاعلام" کی جلد دوم میں انجیل سے آٹھ موارد نقل کئے گئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے معجزات کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن آپؑ نے اعتنا نہ فرمایا۔ جیسا کہ انجیل مرقس کے باب ۸ آیت ۱۱۔ ۱۲ میں مرقوم ہے: "پھر فریسی نکل کر اس سے بحث کرنے لگے اور اسے آزمانے کے لئے اس سے کوئی آسمانی نشانی طلب کی۔ اس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا اس زمانے کے لوگ کیوں نشان طلب کرتے ہیں؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان نہ دیا جائے گا۔"

عصمتِ انبیاء علیہم السلام

سوال ۱۹

لفظ ذنب، اثم، عصیان اور ترکِ اولیٰ میں کیا فرق ہے جبکہ قرآن مجید میں انبیائے کرام علیہم السلام کے بعض گناہوں کا واضح ذکر موجود ہے۔ ہم آخر انہیں ترکِ اولیٰ سے کیوں تعبیر کرتے ہیں اور ان آیات کی موجودگی میں انبیائے کرامؑ کی عصمت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟

جواب

ذنب، اثم اور عصیان اگرچہ تین مختلف لفظ ہیں لیکن سب کا مفہوم ایک ہے اور مذکورہ الفاظ کسی امر یا نہی کی مخالفت کو ظاہر کرتے ہیں اور امر و نہی کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ لازمی امر یا نہی لازمی

یعنی ایسا "امر" جو کسی چیز کے وجوب کو ثابت کرے یا ایسی "نہی" جو کسی فعل کی حرمت کو ظاہر کرے ایسے امر کو امر الزامی اور ایسی نہی کو نہی الزامی کہا جاتا ہے اور ہر امر اپنے اندر دو چیزوں کا متضمن ہوتا ہے مذکورہ فعل کے بجالانے کا اور اس کی مخالفت کو ترک کرنے کا متقاضی ہوتا ہے اور اسی طرح سے ہر نہی بھی دو امور کی متقاضی ہوتی ہے۔ مذکورہ فعل کی حرمت اور اس کے متضاد کے بجالانے کی موجب ہوتی ہے۔ مثلاً "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" نماز قائم کرو۔ یہ امر ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز پڑھنا واجب اور نماز کا نہ پڑھنا حرام ہے۔ اس کے مقابلے میں "ولا تقربوا الزنا" ہے کہ زنا کے قریب نہ جاؤ۔ یہ نہی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زنا کرنا حرام اور ترک زنا واجب ہے۔

۲۔ امر غیر الزامی اور نہی غیر الزامی

امر اور نہی کی دوسری قسم غیر لازمی ہوتی ہے۔ یعنی اس پر عمل کرنا بہتر اور اس کے تقاضوں کے خلاف عمل کرنے پر کوئی تہدید اور سزا نہیں ہوتی۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے: فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ ..... (سورۂ جمعہ) "پس جب نماز جمعہ مکمل ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ۔"

اگر کوئی شخص نماز جمعہ کے بعد بھی مسجد میں بیٹھ کر تعقیبات میں مصروف رہے تو اس کا مسجد میں بیٹھنا حرام نہیں ہوگا۔ ایسے غیر لازمی امر کو استحباب اور ایسی نہی کو نہی کراہت کہا جاتا ہے اور اس طرح کے امر و نہی کی مخالفت کو گناہ کہنے کی بجائے ترکِ اولیٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی اس امر یا نہی کو بجالانا چاہئے تھا اور اس امر کی ادائیگی بہتر تھی مگر اس بہتر طرز عمل کو چھوڑا گیا۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ معصومؑ ہیں انہوں نے کبھی امر الزامی اور نہی الزامی کی خلاف ورزی نہیں کی۔ البتہ ان سے امر استحبابی اور نہی تنزیہی کی بعض موارد میں خلاف ورزی ضرور ہوئی ہے اور یہ چیز عصمت کے منافی نہیں ہے کیونکہ عصمت کے لئے ضروری ہے کہ واجب ترک نہ ہوا ہو اور حرام پر عمل نہ ہوا ہو اور انبیائے کرامؑ اس سے محفوظ و مامون تھے۔

اس کے برعکس مستحب کو چھوڑنا اور مکروہ کو بجالانا عصمت کے منافی نہیں ہے اور دلائل عقلیہ و قطعیہ سے انبیاءؑ کی عصمت ثابت ہے۔ لہذا اگر ان کے لئے قرآن مجید میں ذنب یا عصیان کے الفاظ بھی موجود ہوں تو بھی ان کو قسم دوم میں تصور کیا جائے گا (اور اسے ترک اولیٰ سے تعبیر کیا جائے گا۔)

علامہ حلی رحمۃ اللہ علیہ نے محقق طوسی علیہ الرحمہ کے کلام کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے: "عصمت" ایک پوشیدہ امر ہے جسے حواس خمسہ سے محسوس نہیں کیا

جاسکتا اور عصمت اس ملکہء نفسانیہ اور قوت قدسیہ ربانیہ کو کہا جاتا ہے جس کے حامل سے معصیتِ پروردگار کا ارتکاب محال ہوتا ہے۔

عصمت کا اثبات دو طرح سے ممکن ہے:

۱۔ جس نبی یا امام کی نبوت و امامت ثابت ہو تو اس کے منصب نبوت و امامت کے ثبوت کے ساتھ ہی اس کی عصمت بھی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ نبوت و امامت کے لئے عصمت شرط ہے۔

۲۔ پروردگار عالم کسی کی نبوت و امامت کے اثبات کے لئے اسے معجزہ عطا فرمادے تو بھی صاحب معجزہ کی عصمت ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ معجزہ بذات خود نبوت و امامت کا ثبوت ہے اور نبوت کا منصب عصمت کا متقاضی ہے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جن عظیم القدر شخصیات کی نبوت کا اعلان کیا ہے تو ان کے اعلان نبوت کے ساتھ ہی ان کی عصمت ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ عصمت لازمہ نبوت ہے اور اگر ان بزرگوار شخصیات کے متعلق قرآن حکیم میں کہیں ذنب یا عصیان جیسے الفاظ آجائیں تو اس سے وہی قسم ثانی مراد ہوگی یعنی ان سے امر استحبابی ترک ہوا ہے یا نہی تنزیہی کے مرتکب ہوئے ہیں اور اسے ترک اولیٰ کہا جاتا ہے۔

مشاہداتِ معراج کی حقیقت

سوال ۲۰

کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معراج جسمانی کا عقیدہ ضروریاتِ مذہب میں سے ہے؟ اور اس کے ضمن میں یہ واضح کریں کہ پیغمبر اکرمؐ نے شب معراج بہت سے افراد کو عذاب میں مبتلا دیکھا جبکہ نہ تو ابھی قیامت قائم

ہوئی ہے اور نہ ہی حساب کتاب کا مرحلہ طے ہوا ہے۔ لہذا آنحضرتؐ کے مذکورہ مشاہدات کی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب

جی ہاں! پیغمبر اکرمؐ کے معراج جسمانی کا عقیدہ ضروریات مذہب میں سے ہے کیونکہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے: سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیَاتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ. "پاک وپاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں۔ بے شک وہ پروردگار سب کی سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔"

سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت کے علاوہ سورۂ نجم میں بھی واقعہ معراج کا تذکرہ موجود ہے اور شب معراج جو امور آنحضرتؐ نے مشاہدہ فرمائے وہ دراصل قیامت میں واقع ہونے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کو تمثیلی انداز میں جزا وسزا کے مناظر دکھائے تھے۔

معجزۂ شق القمر

سوال ۲۱

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. (والقمر ۱) "قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔"

اس آیت کے متعلق مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

ایک اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے اور پھر آپؐ کے دوسرے اشارے سے دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے پیوستہ ہوگئے تھے۔ کیا عقل سلیم اس بات کو قبول کرسکتی ہے؟

علاوہ ازیں ہم نے بعض لوگوں کی زبانی یہ بھی سن رکھا ہے کہ چاند کا ایک حصہ آنحضرتؐ کی ایک بغل اور دوسرا حصہ آپؐ کی دوسری بغل سے گزرا تھا۔

یہ جملہ تو یقیناً محالات عقلی میں سے ہے اور اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کہے کہ پوری کائنات ایک مرغی کے انڈے میں بند ہوگئی۔ آیا یہ آخری جملہ بھی کتب معتبرہ میں کہیں پایا جاتا ہے اور اگر یہ جملہ موجود ہے تو پھر اس شبہ کا جواب کیا ہے؟

جواب

شق القمر کا معجزہ مسلّم ہے اور اس کے متعلق روایات میں اتنا ہی وارد ہوا کہ آنحضرتؐ نے اپنی انگشت مبارک سے اشارہ کیا تو چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے اور کچھ دیر تک دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے علیحدہ رہے۔ پھر آپؐ نے دوبارہ اشارہ کیا تو دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے مل گئے اور چاند اپنی پہلی حالت پر پلٹ آیا۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کی طرف اشارہ موجود ہے اور متواتر روایات میں اتنا ہی بیان ہوا ہے اور بطلیموسی نظریات کے تحت یہ عقیدہ رکھنا کہ اجسام فلکیہ میں خرق والتیام ممکن نہیں ہے، یقیناً یہ ایک فرسودہ نظریہ ہے جو کہ جدید دور میں غلط ثابت ہوچکا ہے۔ چاند بھی زمین کی طرح سے ایک کرہ ہے اور وہ قابل خرق والتیام ہے اور اس لئے زمین اور چاند میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اور چاند کے ٹکڑوں کا آنحضرتؐ کی بغل مبارک سے گزرنے کا کتب تفسیر و حدیث میں کہیں نام و نشان نہیں ہے اور کلماتِ علماء میں بھی ہمیں ایسی بات کہیں دکھائی نہیں دی۔ البتہ ناسخ التواریخ میں یہ جملہ موجود ہے مگر مولف نے اس کے

ماخذ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ جملہ غیر مقبول اور سراسر نامعقول ہے۔ البتہ اس کی کوئی مناسب تاویل کی جائے تو علیحدہ بات ہے۔

عصمتِ یوسف علیہ السلام

سوال ۲۲

سورۂ یوسف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ اَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ .....

اور یقیناً اس عورت نے ان سے برائی کا ارادہ کیا اور وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے۔" (یوسف ۲۳)

آیت بالا کے ضمن میں مامون الرشید نے امام علی رضا علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ یوسفؑ صدیق تھے ان کے لئے بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ زلیخا سے بدکاری کا ارادہ کرتے؟ تو امام عالی مقامؑ نے اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ امام علیہ السلام کے جواب کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

کتاب عیون الاخبار الرضا میں شیخ صدوقؒ نے اپنی اسناد سے نقل کیا ہے کہ جب مامون نے امام علی رضاؑ سے یہ سوال کیا تو امامؑ نے فرمایا:

لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ لَوْلَا اَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَهَمَّ بِهَا كَمَا هَمَّتْ بِهٖ لٰكِنَّهٗ كَانَ مَعْصُوْمًا وَالْمَعْصُوْمُ لَا يَهُمُّ بِذَنْبٍ وَلَا يَاْتِيْهِ. وَلَقَدْ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ اَبِيْهِ الصَّادِقِ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنَّهٗ قَالَ: هَمَّتْ اَنْ تَفْعَلَ وَهَمَّ بِاَنْ لَا يَفْعَلَ. (عیون الاخبار الرضا ج ا۔ ص ۲۰۱)

"زلیخا نے بدکاری کا ارادہ کرلیا تھا اور اگر یوسفؑ نے پہلے سے اپنے رب کی

دلیل و برہان نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی ارادہ کر لیتے۔ لیکن وہ معصوم تھے اور معصوم کبھی بھی گناہ کا ارادہ نہیں کرتا اور گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ میرے والد نے اپنے والد حضرت جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ زلیخا نے بدکاری کا ارادہ کرلیا تھا اور جواب میں یوسفؑ نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ وہ کبھی بھی خیانت نہیں کریں گے۔"

اس جواب باصواب کی مزید تاویل ہم یوں کرسکتے ہیں کہ "هَمَّ بِهَا" کا جملہ "لَوْلَا" کا جواب ہے اور اس پر مقدم ہے اور آیت مجیدہ کا معنی یہ ہے : "اگر یوسفؑ نے پروردگار کی برہان نہ دیکھی ہوتی تو وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے۔"

آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ "برہان رب" کیا تھی جس کی وجہ سے حضرت یوسفؑ نے زلیخا کی پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا؟

امام علی زین العابدین علیہ السلامؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: جس کمرے میں زلیخا حضرت یوسفؑ کو لے کر گئی تھی وہاں ایک بت بھی رکھا ہوا تھا۔ اس نے جب حضرت یوسفؑ کو دعوت گناہ دینے کا ارادہ کیا تو بت کے چہرے پر کپڑا ڈالا پھر حضرت کو گناہ کی دعوت دی۔

حضرت یوسفؑ نے پوچھا کہ تو نے بت کے چہرے پر کپڑا کیوں ڈالا؟ تو زلیخا نے کہا: یہ میرا معبود ہے مجھے اس کے سامنے نازیبا حرکت کرتے ہوئے حیا محسوس ہوتی ہے۔

حضرت یوسفؑ نے فرمایا: تجھے اپنے اس خودساختہ رب سے شرم محسوس ہوتی ہے جو نہ تو دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی کچھ سن سکتا ہے تو کیا مجھے اپنے رب سے حیا نہیں آئے گی جس نے انسانوں کو پیدا کیا اور جو ہر وقت ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے؟

بشیر و نذیر کا فرق

سوال ۲۳

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے :

اِنَّا اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیۡرًا. (الفتح ۸)

"بے شک ہم نے آپ کو گواہ اور بشیر و نذیر بنا کر روانہ کیا۔"

آپ سے گزارش ہے کہ آپ بشیر و نذیر کا فرق بیان کریں۔

جواب

بشیر کے معنی ہیں بشارت دینے والا اور نذیر کے معنی ہیں ڈرانے والا۔ اور یہ دونوں القاب ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہیں۔

رسول اللہؐ نے مومنین کو جنت کی بشارت دی اور کافروں کو دوزخ کے عذاب سے ڈرایا۔ رسول اللہؐ نے اہل طاعت کو اعلیٰ درجات کی بشارت دی اور اہل معصیت کو دوزخ کے درکات سے ڈرایا۔ علاوہ ازیں آپؐ نے اہل معصیت کو توبہ کے قبول ہونے کی بشارت دی اور عبادت گزاروں کو ریا اور خود پسندی کے مہلک نتائج سے ڈرایا۔

معجزہ، جادو و شعبدہ کا فرق

سوال ۲۴

معجزہ، جادو و شعبدہ میں کیا فرق ہے ؟

جواب

اَلْمُعْجِزَةُ مَا یُظْهِرُهُ اللّٰهُ عَلٰی یَدِ رَسُوْلِهٖ مِنَ الْفِعْلِ الْخَارِقِ لِلْعَادَةِ بِحَیْثُ یَعْجِزُ عَنْهُ سَائِرُ الْبَشَرِ بِمَا عِنْدَهُمْ مِنْ دَقَائِقِ الْفَلْسَفَةِ وَ الْحَذَاقَةِ فِی الصِّنَاعَةِ وَ الْمَهَارَةِ فِی الْفُنُوْنِ.

معجزہ وہ خارق عادت فعل ہے جسے اللہ اپنے رسول کے ہاتھ ظاہر کرتا ہے اور جس کے مقابلے میں دوسرے انسان اپنی تمام ترقی و صنعتی بلندی کے باوجود عاجز ہوتے ہیں۔ عالم اسلام کا اجماع ہے کہ معجزہ مدعی نبوت کی صداقت کی دلیل ہے۔ اور اس اجماع کی وجہ یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ مقام نبوت کے جھوٹے دعویدار کو کبھی بھی معجزہ عطا نہیں کرتا کیونکہ کسی جھوٹے دعویدار کو معجزہ دینا اللہ کی حکمت بالغہ کے خلاف ہے اور عقلاً قبیح ہے اور خداوند عالم و حکیم سے فعل قبیح کا صادر ہونا محال ہے۔

جادو کی تعریف

اَلسِّحْرُ اِظْهَارُ اَمْرٍ خَارِقٍ لِلْعَادَةِ مِنْ نَفْسٍ شَرِیْرَةٍ خَبِیْثَةٍ شَرَّةٍ اَعْمَالٍ مَخْصُوْصَةٍ یَجْرِیْ فِیْهَا التَّعْلِیْمُ وَ التَّلَمُّذُ.

جادو کسی شریر و خبیث شخص سے مخصوص اعمال کی وجہ سے خارق عادت چیز کے ظاہر کرنے کو کہا جاتا ہے اور جادو کو سکھایا بھی جاتا ہے اور سیکھا بھی جا سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر جادو چند مخصوص قسم کے منتروں کے زیر اثر ظہور پذیر ہوتا ہے اور جادو کو سیکھا جا سکتا ہے اور جادو کا اظہار ہمیشہ خبیث و شریر افراد کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

معجزہ تصدیق نبوت اور جادو خباثت کا مظہر ہے

معجزہ اور جادو میں چند وجوہ فرق ہے :

۱۔ معجزہ اللہ کی طرف سے اپنے نبی و رسول کی تصدیق کے لئے ظاہر ہوتا ہے

اور جادو ابلیس لعین کی طرف سے اپنے چیلوں کی مدد کے لئے ظاہر ہوتا ہے۔ معجزہ معاشرے کے پاکیزہ ترین فرد کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اور جادو خبیث ترین فرد کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ معجزہ کا مقصد مخلوق خدا کی اصلاح اور جادو کا مقصد مخلوق خدا کا بگاڑ ہوتا ہے۔ معجزہ پہلے سے مقرر شدہ مشق کا محتاج نہیں ہوتا جبکہ جادو کے لئے پہلے سے ابلیسی منتروں کو مقررہ مقدار میں پڑھنا ضروری ہوتا ہے اور اس میں مہارت لازمی ہے اور پھر یہ کہ جادو کو پڑھا اور پڑھایا جاسکتا ہے جبکہ معجزہ کو نہ تو پڑھا جاسکتا ہے اور نہ ہی پڑھایا جاسکتا ہے۔

۲۔ شخصیت کا مطالعہ ضروری ہے

اگر خلاف عادت فعل کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر ظاہر ہو جو تمام عیوب و نقائص سے مبرا اور رذائل اخلاقی اور مفاسد نفسانی سے منزہ ہو اور اس کے ساتھ تمام محاسن اخلاقی سے آراستہ اور جملہ فضائل اور ملکات فاضلہ سے مزین ہو اور دنیا کا طلبگار ہونے کی بجائے رضائے پروردگار کا خواہشمند ہو تو یقیناً وہ خلاف عادت فعل معجزہ ہوگا۔

اگر خلاف عادت کام مذکورہ صفات سے آراستہ شخص کے ہاتھ پر ظاہر ہو اور وہ شخص نبوت و امامت کا دعویدار نہ ہو تو اسے کرامت کہا جاتا ہے۔

اور اگر اس کے برعکس خلاف عادت امر کسی ایسے شخص سے ظاہر ہو جو دنیا طلب اور خواہشات کا پجاری اور کمالات نفسانیہ سے محروم ہو تو وہ خلاف عادت فعل جادو ہوگا اور اس خارق عادت فعل کے ظاہر کرنے والا جادوگر ملعون ہوگا۔

اسی لئے صاحبان فہم و عقل صرف کسی خارق عادت فعل کو دیکھ کر ہی کسی کو اپنا رہبر نہیں مان لیتے بلکہ وہ اس فعل کے ساتھ ساتھ فاعل کی شخصیت کا بھی جائزہ لیتے ہیں اور پورے غور و فکر کے بعد اس کے روحانی و رحمانی یا مادی و شیطانی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اگر اس خارق عادت فعل کے ظاہر کرنے والا انہیں اطاعت پروردگار کا خوگر اور بے نفس اور فضائل ظاہری و باطنی سے آراستہ اور عیوب و نقائص سے منزہ دکھائی دیتا ہے تو اس کی اطاعت کو اطاعت خدا سمجھ کر اس کی اتباع کرتے ہیں اور اس کے تمام اوامر و نواہی کی پابندی کرتے ہیں۔

اور اگر اس کے برعکس کسی کی شخصیت کو فضائل و کمالات سے عاری اور دنیا طلبی اور نفسانی رذائل سے داغدار پاتے ہیں تو چاہے وہ ہزاروں قسم کے شعبدے کیوں نہ دکھاتا پھرے وہ پھر بھی اس سے دور ہی رہتے ہیں۔

۳۔ جادو پوشیدہ وجوہات کے سبب ہوتا ہے

جادو ہمیشہ پوشیدہ وجوہات کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتا ہے جبکہ معجزہ محض عطائے پروردگار کا مظہر ہوتا ہے اور معجزہ کے لئے پہلے سے کسی مشق اور پریکٹس (Practice) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف نبی کے سوال کرنے پر معجزہ ظاہر ہوتا ہے۔

جبکہ ایک جادوگر کو خارق عادت فعل کے لئے پہلے سے مخصوص طلسمات اور منتروں کا جاپ کرنا پڑتا ہے اور اس کے ساتھ اسے مخصوص قسم کی دواؤں کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے اور اسے انسان اور جنات کی تسخیر کے مراحل بھی طے کرنے پڑتے ہیں اور بعض اوقات اسے اپنے سحر کے اظہار کیلئے خاص قسم کی غذا بھی کھانی پڑتی ہے۔ مثلاً یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض ساحر لوگوں کے حواس پر تصرف حاصل کرنے کیلئے پہلے قہوہ کا ایک کپ پیتے ہیں پھر اسکے بعد ان کا عمل موثر ثابت ہوتا ہے۔

الغرض جادو ہمیشہ پوشیدہ وجوہات کے ذریعے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء کا یہ فتویٰ ہے کہ جادو سیکھنا فرض کفائی ہے۔ اور اس فتویٰ کی وجہ یہ ہے کہ علماء یہ چاہتے ہیں کہ امت اسلامیہ میں چند افراد ایسے ضرور ہونے

چاہئیں جو کہ جادو اور جادوگر کی پہچان کر سکیں اور امت اسلامیہ کو جادوگروں کا آلہ کار بننے سے بچانے میں مدد و معاون ثابت ہو سکیں۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ جب بھی کوئی جادوگر خواہ وہ اپنے فن میں کتنی بھی مہارت کیوں نہ رکھتا ہو نبوت کا دعویٰ کرے تو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کاملہ کے تحت اسے جادو کے کرشموں سے محروم کر دیتا ہے۔

۴۔ جادو محدود اور معجزہ لا محدود ہوتا ہے

معجزہ زمان و مکان کا پابند نہیں ہوتا۔ پیغمبر جہاں چاہے اور جب چاہے اللہ سے معجزہ کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے سوال کو قبول کرتا ہے اور اس کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر کر دیتا ہے جبکہ جادوگر کے پاس محدود قسم کے چند شعبدے ہوتے ہیں اور وہ لوگوں کے منہ مانگے شعبدے دکھانے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس کی نسبت نبی لوگوں کے منہ مانگے معجزات دکھانے پر باذن اللہ قادر ہوتا ہے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ معجزہ کا مطالبہ کرنے والے افراد کا مقصد ایمان لانا ہو اور مسخرہ پن نہ ہو جیسا کہ مسئلہ ۱۸ میں اس کی مکمل بحث کی جا چکی ہے۔

محال عقلی اور محال عادی میں کیا فرق ہے؟

سوال ۲۵

محال عقلی اور محال عادی کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

محال عقلی وہ ہے جس کو عقل کسی قیمت پر تسلیم نہ کرے اور جس کے

وقوع پذیر ہونے کو ناممکن قرار دے۔

بالفاظ دیگر محال عقلی وہ ہے جس کے وقوع پذیر ہونے کا امکانِ ذاتی موجود نہ ہو۔ مثلاً اجتماع ضدین، ارتفاع نقیضین اور شریک باری تعالیٰ مذکورہ تینوں امور کو عقل محال قرار دیتی ہے۔[۱]

اسی طرح سے اگر یہ کہا جائے کہ ساری کائنات ایک انڈے میں سما سکتی ہے جبکہ نہ تو کائنات کا حجم سمٹے اور نہ ہی انڈے کا حجم بڑھے۔ واضح ہے کہ یہ بات عقلی طور پر ناممکن ہے اور جو چیز عقلی طور پر ناممکن ہو اسے محال عقلی کہتے ہیں۔

محال عادی وہ ہے جس کے وقوع کا امکان ذاتی موجود ہو یعنی از روئے عقل محال نہ ہو لیکن عمومی انداز اور عادت کے تحت اس کے وقوع کا امکان نہ ہو۔ مثلاً باپ کے بغیر بیٹے کا پیدا ہونا جیسے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔

واضح رہے کہ انبیاءؑ و اوصیاء کے تمام تر معجزات کا تعلق محال عادی سے ہوتا ہے محال عقلی سے نہیں ہوتا۔ سادہ الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیوانات کا انسان سے ہم کلام ہونا اور نباتات و جمادات کا انسانوں کی طرح سے گفتگو کرنا اور اندھوں اور بیماروں کا فوراً شفایاب ہو جانا وغیرہ عادتاً محال ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نمائندوں کے ہاتھوں پر ان کو ظاہر کر کے ان کی صداقت کو ظاہر کرتا ہے۔ مذکورہ امور اگرچہ محال دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ عادتاً محال ہیں عقلاً محال نہیں ہیں۔

---

[۱] اجتماع ضدین یعنی دو متضاد چیزوں کا بیک وقت جمع ہونا۔ مثلاً بیک وقت اور ایک ہی جگہ پر سردی اور گرمی کا جمع ہونا اور آگ اور پانی کا جمع ہونا۔

ارتفاع نقیضین: دونوں متضاد چیزوں کا اٹھ جانا۔ مثلاً یہ کہیں کہ اب نہ دن ہے اور نہ رات ہے تو یہ بات غلط ہوگی کیونکہ یا تو دن ہوگا یا رات ہوگی۔ ان دونوں میں سے ایک نہ ایک چیز ضرور ہوگی۔ (من المترجم عفی عنہ)

بحثِ امامت

سوال ۲۶

حضرت علی علیہ السلام کے متعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متواتر حدیث ہے۔ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ۔ "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔"

آپ سے التماس ہے کہ لغت عرب میں لفظ مولا کے کیا معانی ہیں اور حدیث مذکور میں لفظ مولا کس معنی میں استعمال ہوا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

لغت میں لفظ مولا کے سولہ معانی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱)مالک۔ (۲)رب۔ (۳)آزاد کرنے والا(آقا)۔ (۴)آزادی حاصل کرنے والا(غلام)۔ (۵)ہمسایہ۔ (۶)پشت سر اور پیش رو۔ (۷)تابع۔ (۸)ضامن جریرہ یعنی جس سے عہد و پیمان وابستہ ہو۔ (۹)داماد۔ (۱۰)چچازاد۔ (۱۱)انعام کرنے والا۔ (۱۲)جس پر انعام کیا گیا ہو۔ (۱۳)محبّ اور دوست۔ (۱۴)مددگار۔ (۱۵)جس کی اطاعت کی جائے (سردار)۔ (۱۶)جو امور میں حق تصرف رکھتا ہو۔

لفظ مولا کے درج بالا سولہ معانی ہیں اور جب بھی کلام عرب میں اس لفظ کا اطلاق ہوگا تو معانی کے تعین کیلئے کلام کے سیاق وسباق اور موقع محل کو دیکھا جائیگا۔

پیغمبر اکرمؐ نے غدیر خم کے مجمع عام میں اپنے بھائی حضرت علی علیہ السلام کا بازو پکڑ کر تمام حاضرین کو دکھا کر فرمایا تھا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ۔ جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔"

اب آیئے دیکھیں کلام کے سیاق و سباق اور موقع و محل کی مطابقت سے لفظ مولا کا یہاں کونسا معنی مراد لیا جاسکتا ہے۔

پہلے بارہ معانی تو مذکورہ صورت میں کسی قیمت پر درست نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر معانی غیر صحیح اور کچھ مضحکہ خیز ہیں۔ البتہ تیرھواں یعنی محبّ اور دوست کا معنی کچھ نہ کچھ درست دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس معنی کے لئے بھی لفظی قرینہ موجود نہیں ہے اور اسے ظاہر کرنے میں کوئی حکمت بھی نہیں ہے کیونکہ سخت گرمی میں ہزاروں افراد کو بٹھا کر، پالانوں کا منبر بنا کر اگر رسول خداؐ نے یہ اعلان کیا ہو "جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؑ دوست ہے۔" یقیناً یہ اتنے بڑے اہتمام کے [illegible] کیونکہ اس بات کو تمام مسلمان پہلے سے ہی جانتے تھے کہ محمد مصطفیؐ اور علی [illegible] دوست ہیں اور پھر یہ دوستی صرف رسول خداؐ اور علی مرتضیٰؑ تک محدود بھی نہیں تھی بلکہ تمام اہل ایمان پہلے سے ہی ایک دوسرے کے خیر خواہ اور دوست تھے کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان موجود ہے: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ۔ (توبہ ۷۱) "مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں اور ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"

اور پھر یہ خیر خواہی اور دوستی صرف بنی آدم تک کے اہل ایمان تک محدود نہیں تھی بلکہ فرشتے بھی اہل ایمان کے خیر خواہ اور دوست تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ملائکہ کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرمایا: نَحْنُ اَوْلِیَآءُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ...... (فصلت ۳۱) "ہم دنیاوی زندگی اور آخرت میں

تمہارے خیر خواہ اور دوست ہیں۔"

اسی لئے اگر رسول خداؐ نے دوستی کو ظاہر کرنا ہوتا تو پھر آپؐ کو اتنے بڑے اہتمام کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے بڑے اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے یہ معنی مراد نہیں لیا تھا۔ البتہ چاروناچار پندرہواں اور سولھواں معنی ہی درست تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ قرائن عقلیہ اور کلام کے سیاق و سباق کے پیش نظر یہی دو معانی درست معلوم ہوتے ہیں اور ویسے بھی پندرہویں اور سولھویں معنی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

لفظ مولا کے معنی متعین کرنے کے لئے آنحضرتؐ کا مکمل فرمان دیکھنا چاہئے۔ آنحضرتؐ نے علیؑ کے مولا ہونے کا اعلان بعد میں کیا۔ اس سے پہلے آپؐ نے یہ الفاظ فرمائے: اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ. "کیا میں تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟ اس کے جواب میں تمام حاضرین نے بیک زبان ہو کر کہا: "بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ. "کیوں نہیں! آپؐ ہم پر ہم سے بھی زیادہ حق تصرف رکھتے ہیں۔"

جب آنحضرتؐ تمام حاضرین سے اپنے متصرف ہونے کا اقرار کراچکے تو پھر آپؐ نے حضرت علیؑ کے بازو کو پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ. "جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علیؑ مولا ہے۔" کلام کا سیاق و سباق مدنظر رکھ کر مذکورہ جملہ کا صرف یہی مفہوم ہوسکتا ہے کہ جس کا میں اولیٰ بالتصرف ہوں، اس کا یہ علی اولیٰ بالتصرف ہے۔

کلام کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھا جائے تو لفظ مولا کا آخری معنی ہی صحیح اور حتمی قرار پاتا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا معنی صحیح نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں حضرت عمرؓ نے جن الفاظ سے حضرت علیؑ کو مبارک دی تھی اس سے بھی حضرت علیؑ کا اولیٰ بالتصرف ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

روایات میں وارد ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؑ کو مبارک دیتے ہوئے کہا تھا: بَخٍ بَخٍ لَکَ یَاعَلِی! اَصْبَحْتَ مَوْلَایَ وَ مَوْلَا کُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَۃٍ. "علی! مبارک ہو تم میرے اور ہر مومن مرد اور عورت کے مولا بن گئے۔"

اگر مولا کے معنی دوست کے ہوتے تو کیا حضرت عمرؓ حضرت علیؑ کو پہلے اپنا اور مومنوں کا دوست نہیں سمجھتے تھے؟ اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ مولا کے معنی دوست کے ہیں تو مومن مردوں سے تو علیؑ کی دوستی ہوسکتی ہے مومن عورتوں سے دوستی کے کیا معنی ہوں گے؟

ابن اثیر جزری نے کتاب نہایہ میں تسلیم کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کی مبارکبادی میں لفظ مولا اولیٰ بالتصرف کے معانی میں ہے۔

حضرت حسانؓ بن ثابت دربار نبویؐ کے شاعر تھے انہوں نے آنحضرتؐ سے اجازت پانے کے بعد واقعہ غدیر پر اپنا مشہور قصیدہ کہا تھا جس میں انہوں نے یہ شعر کہا:

فَقَالَ لَہٗ قُمْ یَاعَلِیُّ فَاِنَّنِیْ رَضِیْتُکَ مِنْ بَعْدِیْ اِمَامًا وَھَادِیًا

"رسولؐ نے کہا: علیؑ! کھڑے ہو جاؤ، میں نے تمہیں اپنے بعد امام اور ہادی مقرر کیا ہے۔"

حسانؓ عرب تھے اور عربی زبان کی باریکیوں اور مطالب کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر حضور اکرمؐ نے لفظ مولا کو دوست کے معنی میں کہا ہوتا تو وہ کبھی لفظ مولا کا ترجمہ امام اور ہادی نہ کرتے۔

اخطب خوارزمی نے حدیث غدیر کے ضمن میں زید بن ارقم اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور ابن عباس سے یہ الفاظ روایت کئے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اَنْتَ اِمَامُ

کُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ بَعْدِیْ وَ وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ. "تو میرے بعد ہر مومن مرد و عورت کا امام ہے اور ہر مومن مرد و عورت کا سرپرست ہے۔"

مقام غدیر کے علاوہ بھی رسول اکرمؐ نے اپنے صحابہ سے اپنے اور علیؑ کے اولیٰ و مولیٰ ہونے کا اقرار کرلیا تھا جیسا کہ احمد بن حنبل، ابن مغازلی اور شافعی و ابن مردویہ نے بریدہ سے روایت کی کہ میں سفر یمن سے واپس آیا اور میں نے رسول خداؐ کی خدمت میں حضرت علیؑ کی شکایت کی تو آنحضرتؐ نے فرمایا: یَا بُرَیْدَۃُ! اَلَسْتُ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ. "بریدہ! کیا میں مومنین کی جانوں پر ان سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟

میں نے کہا: کیوں نہیں! آپؐ ہمارے اولیٰ بالتصرف ہیں۔

پھر آنحضرتؐ نے فرمایا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ وَ اَنَّ عَلِيًّا اَوْلَى النَّاسِ بِكُمْ بَعْدِيْ. "جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے اور میرے بعد علیؑ ہی تم سب کا حاکم ہے۔"

اور واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ! بَلِّغْ مَآاُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ...... (المائدہ ۶۷) "اے رسولؐ! آپ اس امر کی تبلیغ کریں جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کے پیغام کو پہنچایا ہی نہیں۔"

اس سخت تاکیدی حکم کے نازل ہونے کے بعد آنحضرتؐ نے غدیر خم کے مقام پر پڑاؤ ڈالا اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ہزاروں افراد کو بٹھا کر خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپؐ نے "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" کا اعلان فرمایا۔

اگر بالفرض پیغام کی نوعیت بس اتنی سی تھی کہ جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؑ دوست ہے تو اتنے عام سے پیغام کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو اتنا

تہدیدی حکم جاری کیوں فرمایا؟

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے مقام غدیر خم پر حضرت علیؑ کا بازو پکڑ کر "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" کا اعلان کیا تو اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو کامل کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (المائدہ ۳) "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو تمام کیا اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرمؐ نے تو صرف یہی فرمایا تھا کہ "جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ مولا ہے" اور اگر مولا سے دوست مراد ہے تو گویا آنحضرتؐ نے تو صرف یہی اعلان کیا تھا کہ "جس کا میں دوست ہوں اس کا علیؑ بھی دوست ہے" تو یہ بات اتنی اہمیت کی حامل ہرگز نہیں تھی کہ اللہ اس کی وجہ سے اپنے دین کو کامل کرتا اور نعمتوں کو تمام کرتا اور دین اسلام پر اپنی رضا کی مہر ثبت فرماتا۔

اور اس "مولا" کے معنی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سورۂ معارج کی ابتدائی آیات کی شان نزول پر بھی توجہ کی جائے۔

علمائے مفسرین نے لکھا ہے کہ واقعہ غدیر کے بعد حارث بن نعمان فہری آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور آکر کہا: محمدؐ! آپ یہ بتائیں کہ آپ نے ہمیں بت چھوڑنے اور اسلام قبول کرنے کی جو دعوت دی اور ہمیں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے اور حج کرنے کے جو احکام دیئے ہیں یہ اپنی طرف سے کہا یا اللہ کی طرف سے کہا؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: حکم خدا کا تھا اور پیغام لانے والا جبرئیل تھا اور حکم میں نے سنایا تھا۔

پھر حارث بن نعمان نے کہا: محمدؐ! تو اتنی باتوں پر بھی راضی نہیں ہوا یہاں

تک کہ تو نے اپنے ابن عم علیؑ کو ہماری گردنوں پر سوار کر دیا اور اعلان کیا "جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے" تو کیا یہ حکم اللہ کی طرف سے تھا یا تمہاری اپنی طرف سے تھا؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: حکم خدا کا تھا اور پیغام لانے والا جبرئیلؑ تھا اور حکم میں نے سنایا تھا۔

یہ سن کر اس نے کہا: پروردگار! اگر محمدؐ اس بات میں سچا ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش فرما اور ہم پر دردناک عذاب نازل فرما۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی اونٹنی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ آسمان سے ایک پتھر آکر اس کے سر پر گرا اور وہ ہلاک ہو گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر "مولا" کے معنی دوست کے ہی تھے تو حارث بن نعمان بھی عرب تھا اور وہ عربی زبان کو بخوبی جانتا تھا، اس نے اس پر اعتراض ہی کیوں کیا اور اسے عذاب مانگنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر یہ کہ رسول خداؐ بھی تو اسے سمجھا سکتے تھے کہ بندۂ خدا تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو رہا ہے میں نے کونسا علیؑ کی امامت و حکومت کا اعلان کیا ہے میں نے تو بس یہی کہا ہے کہ "جس کا میں دوست ہوں اس کا علی دوست ہے۔" اس پر یقیناً اس کا غصہ جھاگ کی طرح سے بیٹھ جاتا اور اسے عذاب طلب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو رسول خداؐ نے اسے تسلی دی اور نہ ہی اسے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور نہ ہی اللہ نے عذاب بھیجنے میں کوئی تاخیر کی۔

ان تمام قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا کے معنی دوست و مددگار کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی حاکم اور متصرف امور کے ہیں۔

حضرت علیؑ بھی حدیث غدیر کو اپنی امامت و خلافت کے لئے نص قطعی

قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد بن حنبل اور دیگر محدثین نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے مسجد کوفہ میں مسلمانوں کو قسم دے کر کہا: لوگو! میں تمہیں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جس نے مقام غدیر خم پر آنحضرتؐ سے "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" کا اعلان سنا ہو تو وہ اٹھ کر اس کی گواہی دے۔ اس پر تیس افراد نے اٹھ کر گواہی دی کہ ہم مقام غدیر پر موجود تھے اور رسول خداؐ نے فرمایا تھا: اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنِّیْ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا بَلٰی يَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ میں مومنین کی جانوں سے زیادہ ان پر تصرف کا زیادہ حق رکھتا ہوں؟"

سب نے کہا: کیوں نہیں یا رسول اللہ۔

پھر آنحضرتؐ نے آپؑ کا بازو پکڑ کر بلند کیا تھا اور فرمایا تھا: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ. "جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے۔"

اگر مولا بمعنی دوست ہوتا تو حضرت علیؑ کو گواہی طلب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور دوست ہونا کوئی اتنی بڑی بات بھی تو نہیں تھی جس پر علیؑ فخر کرتے کیونکہ تمام مومنین پہلے سے ہی ایک دوسرے کے دوست تھے۔

اعلان غدیر کی معنویت کے لئے یہ دیکھنا بھی بڑا ضروری ہے کہ مقام غدیر ایسا مقام تھا جہاں سے ہر طرف کو راستے نکلتے تھے اور ستر ہزار یا اس سے کم و بیش حجاج کرام کا قافلہ جو کہ دس بارہ میلوں میں پھیلا ہوا تھا اسے آنحضرتؐ کے حکم کے تحت جمع کیا گیا اور سخت دھوپ میں پالانوں کا منبر نصب کیا گیا اور "اَلَسْتُ اَوْلٰی بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ" کے الفاظ سے اپنا اولیٰ اور متصرف ہونے کا اقرار کرانے کے بعد "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" کا اعلان کیا گیا۔ اس پس منظر کے بعد بھی اگر یہ کہا جائے کہ اس کا معنی و مفہوم صرف یہی تھا کہ علیؑ بھی تمہارا دوست ہے تو یقیناً یہ عقل و خرد کی نفی ہے اور ایسے افراد سے یہ پوچھنا چاہئے کہ اتنے غیر اہم اعلان کے لئے

ہزاروں افراد کو چلچلاتی دھوپ میں ٹھانے کی کیا تک تھی جبکہ اس بات کو تو تمام لوگ پہلے سے ہی جانتے تھے؟

اگر امت اسلامیہ کے افراد ضد چھوڑ دیں اور اپنے ضمیر و وجدان کی عدالت میں اس مسئلہ کو پیش کریں تو ہمیں یقین ہے کہ ان کا ضمیر اور ان کا قلب سلیم اس بات کی گواہی دے گا کہ حدیث کا اول و آخر مفہوم یہی ہے کہ "جس کا میں حاکم اور متصرف ہوں اس کا علیؑ حاکم اور متصرف ہے۔"

اس حدیث کی مزید وضاحت اور مخالفین کے اعتراضات کے جواب کے لئے کتاب "کفایة الموحدین" کی طرف رجوع فرمائیں۔

ایک ہی وقت میں متعدد مقامات پر موجود ہونا

سوال ۲۷

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جنگ نہروان کے موقع پر اپنے لشکر کو ایک کنوئیں سے پانی پلایا تھا۔ کنوئیں پر پانی پلانے والے بھی علیؑ تھے اور کنوئیں سے کچھ فاصلے پر اپنے لشکر کے دوسرے حصے کو پانی پلانے والے بھی علیؑ تھے اور غالی افراد اس قسم کی روایات کے پیش نظر غلو کرنے لگ جاتے تھے تو کیا یہ اور اس طرح کے دیگر واقعات صحیح ہیں، اگر صحیح ہیں تو کیسے؟

جواب

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام کا ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر موجود ہونا ہمارے مسلمات میں سے ہے اور اس کے علیحدہ علیحدہ مواقع ہیں اور ہر موقع کے لئے بہت سی روایات موجود ہیں۔

جنگ خیبر کے متعلق روایت ہے کہ یہودی لشکر کے سترہ حصے بن گئے اور ہر حصے کے پیچھے حضرت علیؑ تلوار چلا رہے تھے۔

اسی طرح سے جنگ صفین میں لشکر کتیبہ کی تعداد پچیس ہزار افراد پر مشتمل تھی اور ان کے مقابلے میں تنہا حضرت علیؑ گئے۔ آپؑ نے ان سے جنگ کی اور آخر کار پچیس ہزار کا لشکر آپؑ کے حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا اور جب یہ لشکر معاویہ کے پاس پہنچا تو ان میں سے ہر ایک فوجی نے یہ کہا کہ "ہم نے جدھر بھی نگاہ کی علیؑ ہمیں شمشیر و سناں لے کر جنگ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔"

بہت سی روایات میں وارد ہے کہ مرنے والا ہر شخص حالت احتضار میں آپ کا مشاہدہ کرتا ہے کہ ہر منٹ میں دنیا میں ہزاروں شخص مرتے ہیں اور مرنے والے افراد کسی ایک علاقے سے بھی مربوط نہیں ہوتے کوئی مشرق میں مر رہا ہے کوئی مغرب میں مر رہا ہے اور کوئی ایک براعظم میں اور کوئی دوسرے براعظم میں مر رہا ہے مگر اس کے باوجود تمام مرنے والے حضرت علیؑ کو دیکھ کر ہی مرتے ہیں۔

حضرت کے بیک وقت متعدد مقامات پر حاضر ہونے کی وجوہات کے متعلق علماء نے بحثیں کی ہیں۔ علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں اسکی وجہ پر بحث کی جسکا خلاصہ یہ ہے:

"حضرت امیرالمومنینؑ متفرق مقامات پر اپنے جسم اصلی و مادی سے نہیں گئے بلکہ آپ اپنے جسم مثالی سے تمام مقامات پر حاضر ہوئے۔ جسم مثالی انتہائی لطیف ہوتا ہے اور شکل و صورت میں جسم مادی کی مکمل شبیہ ہوتا ہے۔ عالم برزخ میں ارواح کا تعلق بھی اسی جسم مثالی سے ہوتا ہے اور ولایت کلیہ کے حامل حضرات کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت عطا کی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بدن مثالی کے ساتھ مختلف مقامات پر حاضر ہوسکتے ہیں اور جس عمل کا ارادہ کریں اور جہاں ارادہ کریں اسے سرانجام دے سکتے ہیں۔"

حاجی نوری مرحوم نے کتاب دارالسلام کے آخر میں اور وجوہات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ مزید تحقیق کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع فرمائیں۔

کیا امام پر غشی اور بیہوشی طاری ہو سکتی ہے ؟

سوال ۲۸

غشی بے ہوشی ہوتی ہے اور امام کے لئے جائز نہیں ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی مشہور ہے کہ امیر المومنینؑ رات کے وقت خوف خدا اور عظمت خدا کی وجہ سے غش کر جاتے تھے اور ان کا وجود خشک لکڑی کی مانند ہو جاتا تھا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی دکھائی دیتے ہیں: امام حسن مجتبیٰؑ نے اپنی حالت احتضار میں امام حسینؑ سے کہا تھا کہ ہم ایسا خاندان ہیں کہ ہم پر بے ہوشی طاری نہیں ہوتی اور امام حسنؑ حضرت عزرائیلؑ کے آنے تک امام حسینؑ کے ہاتھ کو ہاتھ میں لئے رہے۔

غشی میں عقل زائل ہو جاتی ہے جبکہ امام حجت خدا ہوتا ہے اور حجت خدا کے لئے عقل کے زائل ہونے کو کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہے اور پھر روایات میں بھی تعارض پایا جاتا ہے۔

درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

امام کی عقل و ادراک جنون و دیوانگی کی وجہ سے زائل نہیں ہو سکتی لیکن مناجات کی شدتِ توجہ اور کمالِ استغراق کی وجہ سے ان پر غشی طاری ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور ان پر ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے جب انہیں اپنے اردگرد

اور پس و پیش کا کوئی خیال تک نہیں رہتا۔

امام محمد باقرؑ کے متعلق منقول ہے کہ آپؑ نماز پڑھ رہے تھے اور آپؑ کا ایک بچہ گھر کے کنوئیں میں گر گیا اہل خانہ نے اگرچہ جتنی بھی آہ و فغاں کی امامؑ نے ایک نہ سنی البتہ جب نماز سے فارغ ہوئے تو اہل خانہ نے آپؑ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ یہ شدتِ توجہ اور کمالِ استغراق کی دلیل ہے اور اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت سجادؑ کے متعلق بھی منقول ہے۔

ایک بار امام سجادؑ گھر میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مکان کو آگ لگ گئی مگر آپؑ کو اس کا علم تک نہ ہوا اسی طرح جب شدتِ استغراق میں زیادہ اضافہ ہوتا تو اپنے بدن سے بھی آپؑ کی توجہ ہٹ جاتی تھی۔

اسی طرح سے جامع السعادات نراقی میں مروی ہے کہ امیر المومنینؑ کے پاؤں میں تیر لگ گیا اور جراح نے جب اسے نکالنا چاہا تو حضرت کو شدید اذیت محسوس ہوئی۔ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے فرمایا: علی کو اذیت نہ دو اور جب یہ نماز میں مصروف ہوں تو ان کے پاؤں سے تیر نکال لینا۔ چنانچہ جب نماز کا وقت ہوا اور حضرت علیؑ نے نماز شروع کی تو جراح نے آپؑ کے پاؤں سے تیر نکال لیا اور آپؑ نے اف تک نہ کی۔

یہ روایت بڑی مشہور ہے لیکن اس کی سند کچھ زیادہ معتبر نہیں ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مکمل تیر اگر جسم میں پیوست ہو تو انسان کو کسی صورت میں چین محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ روایت میں لفظ "نصل" موجود ہے جس کے معنی چھوٹے تیر کے ہیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ تیر کا کچھ تھوڑا سا حصہ پائے مبارک میں باقی رہ گیا ہوگا جسے حالت نماز میں نکالا گیا ہوگا۔ ورنہ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ حالت نماز میں آپؑ کے پائے مبارک

سے مکمل تیر نکالا گیا ہو اور آپ کو اس کی مطلق خبر نہ ہوئی ہو۔[1]

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اگر اس مقام پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب حضرتؑ اتنے استغراق سے نماز پڑھتے تھے کہ ان کے پاؤں سے تیر نکال لیا گیا مگر انہیں اس کی خبر نہ ہوئی تو پھر انہوں نے حالت نماز میں ایک سائل کی آواز کیسے سن لی تھی اور اسے اپنی انگشتری حالت رکوع میں کیونکر دی تھی؟[2]

اس اشکال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ:

۱۔ حضور قلب کے بھی مراتب ہیں۔ اس کا ابتدائی مرتبہ یہ ہے کہ دل پروردگار کی طرف متوجہ ہو اور اس کے ساتھ دوسرے امور سے بھی غافل نہ ہو اور اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ دل مکمل طور پر حضرت حق کی طرف متوجہ ہو اور یاد حق کے علاوہ اسے کچھ بھی یاد نہ ہو۔ حضرت امیرالمومنینؑ ممکن ہے کہ اس وقت حضور قلب کے ابتدائی مرحلے پر ہوں اور انہوں نے سائل کی آواز کو سن لیا ہو۔

۲۔ حضرت کے اس عمل میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ آپؑ نے بیک وقت اللہ تعالیٰ کے دو احکام پر عمل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آپؑ نے بیک وقت رکوع اور زکوٰۃ پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپؑ کے عمل کو سراہتے ہوئے فرمایا:

....وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ. "اور وہ حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔"

آمدم بر سر مطلب امیرالمومنینؑ اور ائمہ ہدیؑ پر عبادت میں ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتے تھے اور انہیں اپنی کوئی خبر نہیں رہتی تھی اور وہ ہمیشہ ایسی ہی حالت کی تمنا کیا کرتے تھے اور اس حالت کے علاوہ عام حالت کو وہ اپنے لئے نقص و کوتاہی تصور کرتے تھے اور اس کے لئے بارگاہ احدیت میں استغفار کیا کرتے تھے۔ اسی لئے حضرت امیرالمومنینؑ پر حالت مناجات میں غشی کی روایات درست ہیں کیونکہ یہ غشی مشاہدہ حق کے استغراق کے نتیجے میں پیدا ہوتی تھی البتہ امام کے لئے عموی غشی ممنوع ہے۔

قصاصِ خونِ حسین علیہ السلام

سوال ۲۹

زیارت عاشورا میں دو فقرے وارد ہیں جن کی نسبتیں مختلف ہیں۔ پہلا فقرہ

۱۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس استبعاد کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جب انسان کسی کام میں منہمک ہوتا ہے تو اسے نہ تو گرد و پیش کی خبر ہوتی ہے اور نہ ہی اسے اپنی خبر ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ کے قصے میں بتایا گیا: فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَ قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا إِنْ هٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ. "پھر جیسے ہی ان عورتوں نے اسے دیکھا تو اسے بڑا حسین و جمیل پایا اور اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہا حاشا للہ یہ تو آدمی نہیں ہے بلکہ کوئی محترم فرشتہ ہے۔" جب جمال یوسفؑ میں کھوئی ہوئی عورتوں کو اپنے ہاتھ کٹنے کی خبر نہیں ہوئی تو حضرت علیؑ تو شاہد حقیقی کے جمال کے مشاہدہ میں مستغرق تھے اسی لئے اگر ان کے پائے مبارک سے تیر نکال لیا جائے اور انہیں اسکی مطلق خبر نہ ہو تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے بقول غالب۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

(عرض مترجم)

۲۔ مترجم یہ سمجھتا ہے کہ حضرت علیؑ اپنی نماز میں حضور قلب کے آخری مرحلے پر تھے اسی لئے سائل کی تین مرتبہ کی صدا آپ کے کانوں سے نہ ٹکرائی اور جب وہ مایوس ہو کر جانے لگا تو اس نے کہا تھا: اے اللہ میں تیرے در سے خالی جا رہا ہوں۔ اور جب اس کی یہ آواز بارگاہ حق میں پہنچی تو (بقیہ اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ سے پیوستہ)

حضرت علیؑ کی روح اطہر بھی حضرت حق میں موجود تھے اسی لئے آپ نے اس کی مذکورہ صدا کو سنا اور سائل کو اشارہ کیا اور اسے حالت رکوع میں انگشتری عطا فرمائی۔ (عرض مترجم)

ہے: اَنْ یَرْزُقَنِیْ طَلَبَ ثَارِكَ. "اللہ تعالیٰ مجھے آپ کے خون کا قصاص طلب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

اور دوسرے فقرے میں یہ الفاظ وارد ہیں: اَنْ یَرْزُقَنِیْ طَلَبَ ثَارِیْ.
"اللہ تعالیٰ مجھے میرا اپنا قصاص طلب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

اب جبکہ مذکورہ فقروں کی نسبتوں میں فرق ہے تو کیا ایسا تو نہیں کہ شیعوں کا حضرت امام حسینؑ کے ساتھ بہت زیادہ اتحاد ہے اسی لئے امام کے قصاص کو اپنے قصاص سے تعبیر کیا گیا ہو۔ یا اس کی کوئی دوسری وجہ ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب

زائر کی طرف سے قصاص حسینؑ کو اپنا قصاص قرار دینے کی ایک وجہ تو وہی ہے جسے سوال میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ تمام شیعہ امام مظلومؑ سے روحانی اتصال رکھتے ہیں۔ دراصل امامؑ کے شیعہ حضرت کے اجزائے وجودیہ کی مانند ہیں کیونکہ حدیث میں کہا گیا ہے: شِیْعَتُنَا خُلِقُوْا مِنْ فَاضِلِ طِیْنَتِنَا وَ عُجِنُوْا بِمَآءِ وِلاَیَتِنَا.
"ہمارے شیعوں کی تخلیق ہماری بقیہ طینت سے ہوئی اور ہماری ولایت کے پانی سے انہیں خمیر کیا گیا۔"

امیرالمومنینؑ نے رمیلہ سے کہا تھا: جب بھی ہمارے کسی شیعہ پر مرض کا حملہ ہو یا اسے کوئی زخم لگے اور خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو تو وہ زخم ہمیں اپنے وجود پر لگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ایک شخص نے امام علی رضاؑ سے پوچھا تھا: کبھی کبھی کسی وجہ کے بغیر میں خوشی محسوس کرتا ہوں اور کبھی کسی وجہ کے بغیر میں اپنے اندر غم محسوس کرتا ہوں اس کی کیا وجہ ہے؟

امامؑ نے فرمایا: تمہاری خوشی اور غمی تمہارے امامؑ کی خوشی اور غمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اسی لئے امام حسینؑ کے قتل کو ہر شیعہ اپنا قتل قرار دیتا ہے اور وہ زیارت عاشورا میں مذکورہ جملے ادا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ دو اور وجوہات بھی ہیں:

۱۔ عرب و عجم کے محاورات میں یہ بات رائج ہے کہ جب کسی قوم کے سردار پر کوئی مصیبت وارد ہو تو اس کی پوری قوم کا ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ یہ مصیبت تنہا میرے سردار پر نہیں آئی بلکہ مجھ پر بھی آئی ہے اور اگر کسی قوم کا سردار مارا جائے تو قوم کا ہر فرد یہ کہتا ہے کہ ظالموں نے صرف سردار کو ہی نہیں مارا اس کے ساتھ انہوں نے ہمیں بھی قتل کر دیا۔

اور امام حسینؑ جملہ اہل ایمان کے سردار ہیں اسی لئے ان کا قتل نہ فقط ان کا انفرادی قتل ہے بلکہ تمام اہل ایمان کا قتل ہے۔ اسی لئے زائر یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے آپ کا اور میرے اپنے خون کا قصاص لینے کی توفیق عنایت فرمائے۔

۲۔ اگر بنی امیہ یہ ظلم عظیم نہ کرتے اور امام مظلوم کو شہید کرنے کی جسارت نہ کرتے تو بعد میں کسی ظالم کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ وہ کسی حق کے داعی کو قتل کرے اور یوں بنی امیہ نے آپ کو شہید کر کے جملہ اہل ایمان کے قتل کا دروازہ کھول دیا اور قیامت تک جتنے بھی اہل ایمان قتل ہوں گے تو اس کا موجب بنی امیہ ہی قرار پاتے رہیں گے اسی لئے زائر اپنی زیارت میں ان الفاظ سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ آپ کا قتل صرف آپ کی ذات تک محدود نہیں رہا بلکہ آپ کی شہادت سے ہمارے قتل کا دروازہ کھول دیا گیا اور اللہ تعالیٰ مجھے یہ توفیق دے کہ میں آپ کے خونِ اطہر اور اپنے خون کا قصاص طلب کر سکوں۔

"ثار اللّٰہ" کا مفہوم

سوال ۳۰

مجھے ایک عیسائی کے ساتھ تثلیث کے مسئلے پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تو اس نے مجھ سے کہا: جس طرح سے تم امام حسینؑ کو اللہ کا خون اور خونِ خدا کا فرزند کہتے ہو اسی طرح سے ہم حضرت مسیحؑ کو اللہ کا فرزند کہتے ہیں۔

میں نے اس سے کہا: ایسا ہرگز نہیں ہے ہم مذکورہ الفاظ اظہار شرف اور مجاز کے طور پر کہتے ہیں جبکہ تم حضرت مسیحؑ کو مجازاً ابن اللہ نہیں کہتے۔ تم حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا حقیقی فرزند تصور کرتے ہو اور اللہ کو مجسم مانتے ہو۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائیں۔

جواب

"ثار" کے معنی ہیں ناحق خون کا بدلہ لینا اور امام حسینؑ کی زیارت میں ہم یہ الفاظ کہتے ہیں: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ثَارَ اللّٰهِ وَ ابْنَ ثَارِهِ. "ہمارا آپ پر سلام ہو آپ کے خون اور آپ کے والد کے خون کا قصاص لینا اللہ کے سپرد ہے۔"

حضرت امام حسینؑ اللہ کے عبد خاص ہیں اور خلق خدا میں انہیں اللہ سے خصوصی مقام قرب حاصل ہے اسی لئے ان کے قصاص کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی اور یہ کہا گیا: "اس ذات کو ہمارا سلام پہنچے جس کے خون کا وارث خود خدا ہے۔"

کیونکہ امام عالی مقام کا خون صرف اس لئے بہایا گیا کہ آپ دین خداوندی کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور کلمہ ء توحید کی سربلندی کے خواہشمند تھے اور قول و فعل سے کلمہ کفر کے مخالف تھے اور اسی راستے کو قائم رکھنے کے لئے آپ نے اپنی اور اپنے اصحاب کی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ "ثار" سے آپ کا بہتا ہوا خون اطہر ہی مراد ہو اور اس کی اللہ کی طرف نسبت اظہار شرف کے اعتبار سے ہو کیونکہ نسبت حقیقی تو بہر صورت محال ہے کیونکہ اللہ جسم و جسمانیات سے منزہ ہے اور یوں حضرت کے خون کی اللہ کی طرف نسبت کمالِ قرب کی طرف اشارہ ہو اور اس سے حضرت کی عظمت و شرف کا اظہار مقصود ہو۔ جس طرح سے مسجد کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے اور حضرت صالحؑ کی ناقہ کو ناقۃ اللّٰہ سے تعبیر کیا گیا، اسی طرح سے اظہار شرف کے لئے امام مظلوم کے خون کا انتساب اللہ کی طرف کیا گیا ہے۔

واضح ہوا کہ اگر لفظ "ثار" سے خون ہی مراد لیا جائے اور اس کی اللہ کی طرف نسبت اظہار شرف کی وجہ سے ہوگی تو یوں یہ نسبت مجازی ہوگی اور کبھی بھی حقیقی نسبت نہ ہوگی کیونکہ کائنات کا کوئی بھی فرد اس نسبت کو حقیقی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے جیسا کہ صفات سلبیہ میں ہی یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ اللہ اجزا سے مرکب نہیں ہے اور کوئی بھی مسلمان خونِ حسینؑ کو اللہ کا جزو تسلیم نہیں کرتا۔ لہذا جب بھی کوئی مسلمان "ثار اللّٰہ" کے الفاظ کہتا یا سنتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہیں بلکہ اس سے مجازی معنی مراد ہیں جس کا مقصد صرف عظمت و شرف کا اظہار ہے۔

مسیحؑ کسی طور بھی ابن اللہ نہیں ہیں

اور اس کے برعکس حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ کہنا ہر لحاظ سے غلط ہے کیونکہ مسیحؑ کے لئے ابن اللہ کے الفاظ نہ حقیقتاً درست ہیں اور نہ ہی مجازاً درست ہیں۔ ابن کا حقیقی مفہوم یہ ہے: "کسی شخص کے نطفہ سے پیدا ہونے والا بیٹا۔" اور حضرت مسیحؑ کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا سراسر گمراہی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں رہنے والا کوئی بھی عیسائی حضرت مسیحؑ کو حقیقی معنوں میں ابن اللہ ماننے پر تیار نہیں ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مسیحؑ حقیقی فرزند خدا نہیں ہیں بلکہ مجازاً فرزند خدا ہیں اور مجازی فرزند کی تعریف یہ کی جائے کہ کسی ذات کی شبیہ اور مماثل ذات کو اس کا فرزند کہا جاتا ہے اور حضرت مسیحؑ اللہ کی شبیہ اور مماثل ہیں۔ لہذا انہیں ابن اللہ کہا جاتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

ہم کہیں گے کہ اس لحاظ سے بھی حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ کہنا غلط ہے کیونکہ اگر "ابن" سے شبیہ اور مماثل کا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت مسیحؑ کسی طور پر بھی اللہ کے مشابہ نہیں ہیں کیونکہ اللہ خالق ہے اور مسیحؑ مخلوق ہیں۔ اللہ واجب الوجود ہے اور مسیحؑ ممکن الوجود ہیں۔ لہذا خالق و مخلوق اور واجب و ممکن میں مشابہت کیسی اور مماثلت کہاں کی؟

دنیا کا کوئی بھی عیسائی اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسیحؑ شکم مادر میں قیام پذیر رہے اور حضرت مریمؑ نے انہیں جنم دیا اور انہوں نے ان کی پرورش بھی کی اور وہ کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے بھی تھے اور ان پر وہ تمام عوارض طاری ہوتے تھے جو کسی بھی انسان پر طاری ہوتے ہیں۔ جیسے کھانا، پینا، بھوک، خوشی، غم، لذت، الم، نیند، تھکاوٹ، راحت اور انہی کی مثل دیگر چیزیں۔ (اسی لئے انہیں مجازاً بھی "ابن اللہ" کہنا درست نہیں ہے۔)

اب اگر اس مقام پر کوئی عیسائی یہ کہے کہ ہم انہیں اس لئے "ابن اللہ" کہتے ہیں کہ دنیا میں ان کا کوئی والد نہیں تھا اور انہوں نے بہت سے معجزات دکھائے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ حضرت عیسیٰؑ کا تو والد نہیں تھا اور وہ والد کے بغیر اللہ کی قدرت کاملہ سے پیدا ہوئے تو عیسائیوں نے انہیں ابن اللہ کہہ دیا جبکہ حضرت آدمؑ کا نہ تو والد تھا اور نہ ہی والدہ تھی مگر اس کے باوجود انہیں آج تک کسی نے ابن اللہ نہیں کہا۔

اگر معجزات کی وجہ سے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہنے پر بضد ہیں تو معجزات صرف ان سے ہی ظاہر نہیں ہوئے تھے دوسرے انبیائے کرامؑ سے بھی معجزات صادر ہوئے تھے مگر ان کے پیروکاروں نے ان کے معجزات دیکھ کر بھی انہیں ابن اللہ نہیں کہا تو آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہنے کی کیا تک ہے؟ جبکہ اناجیل میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو آدمی اور فرزند آدم کہا ہے اور کسی مقام پر بھی حضرتؑ نے اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی ان کا تمام تر پیغام یہ تھا کہ اللہ کی عبادت کرو۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ... (النساء ۱۷۲) "مسیحؑ کو اللہ کا بندہ کہلانے میں کوئی شرم نہیں ہے۔"

اور اگر کوئی عیسائی یہ کہے کہ ہم مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ ان کے شرف و عظمت کے اعتبار سے کہتے ہیں تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات بالکل جھوٹ ہے کیونکہ عیسائی صرف عظمت و شرف کے اظہار کے لئے مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا نہیں کہتے بلکہ انہوں نے اس طرح کی خود ساختہ روایات اناجیل میں شامل کر رکھی ہیں جو ان کے مذکورہ بالا دعویٰ کو جھوٹا ثابت کرتی ہیں اور ان خودساختہ روایات کا ہلکا سا نمونہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں: "انجیل یوحنا میں ہے کہ مسیحؑ نے فلپس سے کہا: کیا تو یقین نہیں کرتا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے؟ یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے، میرا یقین کرو کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں۔ نہیں تو میرے کاموں ہی کے سبب سے میرا یقین کرو۔" (یوحنا باب ۱۴۔ آیت ۱۰۔۱۱)

اور یوحنا کے باب دہم میں مسیحؑ کے یہ الفاظ ہیں: "میں اور باپ ایک ہی ہیں۔"

لہذا عیسائیوں کے مذکورہ الفاظ دیکھ کر انسان اس فیصلے پر پہنچتا ہے کہ عیسائی

حضرت مسیحؑ کو صرف اظہار شرف کے لئے ابن اللہ نہیں کہتے بلکہ جب بھی وہ ابن اللہ کے الفاظ کہتے ہیں تو اس سے حلول و اتحاد مراد لیتے ہیں اور ویسے بھی اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا روح القدس) کے خودساختہ نظریہ کی موجودگی میں عیسائی ابن اللہ کے الفاظ اظہار شرف کے لئے کبھی نہیں کہہ سکتے۔

اس تمام تر وضاحت سے ثابت ہوا کہ عیسائیوں کا حضرت مسیحؑ کو ابن اللہ کہنا اور شیعوں کا امام حسینؑ کو ثار اللہ کہنا ہرگز یکساں نہیں ہے کیونکہ ثار اللہ کے الفاظ اول و آخر مجاز پر محمول ہیں جبکہ عیسائیوں کے ابن اللہ کے الفاظ مجاز پر محمول نہیں ہیں دونوں میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ جملوں کو کسی بھی صورت میں مساوی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو غسل کس نے دیا تھا؟

سوال ۳۱

کیا امام علی رضا علیہ السلام نے اپنے والد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو غسل دیا تھا؟ اس سلسلے میں اگر کوئی روایت مرقوم ہے تو بیان فرمائیں جبکہ مشہور یہ ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو حضرت احمد بن موسیٰ کاظمؑ نے جو کہ امام علی رضاؑ سے بڑے تھے غسل دیا تھا۔ آیا اس بات کی روایت سے تائید ہوتی ہے؟

جواب

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو سلیمان نے کہ آپ کے چچاؤں کے بیٹوں میں تھا، غسل دلایا تھا اور اس نے ہی آپ کو کفن دلایا اور اسی نے ہی آپ کو دفن کرایا تھا۔ اور امام علی رضاؑ طے الارض کر کے بغداد تشریف

لے آئے تھے اور ان تمام کاموں میں شریک تھے۔ البتہ مصلحت امامت کے تحت انہیں بغداد میں کسی نے نہیں پہچانا تھا۔

بحارالانوار کی گیارہویں جلد میں امام رضاؑ سے واقفیہ[1] پر احتجاج کے ذیل میں ہے کہ علی بن حمزہ نے آپؑ سے عرض کیا کہ آپؑ کے آبائے طاہرین سے ہم نے یہ بات سنی ہے کہ امام کے امور تدفین کا متولی امام ہی ہوتا ہے۔

(مذکورہ جملے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ آپ مدینہ میں تھے جبکہ آپ کے والد کی وفات آپ کے خیال کے مطابق بغداد میں ہوئی اور ان کی تجہیز و تکفین میں آپ موجود نہ تھے تو آپ امام ہی نہیں ہیں)۔

امام علی رضاؑ نے فرمایا: کیا حسین بن علی علیہما السلام امام تھے؟

علی بن حمزہ نے کہا: جی ہاں وہ امام تھے۔

امام علی رضاؑ نے فرمایا: ان کی تدفین کس نے کرائی؟

علی بن حمزہ نے کہا: ان کی تدفین ان کے فرزند علی بن الحسینؑ نے کرائی۔

امام علی رضاؑ نے فرمایا: مگر اس وقت تو امام زین العابدینؑ ابن زیاد کی قید میں تھے، وہ کربلا کیسے پہنچے؟

علی بن حمزہ نے کہا: امام سجاد اعجاز امامت سے کربلا پہنچے تھے اور ابن زیاد کو اس کا پتہ نہیں چلا تھا۔

امام علی رضاؑ نے فرمایا: جس خدا نے امام سجاد کو کوفہ سے کربلا پہنچنے کی طاقت عطا کی تھی اسی نے اس دور کے صاحب الامر کو بھی بغداد پہنچنے کی طاقت عطا فرمائی تھی جبکہ امام سجاد تو قیدی تھے اور اس دور کا صاحب الامر قیدی بھی نہیں ہے۔

۱۔ فرقہ واقفیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات ہی نہیں ہوئی وہ صرف ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوئے ہیں اور قربت قیامت کے وقت وہ ظہور کریں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ یہ فرقہ امام علی رضاؑ کی امامت کا منکر تھا۔ (من المترجم عفی عنہ)

حضرت احمد بن موسیٰ کاظم کے فرزند اکبر ہونے کی روایت نظر قاصر سے نہیں گزری اور کتب رجال وانساب میں انھیں کہیں بھی امام ہفتم کا بڑا بیٹا نہیں لکھا گیا۔

آیت تطہیر کے مصداق کون ہیں؟

سوال ۳۲

سورۂ احزاب میں ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا. (الاحزاب ۳۳)

"اے اہلبیتؑ! بس اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے ہر ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک وپاکیزہ رکھے جو پاک وپاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔"

برادران اہلسنت کہتے ہیں کہ اس آیت کا سیاق و سباق ازواج پیغمبرؐ کے لئے ہے۔ اسی لئے آیت تطہیر بھی ازواج کے حق میں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

آیت تطہیر ۳۳ ویں آیت کا ایک حصہ ہے اور پوری آیت یہ ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتِينَ الزَّكَاةَ وَأَطِعْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا.

"اور تم اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور پہلی جاہلیت جیسا بناؤ سنگھار نہ کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اے اہلبیتؑ!

بس اللہ کا یہی ارادہ ہے کہ وہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک وپاکیزہ رکھے جو پاک وپاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔"

آیت بالا دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا حصہ ازواج سے خطاب پر مبنی ہے اور اس کا دوسرا حصہ اہلبیت سے خطاب پر مشتمل ہے جو حضرت محمدؐ، علی و فاطمہ، حسن و حسین علیہم السلام ہیں (آیت کے پہلے حصے میں جمع مونث حاضر کی ضمیریں استعمال کی گئی ہیں۔) اور یہاں ضمیر جمع مذکر "عنکم" سے خطاب کیا گیا ہے۔

(ہاں یہ سچ ہے کہ یہ آیت ازواج کے تذکرہ کے ذیل میں وارد ہوئی ہے مگر قرآن مجید کے طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ سیاق آیات سند نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ قرآن باقاعدہ کوئی تالیف و تصنیف نہیں ہے کہ اس میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ اس میں ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں ایک تذکرہ کے وسط میں دوسرا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر بات پلٹ کر وہیں پہنچ جاتی ہے۔ از مترجم)

دوسری بات یہ ہے کہ آیت تطہیر کا عنوان اہلبیت ہے جو ازواج اور نساء سے الگ عنوان ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ روایات صریحہ اور صحیحہ کے ہوتے ہوئے سیاق سے استدلال کرنا عقل و منطق کے خلاف ہے۔

آیت تطہیر ہر چند ازواج سے خطاب سے متصل ہے لیکن یہ حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں نازل ہوئی تھی۔ صاحب غایۃ المرام نے کتب اہلسنت سے اکتالیس اور کتب شیعہ سے چونتیس روایات نقل کی ہیں اور تمام روایات کا خلاصہ یہی ہے کہ آیت تطہیر علیحدہ نازل ہوئی اور یہ اہلبیت سے مخصوص ہے جو پانچ نفر ہیں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

(صحیح مسلم ج ۲۔ ق ۲۔ ص ۱۱۶ طبع ۱۳۴۸ھ میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب رسول خداؐ نے زیر کساء علیؑ اور

فاطمہؑ اور حسنینؑ کو جمع کر لیا تھا۔ یہی بات صحیح ترمذی اور مسند احمد میں بھی پائی جاتی ہے بلکہ تفسیر طبری میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ جناب ام سلمہؓ نے زیر کساء آنے کی درخواست کی تو رسول اکرمؐ نے فرمایا: تمہارا انجام بخیر ہے لیکن چادر میں تمہاری گنجائش نہیں ہے۔ مترجم)

ابن صباغ مالکی نے فصول المہمہ میں اور واحدی نے اسباب النزول میں اپنی سند سے حضرت ام سلمہؓ زوجہ پیغمبر اکرمؐ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص) كَانَ فِیْ بَیْتِهَا فَاَتَتْهُ فَاطِمَةُ بِبُرْمَةٍ فِیْهَا حَرِیْرَةٌ فَقَالَ لَهَا ادْعِیْ زَوْجَكِ وَ ابْنَیْكِ. قَالَتْ: اُمُّ سَلَمَةَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَجَلَسُوْا یَاْكُلُوْنَ مَعَهٗ وَهُوَ عَلٰی مَنَامَةٍ لَهٗ عَلٰی دُكَّانٍ تَحْتَهٗ كِسَاءٌ خَیْبَرِیْ قَالَتْ: وَاَنَا اُصَلِّیْ فِی الْحُجْرَةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی "اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا" قَالَتْ: فَاَخَذَ فَضْلَ الْكِسَآءِ فَغَشَّاهُمْ بِهٖ ثُمَّ اَخْرَجَ یَدَهٗ فَاَلْوٰی بِهَا اِلَی السَّمَآءِ ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَیْتِیْ وَ خَاصَّتِیْ فَاذْهَبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَ طَهِّرْهُمْ تَطْهِیْرًا قَالَتْ فَاَدْخَلْتُ رَاْسِیَ الْبَیْتَ فَقُلْتُ وَ اَنَا مَعَكُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ اِنَّكِ اِلٰی خَیْرٍ اِنَّكِ اِلٰی خَیْرٍ. (الفصول المهمه ص۳۰۵ چاپ النعمان و اسباب النزول ص۲۹۹)

"ایک مرتبہ جبکہ رسول خداؐ میرے گھر میں تھے، حضرت فاطمہؑ ایک پتھر کی ہانڈی لے کر آئیں جس میں دودھ، گھی اور آٹے سے تیار کیا ہوا کھانا تھا۔ رسول خداؐ نے فرمایا: اپنے شوہر اور بیٹوں کو بلا لاؤ۔ چنانچہ تمام حضرات آئے اور رسول خداؐ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ رسول خداؐ اپنے گدے پر بیٹھے تھے جس کے نیچے خیبری چادر تھی اور میں اس وقت کمرے میں نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم

تطھیرا" کی آیت نازل فرمائی۔ رسول خداؐ نے چادر کے حصے کو پکڑ کر ان پر چادر پھیلائی اور اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کر کے کہا: پروردگار! یہ میرے اہلبیت اور خاص افراد ہیں ان سے ناپاکی کو دور رکھ اور انہیں اس طرح سے پاک و پاکیزہ رکھ جیسا کہ پاکیزگی کا حق ہے۔ اس وقت میں نے حجرے سے سر اٹھا کر کہا: یارسول اللہؐ! کیا میں بھی آپؐ کے ساتھ شامل ہوں؟ تو رسول خداؐ نے فرمایا: تمہارا انجام بخیر ہے۔ تمہارا انجام بخیر ہے۔"

ابو نعیم کی روایت میں اسی طرح ہے کہ ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: یارسول اللہؐ! کیا میں اہلبیت میں نہیں ہوں؟ رسول خداؐ نے فرمایا: تم راہ خیر پر ہو، تم ازواج پیغمبر میں ہو۔

"رجس" سے معنوی نجاست اور روحانی آلودگی اور قلب کی دوسری بیماریاں مثلاً کفر، شرک، نفاق، تکبر، خودپسندی، حسد اور دیگر اخلاق رذیلہ مراد ہیں جو تنگی سینہ سے پیدا ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آیت تطہیر میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رجس کے جتنے بھی ارکان ہیں وہ سب کے سب اہلبیت سے دور ہیں اور رجس کی بجائے اللہ نے انہیں طہارت عطا کی ہے جس میں تمام فضائل عالیہ شامل ہیں۔ اللہ نے اہلبیت کو تنگی سینہ سے محفوظ رکھا اور اس کی بجائے سینہ کی وسعت عطا کی اور روح کی بلندی عطا کی۔ اللہ نے ان ذوات عالیہ کو عظمت نفس، صفائے باطن، حقیقت بینی عطا کی ہے اور انہیں ہر قسم کی آلودگی اور کج روی اور سرکشی سے محفوظ رکھا ہے اور اسی چیز کو عصمت کہا جاتا ہے اور نبوت و امامت کے لئے عصمت پہلی شرط ہے۔

(الغرض آیت تطہیر اہلبیت کی عصمت و طہارت کو ظاہر کرتی ہے اور اگر اہلسنت کی یہ بات مان لی جائے کہ اس آیت میں ازواج شامل ہیں تو خدارا ہمیں بتایا جائے کہ کیا خود اہلسنت ازواج کو معصوم مانتے ہیں؟ اور اگر کوئی شخص خواہ مخواہ کی

ضد بھی کرنا چاہے اور ان کے لئے مقام عصمت کا دعویٰ کرے تو ہم کہیں گے کہ اگر ازواج معصوم تھیں تو سورۂ تحریم کی آیات کی مخاطب کون تھیں؟ مترجم)

اہلسنت میں سے اکثر علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ آیت تطہیر خمسہ نجباء کے ساتھ مخصوص ہے البتہ عکرمہ و مقاتل اور عروہ بن زبیر جیسے افراد کا قول یہ ہے کہ آیت تطہیر ازواج پیغمبرؐ کے حق میں نازل ہوئی۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری نظر میں عکرمہ، مقاتل اور عروہ کی روایت کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ خود اہلسنت علماء نے ان کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ تینوں امیرالمومنین علیہ السلام کے دشمن تھے اور حضرت امیرؑ پر تہمت و دروغ گوئی سے پرہیز نہیں کرتے تھے جبکہ مذکورہ افراد کے مقابلے میں حضرت ام سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ کی یہ وضاحت موجود ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے آیت تطہیر میں ازواج کو شامل نہیں کیا۔

اگر اس بحث کے متعلق یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ آیت ازواج کے تذکرہ کے ذیل میں نازل ہوئی ہے لہذا اس سے ازواج مراد ہیں تو اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ آیات کا سیاق اور نظم اس وقت حجت ہوتا ہے جب اگلے اور پچھلے جملے میں لفظی اور معنوی مغائرت نہ پائی جاتی ہو اور آیت تطہیر میں یہ دونوں فرق موجود ہیں:

۱۔ جن آیات میں ازواج کو مخاطب کیا گیا وہاں تمام ترمؤنث کے صیغے استعمال کئے گئے اور جس آیت میں اہلبیت سے خطاب کیا گیا وہاں مذکر کے صیغے استعمال کئے گئے۔

۲۔ جب تک ازواج سے خطاب جاری رہا اس میں عتاب اور تہدید موجود تھی اور جب اہلبیت سے خطاب ہوا تو اس میں شفقت و عظمت جھلکنے لگی۔ یہ واضح فرق اس بات کی دلیل ہے کہ آیت کے شروع اور آخر کے مخاطب ایک نہیں ہیں۔

۳۔ علاوہ ازیں ستر سے زیادہ روایات صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت تطہیر پنجتن پاک کے حق میں نازل ہوئی۔ نیز ان تمام روایات کی روشنی میں یہ ثابت ہے کہ آیت تطہیر صدر آیت سے جداگانہ نازل ہوئی تھی۔

(پیغمبر اکرمؐ آیت تطہیر کے نزول کے بعد مسلسل چھ ماہ تک ہر نماز کے وقت حضرت علیؑ و بتولؑ کے دروازے پر آتے تھے اور آیت تطہیر کی تلاوت کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اپنے چھ ماہ کے مسلسل عمل سے تمام اہل ایمان کو یہ درس دیا کہ مصداق تطہیر یہی گھرانہ ہے ان کے علاوہ کوئی گھرانہ تطہیر کا وارث نہیں ہے۔ مترجم)

بحث معاد (قیامت)

کیا جانور اور پرندے بھی قیامت میں اٹھائے جائیں گے؟

سوال ۴۳

قیامت کے دن انسانوں کا اٹھنا تو یقینی ہے۔ آیا جانور اور پرندے بھی قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے؟ اور اس ضمن میں یہ بھی واضح کریں کہ روح باقی رہنے والی چیز ہے تو پرندوں اور جانوروں کی روح کا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟

جواب

عالم آخرت اور اس کی تفصیلات کا تعلق بنیادی طور پر مابعد الطبیعات سے ہے اور اس کے علم کا ذریعہ صرف وحی ہے اور عالم آخرت کی اطلاعات کا ماخذ قرآن مجید اور ذوات قدسیہ کی احادیث ہیں اور ان میں حیوانات و طیور کی بظاہر تفصیل نظر نہیں آتی۔ اسی لئے اس کے متعلق اجمالی اعتقاد ہی کافی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے: وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ. (التکویر ۵)

"اور جس وقت جانوروں کو اکٹھا کیا جائے گا۔"

اس آیت مجیدہ کے متعلق کچھ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت مجیدہ میں قیامت سے پہلے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ قیامت سے قبل جانوروں کو

جنگلوں اور صحراؤں سے نکال کر ایک مقام پر جمع کیا جائے گا۔

اور قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ارشاد خداوندی ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طَائِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ مَافَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ. (الانعام ۳۸)

"اور زمین میں کوئی بھی رینگنے والا یا دونوں پروں سے پرواز کرنے والا طائر ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر تمہاری طرح کی جماعت نہ رکھتا ہو۔ ہم نے کتاب میں کسی شے کے بیان میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ اس کے بعد سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔"

مذکورہ بالا دونوں آیات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حیوانات کو محشور کیا جائے گا لیکن ان کے حشر و نشر کی تفصیل اور ان کے انجام کا قرآن مجید میں کہیں تذکرہ موجود نہیں ہے اور اسی طرح سے کسی مستند روایت میں بھی اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اسی لئے حیوانات کے محشور ہونے کا اجمالی عقیدہ ہی کافی ہے۔

علامہ مجلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب حق الیقین میں چند روایات نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا: آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحوش کو محشور کیا جائے گا اور وہ بارگاہِ احدیت میں اپنے اوپر روا رکھے جانے والے ظلم و ستم کی شکایت کریں گے۔ اس کے علاوہ کچھ اور جانوروں کو دیگر مصلحتوں کی وجہ سے محشور کیا جائے گا اور کچھ جانور مثلاً ناقہ صالحؑ، اصحاب کہف کا کتا، حضرت یوسفؑ کا بھیڑیا اور بلعم باعور کا گدھا جنت میں جائیں گے۔ مگر تمام جانوروں کا محشور ہونا روایات سے ثابت نہیں ہوتا۔ اسی لئے اکثر شیعہ متکلمین نے اس موضوع پر اجمالی گفتگو کی ہے اور کسی نے بھی اس کی جزئیات کا تذکرہ نہیں کیا۔

تفسیر منہج میں مذکور ہے کہ وحوش کو محشور کیا جائے گا اور قصاص و عوض

کے بعد انہیں خاک میں ملادیا جائے گا۔ پھر کوئی جانور عرصہ محشر میں دکھائی نہ دے گا۔ البتہ کچھ جانوروں کو بنی آدم کی خوشی کیلئے زندہ رکھا جائے گا۔ مثلاً مور اور کچھ دوسرے پرندوں کو زیبائی کی خاطر باقی رہنے دیا جائے گا مگر صحیح ترین اور مشہور قول یہ ہے کہ کوئی بھی جانور باقی نہیں رہے گا۔ البتہ ملائکہ اور جنات و شیاطین کے متعلق ثابت ہے کہ وہ محشور ہوں گے اور ملائکہ جنت میں جائیں گے اور جنات میں سے اہل ایمان جنت اور کافر دوزخ میں جائیں گے۔

البتہ سوال یہ ہے کہ جو جنات بہشت میں داخل ہوں گے تو کیا ان کو بھی بنی آدم جیسا مقام ملے گا یا کچھ فرق ہوگا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ انہیں جنت میں بنی آدم کی بہ نسبت پست مقام ملے گا اور بعض علماء کہتے ہیں کہ انہیں جنت و دوزخ کے بیچ مقام اعراف میں ٹھہرلیا جائے گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قول اول زیادہ صحیح ہے کیونکہ سورۂ رحمٰن میں جنت اور نعمات جنت کے متعلق انسانوں اور جنات دونوں کو یکساں مخاطب کیا گیا ہے۔

"مستضعف" کون ہیں؟

سوال ۳۴

"مستضعف" کون ہیں اور ان کے حشر اور جزا کی کیفیت کیا ہوگی؟

جواب

ہم عدل کے زیر عنوان سوال ششم میں اس مسئلہ کو بیان کر چکے ہیں۔ البتہ یہاں مزید وضاحت کے لئے علامہ مجلسیؒ کی کتاب حق الیقین سے ایک اقتباس پیش

کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

اس مسئلے کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ دلائل عقل و نقل اور قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ حق تعالیٰ عادل ہے اور وہ ظلم و جور سے پاک ہے۔ اسی لئے خداوند عالم اپنے عدل کی وجہ سے چھوٹے بچے اور پاگل افراد اور ایسے لوگ جن پر حجت تمام نہیں ہوئی انہیں بغیر کسی حاجت کاملہ کے عذاب نہیں دے گا۔ ایسے افراد کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یا تو عقل دے کر ان کی آزمائش کرے گا اور پھر اس آزمائش کے بعد ان کی جزاو سزا کا فیصلہ کرے گا یا پھر جنت و جہنم کے درمیان انہیں مقام اعراف میں جگہ عنایت فرمائے گا یا پھر انہیں جنت کے پست مقام میں رہائش عطا کرے گا۔

ثقۃ الاسلام کلینی نے ایک حدیث صحیح میں زرارہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ جو بچے بلوغت سے قبل مر جاتے ہیں ان کا انجام کیا ہوگا؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ سے ان کے متعلق پوچھا گیا تھا تو آپ نے فرمایا تھا کہ ان کے متعلق اللہ بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے بڑے ہو کر کیا کرنا تھا۔ پھر امامؑ نے فرمایا: ان کو علم خدا کے سپرد کردو۔ یہ سب خدا کی صوابدید پر منحصر ہے چاہے توان سے عدل کا سلوک کرے اور چاہے تو ان سے فضل کا معاملہ کرے۔"

ایسے افراد کے متعلق بعض روایات میں مذکور ہے کہ یہ اہل بہشت کی خدمت کریں گے اور انہیں وہ خدمت دشوار محسوس نہ ہوگی اور وہ اہل بہشت کی خدمت بجالا کر لذت محسوس کریں گے۔ جیسا کہ ملائکہ خدمت بجالا کر لذت محسوس کرتے ہیں۔

اس مقام پر ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ مستضعفین کے متعلق ہے اور مستضعفین میں ایسے بچے شامل ہیں جن کے والدین مومن

نہ ہوں اور مومنین کے نابالغ بچوں کے متعلق اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی خوشیوں کو دوبالا کرنے کی غرض سے ان کے بچوں کو جنت میں ان سے ملحق کر دیگا۔

الکافی، من لایحضرہ الفقیہ اور کتاب التوحید میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ مومنین کے کم سن بچے اگرچہ عمل میں قاصر تھے کیونکہ وہ مکلف نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے والدین کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر انہیں ان کے والدین سے ملحق کر دے گا۔

آکل وما کول کا حشر نشر اور ثواب و عقاب

سوال ۳۵

آکل وما کول کے حشر نشر اور ثواب و عقاب کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

بعض منکر معاد فلاسفہ نے قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے پر آکل و ماکول کی بحث کی تھی اور بزعم خود معاد جسمانی کو غیر منطقی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی ان کی دلیل کا ماحصل یہ ہے:

ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک انسان نے دوسرے انسان کو کھالیا اور وہ اس کا جزو بدن بن گیا۔ اب اگر قیامت کے دن اللہ کھانے والے کو اس کے پورے اجزائے بدن کے ساتھ محشور کرے تو صرف کھانے والا ہی محشور ہو سکے گا اور جسے اس نے کھایا تھا وہ ہرگز محشور نہ ہو سکے گا کیونکہ وہ تو اس کا جزو بدن بن چکا تھا۔ اور اگر اللہ اسے محشور کرے جسے دوسرے نے کھالیا تھا تو کھانے والا شخص پورا محشور نہ ہو سکے گا کیونکہ اس سے اس کا جزو بدن تو علیحدہ کر لیا گیا ہے۔

اسی سوال کو مذکورہ منکرین معاد نے دوسرے رنگ میں یوں پیش کیا ہے:

ابتدائے عمر سے لیکر انتہائے عمر تک انسانی اجزاء میں تغیر و تبدل کا عمل جاری رہتا ہے تو قیامت کے دن جب انسان محشور ہوگا تو کیا تحلیل شدہ اجزاء سمیت محشور ہوگا یا صرف ان اعضاء کے ساتھ محشور ہوگا جو مرنے کے وقت اسکے ساتھ تھے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ وہ تحلیل شدہ تمام اجزا کے ساتھ محشور ہوگا تو پھر ہر محشور ہونے والا شخص ایک پہاڑ کی مانند دکھائی دے گا جو کہ انتہائی مضحکہ خیز ہے اور پھر اس میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ انسان کے تحلیل شدہ اجزا اس کی زندگی میں ہی مختلف شکل و صورت اختیار کر چکے تھے۔ مثلاً ایک شخص کے فضلے نے خاک کی صورت اختیار کرلی اور پھر اس خاک نے گھاس کی صورت اختیار کرلی اور وہ گھاس کسی جانور کی غذا بن گیا اور پھر وہ جانور کسی انسان کی غذا بن کر اس کا جزو بدن بن گیا تو اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ہر انسان اپنے تحلیل شدہ اجزا کے ساتھ محشور ہوگا تو اس کے اجزا تو کئی صورتیں بدلنے کے بعد کسی دوسرے انسان کے اجزا بن چکے ہوں گے تو کیا وہ اجزا جو کسی دوسرے انسان کے اجزا میں بدل چکے ہوں گے وہ اس سے علیحدہ کر کے پہلے انسان میں ضم کر دیئے جائیں گے اور اسے محشور کیا جائے گا؟

اور اگر بالفرض ایسا مان بھی لیا جائے تو اس سے پہلا انسان تو اپنے تحلیل شدہ اجزا کے ساتھ محشور ہو جائے گا دوسرا انسان اپنے اجزائے اصلی کے بغیر کیسے محشور ہوگا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف اپنے ان اجزا کے ساتھ محشور ہوگا جو موت کے وقت اس کے ہمراہ تھے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ذریعے سے یہ ممکن ہے کہ اس نے تحلیل شدہ اجزا کے ساتھ عبادت کی ہو اور جن اجزا کو وہ لے کر مرا ہو ان اجزا کے ساتھ اس نے خدا کی نافرمانی کی ہو یا اس کے برعکس بھی معاملہ

ممکن ہے تو اب اگر اللہ اس شخص کو ثواب دینا چاہے تو ثواب کا لطف تو اس کے وہ اجزا اٹھائیں گے جنہوں نے معصیت کی تھی اور اطاعت کرنے والے اجزا تو ثواب سے محروم رہ جائیں گے اور یوں غیر مستحق فائدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھنا سرے سے ہی غیر منطقی ہے۔ انتھیٰ قولھم۔

فلاسفہ اسلام نے منکرین معاد کے اس سوال کا ہر دور میں جواب دیا ہے اور ان فلاسفہء اسلام میں خواجہ نصیر الدین طوسی کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "تجرید الکلام" میں اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھا: "ولا یجب اعادة فواضل المکلف۔"

محقق علیہ الرحمہ کے اس فرمان کی توضیح یہ ہے:

ہر انسان میں کچھ اجزائے اصلیہ موجود ہوتے ہیں جو عمر کے ابتدائی حصے سے لے کر آخری سانسوں تک اس کے ساتھ قائم رہتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ہر انسان میں کچھ زائد اجزا ہوتے ہیں جو کہ ہمیشہ تحلیل ہوتے رہتے ہیں اس کا اندازہ ہم ایک لاغر بیمار شخص کو دیکھ کر کر سکتے ہیں اور ہمیں بخوبی محسوس ہو سکتا ہے کہ اس کے کتنے اجزائے تحلیلی اس سے رخصت ہو چکے ہیں اور قیامت کے دن ہر شخص اپنے اجزائے اصلیہ کے ساتھ محشور ہوگا اور تحلیل ہونے والے اجزا کے ساتھ محشور نہیں ہوگا۔ اسی لئے اگر بالفرض ایک انسان دوسرے انسان کو کھا جائے تو کھائے جانے والے شخص کے اجزائے اصلیہ جدا جدا ہیں اور اجزائے اصلیہ نہ تو زندگی کے کسی حصے میں تحلیل ہوتے ہیں اور نہ ہی ان میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اور قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا تو ہر شخص اپنے اجزائے اصلیہ کے ساتھ محشور ہوگا خواہ اس کے اجزائے اصلیہ ایک

مقام پر ہوں یا منتشر ہو چکے ہوں اور اگر مرنے والے کے اجزائے اصلیہ منتشر ہو چکے ہوں گے تو بھی وہ اللہ کے علم میں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت شاملہ سے ان منتشر اجزا کو یکجا کرے گا اور اسے عرصہ محشر میں محشور فرمائے گا۔

ثوابِ اعمال

سوال ۳۶

بعض اعمال کا بہت زیادہ ثواب بیان کیا گیا ہے۔ جسے انسانی ذہن تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس ثواب سے آخر استفادہ کیسے کیا جائے گا۔ مہربانی فرما کر اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

انسان بہت سی وجوہات کی بنا پر مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان عالم برزخ اور عالم آخرت کا اپنی اسی موجود دنیا سے موازنہ کرنے لگ جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ عالم آخرت بھی اسی عالم کی طرح سے ہے۔ اسی لئے وہ عالم آخرت کی بہت سی باتوں کو حقیقت سے دور سمجھنے لگتا ہے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر عالم کی اپنی علیحدہ علیحدہ وسعت ہے اور ہر عالم کی وسعت و تنگی دوسرے عالم کی وسعت و تنگی کے مساوی نہیں ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جو بچہ رحم مادر میں ہے اگر بالفرض اسے یہ کہا جائے کہ جس مقام پر تو موجود ہے یہ بالکل تنگ ہے اور چند روز بعد تو ایک ایسے عالم میں قدم رکھے گا جو اس سے اربوں گنا بڑا ہے اور اس عالم میں تجھے رہائش کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی اور وہاں تیرا مکان تیرے اس مکان سے لاکھوں گنا وسیع ہوگا

اور اس عالم میں تجھے اپنا نان و نفقہ خود تلاش کرنا ہوگا اور تجھے اپنا لباس بھی خود خریدنا پڑے گا۔ تو کیا رحم مادر میں رہائش پذیر بچے کے لئے یہ تمام ترباتیں انہونی قرار نہ پائیں گی اور کیا وہ ان تمام باتوں کو عقل سے بعید تصور نہ کرے گا؟

یقیناً وہ بچہ ان تمام باتوں کو عقل دشمنی کے تقاضوں پر محمول کرے گا کیونکہ جس دنیا میں وہ مقیم ہے وہ انتہائی تنگ ہے اور وہ اسے اپنے لئے کافی اور وسیع تصور کئے ہوئے ہے۔ تو کیا بچے کے اس طرح سمجھنے سے دنیا کی وسعت سمٹ جائے گی؟

ہرگز نہیں۔ دنیا کی وسعت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ البتہ ہم یہ کہیں گے کہ اس میں اس بچے بے چارے کا بھی قصور نہیں ہے کیونکہ اس نے وسیع و عریض دنیا کو دیکھا ہی نہیں ہے اسے تو اپنی ہی دنیا بڑی نظر آرہی ہے۔ جس طرح سے کنوئیں کا مینڈک سمندر کی وسعت کا تصور نہیں کرسکتا اسی طرح سے اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم عالم برزخ اور عالم آخرت کی وسعت کا بھی تصور نہیں کرسکتے۔ مگر ہمارے تصور نہ کرسکنے کے باوجود اس کی وسعت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اس کی وسعت بدستور قائم و دائم رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ آج عالم طبیعات کے زندان میں محبوس افراد حیران ہو کر کہتے ہیں کہ بہشت کے اتنے لمبے چوڑے محل اور بہشت کے کھانوں کا اتنا لمبا مینو اور شراب طہور اور اتنی کثیر حوروں سے ایک انسان کیسے استفادہ کرسکے گا۔

اس تعجب و حیرانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہماری روح اس جہان میں مقید ہے۔ ابھی تک اسے خود اپنی عظمت اور عالم آخرت کی وسعت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ اسی لئے وہ عالم آخرت کی وسعت کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (سجدہ ۱۷)

"پس کسی نفس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے لئے کیا کیا خنکی چشم کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے جو ان کے اعمال کی جزا ہے۔"

تناسخ (آواگون) کا ابطال

سوال ۳۷

تناسخ کا باطل ہونا ثابت فرمائیں۔

جواب

تناسخ کے ابطال سے قبل تناسخ اور اس کے متعلق مختلف نظریات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

تناسخ سے مراد یہ ہے کہ ایک جسم کے مرنے کے بعد اس کی روح کا دوسرے جسم میں سماجانا اور اس دنیا میں مختلف صورت میں نمودار ہونا۔ اس نظریے کے قائل افراد کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ نسوخیہ: ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہر مرنے والے شخص کی روح کسی دوسرے شخص میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص نیک ہو تو اس کی روح کسی بادشاہ یا وزیر کے جسم میں نمودار ہوگی اور وہ عیش و آرام کرے گا اور اگر کوئی شخص بدکار ہو تو اس کی روح کسی ایسے شخص میں منتقل کردی جائے گی جہاں وہ تمام زندگی ذلت و خواری کا شکار رہے گا۔

۲۔ مسوخیہ: اس گروہ کا خیال ہے کہ انسانی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد جانوروں اور حشرات کے جسم میں منتقل ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص نے دنیا میں اچھے کام کئے ہوں گے تو اس کی روح کسی مفید جانور کے جسم میں داخل ہوگی مثلاً

اس کی روح گھوڑے، گائے، بھینس کے اجسام میں نمودار ہوگی۔ اور اگر کسی نے برے کام کئے ہوں گے تو اس کی روح بدبخت جانوروں کے قالب میں داخل کردی جائے گی مثلاً اسے کتے یا خنزیر کے جسم میں منتقل کردیا جائے گا جہاں وہ اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے گا۔

۳۔ فسوخیہ: اس گروہ کا خیال ہے کہ انسانی روح نباتات اور گھاس پھوس کی صورت میں نیا جنم لیتی ہے۔

۴۔ رسوخیہ: اس گروہ کا خیال ہے کہ انسانی روح جمادات پتھروں وغیرہ کی صورت میں نیا جنم حاصل کرتی ہے۔

مذکورہ چار نظریات کے علاوہ بھی بعض لوگوں نے عجیب و غریب توجیہات پیش کی ہیں جن کے تذکرہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے اور تناسخ کے متعلق ہمارا دوٹوک فیصلہ یہ ہے کہ اس نظریے کی تمام اقسام باطل ہیں۔ کیونکہ:

۱۔ یہ نظریہ دین اسلام بلکہ دیگر تمام آسمانی مذاہب کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے کیونکہ تمام آسمانی مذاہب کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح عالم برزخ میں منتقل ہوتی ہے اور پھر جب قیامت قائم ہوگی تو روح اپنے سابقہ دنیاوی بدن میں نمودار ہوگی جبکہ عقیدہ تناسخ عقیدہ برزخ و قیامت کی نفی پر قائم ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے اعمال کی سزا و جزا اسی دنیا میں نئے جنم کے ذریعے مل جاتی ہے اور جنت و دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ لہذا شرع مقدس کی تمام براہین اس نظریے کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

۲۔ رحم مادر میں جب کوئی جنین چار ماہ کا ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ نفس سے تعلق قائم رکھ سکے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے نئی روح پیدا کردیتا ہے جو کہ اس میں حلول کرلیتی ہے کیونکہ مبدا فیاض ہے اس کے ہاں کوئی کمی نہیں ہے

اس کے فیض سے فیضیاب ہونے کی بس یہی شرط ہے کہ ظرف میں قابلیت اور استعداد ہونی چاہئے۔

اب اگر تناسخ یعنی نئے جسم کے عقیدہ کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر عجیب صورتحال پیدا ہوگی کیونکہ جب کوئی جنین رحم مادر میں روح کے قابل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک مرے ہوئے شخص کی روح کو اس میں داخل کردیتا ہے اور یوں روح کا دو اجسام سے تعلق قائم ہو جاتا ہے اور روح دو اجسام کی متحمل قرار پاتی ہے جبکہ ہر انسان بالبداہت یہ محسوس کرسکتا ہے کہ وہ دو اجسام سے مرکب نہیں ہے وہ ایک ہی جسم سے عبارت ہے۔

۳۔ بدن بتدریج اپنی تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے اور ایک طویل وقت کے بعد مرحلہ کمال پر پہنچتا ہے۔ اسی طرح سے نفس انسانی بھی بدن کے اتصال کی وجہ سے تدریجی طور پر کمال کے مراحل طے کرنے میں مصروف رہتا ہے اور اب فرض کریں کہ ایک کامل العمر شخص پر موت واقع ہوئی تو یقیناً جیسے اس کی عمر کامل تھی اسی طرح سے اس کی روح اور نفس بھی درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور پھر اللہ نے اس درجہ کمال پر پہنچی ہوئی روح کو چار ماہ کے جنین کے جسم میں داخل کردیا تو اس صورت میں ہمارا سوال یہ ہے کہ نفس کامل کو ناقص بناکر بدن ناقص کے ساتھ متحد کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ تناسخ کے ابطال کے لئے اتنے ہی دلائل کافی ہیں۔ اب ہم ذرا دوسرے رخ سے تناسخ کا ابطال کرنا چاہتے ہیں۔ شرح مقدس میں دو قسم کے مسخ بتائے گئے ہیں۔ ایک "مسخ دنیوی" اور دوسرا "مسخ اخروی"۔

"مسخ دنیوی" یہ ہے کہ خداوند عالم نے نوع بشر میں سے ان افراد کو جو باغی ہوگئے تھے، بندگی سے سرکشی کرتے تھے، صفات رذیلہ ان کے باطن میں جڑ پکڑ چکے

تھے اور گمراہ کن ہو چکے تھے تو تمام نوع بشر کی عبرت کے لئے ان کے عذاب میں جلدی کی گئی، ان کی ظاہری صورت میں تبدیلی کردی گئی اور انہیں ان کی باغی خصلتوں کے مطابق بنادیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض بندر، بعض سور اور بعض کتوں کی صورت میں مسخ کردیئے گئے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وجعل منهم القردة والخنازير. (سورۂ مائدہ آیت ۶۰) "اور ان کو بندر اور سور بنادیا گیا۔"

اور اصحاب سبت کے بارے میں فرمایا: فقلنا لهم كونوا قردة خاسئين (سورۂ بقرہ آیت ۶۵) "ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔"

ظاہر ہے کہ "تناسخیہ" جو کچھ کہتے ہیں یہ آیتیں ان کے خلاف جاتی ہیں کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ روح مرنے کے بعد حیوانات کے جسم میں داخل ہوتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے اور قرآن مجید نے جو کچھ بتایا ہے وہ صورت اور ہیئت ظاہری کے تغیر سے عبارت ہے کہ جو گناہوں کی وجہ سے ان بدنوں پر ظہور پذیر ہوا جو شقی النفس تھے گو انسانی صورتوں میں تھے اور خداوند متعال نے انہیں اپنی قدرت سے حیوانات کی صورت میں تبدیل کردیا تھا، اس طرح کہ ان کے مسخ ہونے کے بعد ان کے اقارب آئے اور ان کو ان شکلوں میں دیکھنے پر بھی ان سب کو پہچان لیا اور مسخ شدگان نے بھی ان کو پہچان لیا۔ چنانچہ ان کے رشتہ داروں نے ان سے کہا کہ کیا تمہیں نصیحت نہیں کی گئی تھی اور منع نہیں کیا گیا تھا؟ لیکن وہ جواب دینے کے قابل نہیں تھے اور جواباً رو دیتے تھے۔

اور اس بارے میں کثیر روایات ہیں کہ جن لوگوں کو بھی خدا نے مسخ فرمایا وہ تین دن سے زیادہ دنیا میں نہیں رہے اور بندر، سور اور تمام حیوانات جو اب پائے جاتے ہیں وہ حیوانات کی نسل سے ہیں نہ کہ نسل مسخ شدگان سے۔

اور اس بات کی وجہ کہ ان کو "مسوخات" کہا گیا یہ ہے کہ مسخ شدگان جو نوع بشر سے تھے ان کو ان جانوروں کی صورت میں مسخ کیا گیا تھا اور پھر انہیں ہلاک کردیا گیا۔

قیامت کی مختلف صورتیں

مسخ اُخروی کے متعلق پیغمبر اسلامؐ اور اہلبیت طاہرینؑ سے متعدد روایات منقول ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ قیامت کے دن انسان اپنی صورت ظاہرہ کی بجائے اس صورت باطنیہ میں محشور ہوں گے جسے انہوں نے اپنی خواہش و اختیار سے اپنے لئے منتخب کیا ہوگا نہ کہ دیگر جسموں میں (جیسا کہ تناسخیہ کہتے ہیں) بلکہ عین انہی جسموں میں جو ان کے نیتوں کے مطابق ہوں گے اور اس صورت میں وہ پہچانے جائیں گے کہ وہ کون ہیں اور انہوں نے کونسے عمل کئے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کی معنوی صورت ان کی ظاہری صورت پر غالب ہوگی اور اس حقیقت کا اشارہ اس آیت: "يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ" (طارق ۹) "جس دن باطن آشکار کردیا جائے گا" میں کیا گیا ہے۔

اسی لئے گناہوں سے پرہیز کرنے والے اور اطاعت خدا بجالانے والے افراد قیامت کے دن فرشتوں کی خوبصورتی کے ساتھ محشور ہوں گے۔

اس کے برعکس کچھ بدبخت شیاطین کی شکل و صورت میں محشور کئے جائیں گے کیونکہ انہوں نے دنیا میں شیطنت اور ابلیسیت کو قائم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہوگی اور بعض لوگ درندوں اور جانوروں کی صورت میں محشور ہوں گے اور کچھ لوگ حشرات کی صورت میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى وُجُوهِهِمْ..... (بنی اسرائیل ۹۷) "اور ہم انہیں قیامت میں ان کی اصل صورتوں کے مطابق محشور کریں گے۔"

آیت بالا کے ضمن میں بعض مفسرین نے یہ جملے لکھے ہیں: "اَیْ عَلٰی الْحَیَوَانَاتِ الْمُنْکَسَةِ الرُّؤُوْسِ." یعنی انھیں ان جانوروں کی صورت میں محشور کیا جائے گا جن کے سر جھکے ہوئے ہوں گے۔

پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ یَحْشُرُ النَّاسَ عَلٰی نِیَّاتِهِمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ. (بحارالانوار ج ۷۔ ص ۲۰۹) "اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی نیتوں کے مطابق قیامت میں محشور فرمائے گا۔"

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے اس حقیقت کو ان الفاظ سے بیان فرمایا: یُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰی صُوْرَةٍ حَسَنٍ عِنْدَهَا الْقِرَدَةُ وَالْخَنَازِیْرُ. "لوگ قیامت کے دن اپنی نیت اور باطن کے مطابق محشور ہوں گے اور ان کی صورتوں سے بندر اور خنزیر کی صورت بھی بھلی معلوم ہوتی ہوگی۔" یعنی وہ بندر اور خنزیر سے بھی بدتر صورت میں محشور ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا. (نبا ۱۸) جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم گروہ در گروہ آؤ گے۔"

اس آیت مجیدہ کے ضمن میں تفسیر مجمع البیان میں آنحضرتؐ سے یہ حدیث منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: یُحْشَرُ عَشْرَةُ اَصْنَافٍ مِنْ اُمَّتِیْ اَشْتَاتًا قَدْ مَیَّزَهُمُ اللّٰهُ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَ بَدَّلَ صُوَرَهُمْ بَعْضُهُمْ عَلٰی صُوْرَةِ الْقِرَدَةِ وَ بَعْضُهُمْ عَلٰی صُوْرَةِ الْخَنَازِیْرِ وَ بَعْضُهُمْ مُنَکَّسُوْنَ اَرْجُلُهُمْ مِنْ فَوْقٍ وَ وُجُوْهُهُمْ مِنْ تَحْتٍ ثُمَّ یُسْحَبُوْنَ عَلَیْهَا وَ بَعْضُهُمْ عُمْیٌ یَتَرَدَّدُوْنَ وَ بَعْضُهُمْ صُمٌّ بُکْمٌ لَا یَعْقِلُوْنَ وَ بَعْضُهُمْ یَمْضَغُوْنَ اَلْسِنَتَهُمْ فَیَسِیْلُ الْقَیْحُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ لُعَابًا یَتَقَذَّرُهُمْ اَهْلُ الْجَمْعِ وَ بَعْضُهُمْ مُقَطَّعَةٌ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ وَ بَعْضُهُمْ مُصَلَّبُوْنَ عَلٰی جُذُوْعٍ مِنْ نَارٍ وَ بَعْضُهُمْ اَشَدُّ نَتْنًا مِنَ الْجِیَفِ وَ بَعْضُهُمْ یُلْبَسُوْنَ جِبَابًا سَابِغَةً مِنْ قَطِرَانٍ لَازِمَةٍ بِجُلُوْدِهِمْ فَاَمَّا

الَّذِیْنَ عَلٰی صُوْرَةِ الْقِرَدَةِ فَالْقَتَّاتُ مِنَ النَّاسِ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ عَلٰی صُوْرَةِ الْخَنَازِیْرِ فَاَهْلُ السُّحْتِ وَ اَمَّا الْمُنَکَّسُوْنَ عَلٰی رُؤُوْسِهِمْ فَاَکَلَةُ الرِّبَا وَالْعُمْیُ الْجَائِرُوْنَ فِی الْحُکْمِ وَ الصُّمُّ الْبُکْمُ الْمُعْجَبُوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ وَالَّذِیْنَ یَمْضَغُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ فَالْعُلَمَاءُ وَالْقُضَاةُ الَّذِیْنَ خَالَفَ اَعْمَالُهُمْ اَقْوَالَهُمْ وَالْمُقَطَّعَةُ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ الْجِیْرَانَ وَالْمُصَلَّبُوْنَ عَلٰی جُذُوْعٍ مِنْ نَارٍ فَالسُّعَاةُ بِالنَّاسِ اِلَی السُّلْطَانِ وَالَّذِیْنَ اَشَدُّ نَتْنًا مِنَ الْجِیَفِ فَالَّذِیْنَ یَتَمَتَّعُوْنَ بِالشَّهَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَ یَمْنَعُوْنَ حَقَّ اللّٰهِ فِیْ اَمْوَالِهِمْ وَالَّذِیْنَ یَلْبَسُوْنَ الْجِبَابَ فَاَهْلُ الْفَخْرِ وَالْخُیَلَاءِ. (تفسیر مجمع البیان ج ۱۰۔ ص ۴۲۳)

میری امت میں سے دس قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ دوسرے انسانوں سے علیحدہ کرے گا اور ان کی صورتوں کو تبدیل کر کے انھیں محشور کرے گا۔ ان میں سے کچھ بندر کی شکل میں محشور ہوں گے اور کچھ خنزیر کی شکل میں محشور ہوں گے اور کچھ اس طرح سے محشور ہوں گے کہ ان کے پاؤں اوپر اور سر نیچے ہوں گے اور انھیں اس حال میں عذاب کی طرف گھسیٹا جائے گا اور کچھ اندھے ہوں گے اور ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوں گے اور کچھ گونگے بہرے ہوں گے جنھیں کچھ شعور نہ ہوگا اور کچھ اپنی زبانوں کو چبا رہے ہوں گے اور ان کے منہ سے لعاب کی بجائے پیپ نکل رہی ہوگی جس سے تمام اہل محشر اذیت محسوس کریں گے اور بعض افراد کی بدبو مردار سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہوگی اور بعض لوگوں کو تارکول کے لمبے قمیص پہنائے جائیں گے اور بعض افراد آگ کی شاخوں پر صلیب دیئے ہوئے ہوں گے۔

۱۔ ہر بات میں نکتہ چینی کرنے والے اور چغل خور افراد بندر کی صورت میں اٹھائے جائیں گے۔

۲۔ رزق حرام کھانے والے افراد خنزیر کی صورت میں اٹھائے جائیں گے۔

۳۔ سود خوروں کے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوں گی۔

۴۔ غلط فیصلہ کرنے والے حکام اندھے بن کر محشور ہوں گے۔

۵۔ اپنے اعمال پر ناز کرنے والے گونگے بہرے بنا کر اٹھائے جائیں گے۔

۶۔ جن علماء اور قاضیوں کے قول و فعل میں تضاد ہوگا وہ اپنی زبانوں کو چباتے ہوئے محشور ہوں گے۔

۷۔ ہمسایوں کو اذیت دینے والے لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں گے۔

۸۔ بادشاہوں کے پاس لوگوں کی چغل خوری کرنے والے افراد کو آگ کی شاخوں پر صلیب کی حالت میں محشور کیا جائے گا۔

۹۔ اپنی ناجائز خواہشات و لذات کو پورا کرنے والے اور اپنے مال سے اللہ کا حق ادا نہ کرنے والے افراد اس طرح سے محشور ہوں گے کہ ان کے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہوں گے۔

۱۰۔ تکبر کرنے والے افراد کو تارکول کے قمیص پہنا کر محشور کیا جائے گا۔

اس جیسی بہت سی روایات ہیں ہماری بیان کردہ مقدار کفایت کرنے والی ہے۔

آخرت میں زمانہ کی کیفیت کیا ہوگی

سوال ۳۸

عالم آخرت میں زمانہ کی کیا کیفیت ہوگی؟

جواب

زمانہ اور وقت حرکت افلاک اور زمین کی سورج کے گرد گردش کرنے سے

عبارت ہے آخرت میں یہ کیفیت نہ ہوگی۔ آخرت کے نور اور تاریکی کا تعلق فلک و آفتاب کی بجائے ایمان و کفر پر ہے۔ اہل ایمان جنت میں ہمیشہ اپنے ایمان کی روشنی میں اور اہل کفر دوزخ میں ہمیشہ اپنے کفر کی تاریکی میں ہوں گے۔

ہیشگی کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟

سوال ۳۹

جنت اور دوزخ کی ہیشگی کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟

جواب

جنت کے خلود کی کوئی حد نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ جسے جنت میں داخل کرے گا اسے جنت سے کبھی نہیں نکالے گا اور جنت اس کا ابدی ٹھکانہ ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: جَزَآءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خَالِدِیْنَ فِیْهَا اَبَدًا (البینہ ۸) "پروردگار کے یہاں ان کی جزا وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ انہیں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

اہل جنت کے لئے وقت اور زمانہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور اس کے برعکس جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرے گا اور اسے ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا نہیں رکھے گا لیکن کفار اور منافقین کے عذاب کی کوئی حد نہیں ہے وہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہیں گے۔ "وَمَاهُمْ بِخَارِجِیْنَ مِنَ النَّارِ" (سورۂ بقرہ ۱۶۸) یعنی وہ دوزخ سے کبھی آزادی حاصل نہیں کر سکیں گے۔

اگر اس مقام پر یہ سوال کیا جائے کہ ایک مختصر اور محدود عمر کے گناہ کی سزا لامحدود اور غیر منتہی عرصے کے لئے دینا عدل نہیں ہے۔

اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ دوزخ انہیں ان کے گناہوں کی بدولت نہیں بلکہ ان کے دل کی نیت اور کفر و عناد کے بدلے میں ملی ہے اور اسی طرح سے ہمیشہ کی جنت بھی اہل ایمان کی سچی نیت اور ایمان و محبت اور ذاتی سعادت کے بدلے میں ملتی ہے۔

بحارالانوار میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اِنَّمَا خُلِّدَ اَهْلُ النَّارِ فِی النَّارِ لِاَنَّ نِیَّاتِهِمْ کَانَتْ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَوْ خُلِّدُوْا فِیْهَا اَنْ یَّعْصُوا اللّٰهَ اَبَدًا وَ اِنَّمَا خُلِّدَ اَهْلُ الْجَنَّةِ فِی الْجَنَّةِ لِاَنَّ نِیَّاتِهِمْ کَانَتْ فِی الدُّنْیَا اَنْ لَوْ بَقُوْا فِیْهَا اَنْ یُّطِیْعُوا اللّٰهَ اَبَدًا فَبِالنِّیَّاتِ خُلِّدَ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ ثُمَّ تَلَا قَوْلَهٗ "قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ" قَالَ: اَیْ عَلٰی نِیَّتِهٖ. "اہل دوزخ کے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کی نیت یہ تھی کہ اگر انہیں ہمیشہ کی زندگی مل جائے تو وہ ہمیشہ اللہ کی نافرمانی کرتے رہیں گے اور اہل جنت، جنت میں ہمیشہ اس لئے رہیں گے کہ ان کی نیت بھی یہی تھی کہ اگر انہیں اللہ ہمیشہ کی زندگی عطا کردے تو وہ ہمیشہ اللہ کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ اسی نیت کی وجہ سے اہل دوزخ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور اسی نیت کی وجہ سے اہل جنت ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ پھر آپؑ نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی: "قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ" یعنی آپؐ کہہ دیں کہ ہر شخص اپنی نیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔" (بحارالانوار ج ۷۰۔ ص ۲۰۹)

اثبات رجعت

سوال ۴۰

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے:

...قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّا... (المؤمنون ۱۰۰)

"... کہنے لگا کہ پروردگار مجھے پلٹا دے شاید میں اب کوئی نیک کام انجام دوں۔ ہرگز نہیں...۔"

اور زیارت جامعہ میں زائر کی طرف سے یہ اقرار "مُصَدِّقٌ بِرَجْعَتِکُمْ" یعنی میں آپ کی رجعت کی تصدیق کرتا ہوں۔

قرآن مجید کی یہ آیت اور زیارت جامعہ کا یہ جملہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں اس کی مناسب وضاحت فرمائیں۔

جواب

مسئلہ رجعت مذہب امامیہ کے مسلمات میں سے ہے اور رجعت سے مقصود یہ ہے کہ امام مہدی علیہ السلام کے زمانہ ظہور میں اہلبیت طاہرین اور چند خالص مومن اور چند بدترین کافر و مشرک و دشمنان اہلبیت کو دنیا میں دوبارہ زندہ کیا جائیگا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ چند مخلص مومن اور بدترین کفار کا دوبارہ زندہ ہونا کوئی ناممکن نہیں ہے یہ کام خداوند عالم کے لئے انتہائی آسان ہے اور عقلی طور پر بھی اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ائمہ طاہرین سے اس کے متعلق بہت سی روایات مروی ہیں:

علامہ مجلسیؒ رقم طراز ہیں کہ رجعت کے متعلق اہلبیت سے دو سو سے زیادہ روایات مروی ہیں۔ رجعت پر اجمالی اعتقاد واجب ہے اور اس کی جزئیات یعنی رجعت کی کیفیت اور اس کی مدت اور زمانہ رجعت میں دوبارہ اٹھائے جانے والے افراد کی تعداد کا جاننا ضروری نہیں ہے۔

اس مقام پر سوال یہ کیا گیا کہ ایک طرف سے تو آپ رجعت کے قائل ہیں جبکہ قرآن مجید یہ گواہی دیتا ہے کہ مرنے کے بعد کافر اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ انہیں ایک بار پھر دنیا میں جانے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ نیک عمل کر

کے اپنے سابقہ زندگی کے گناہوں کی تلافی کر سکیں۔ اس خواہش کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ لہٰذا قرآن مجید کی اس آیت سے عقیدۂ رجعت کا ابطال ہوتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ قرآن مجید کی یہ آیت اپنے مقام پر بالکل صحیح ہے اور عقیدۂ رجعت بھی صحیح ہے اور اس آیت سے کسی طور بھی رجعت کی نفی ثابت نہیں ہوتی کیونکہ آیت مجیدہ کے الفاظ یہ بتاتے ہیں کہ کافر تمنا کریں گے کہ انہیں ایمان اور عمل صالح کے حصول کے لئے ایک مرتبہ دوبارہ زندگی دے کر زمین پر لوٹایا جائے اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہرگز نہیں۔

ان الفاظ سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ ایمان و عمل صالح کے لئے ان کی واپسی ممکن نہیں ہے جبکہ زمانہ رجعت میں ان کی واپسی ایمان و عمل صالح کے لئے نہیں ہوگی بلکہ انہیں عذاب دینے کے سلسلے میں ہوگی۔ اسی لئے یہ آیت ہمارے عقیدے کو باطل نہیں کرتی۔

اسی طرح سے چند خالص مومنین کی زمانہ رجعت کی واپسی بھی اس لئے ہوگی کہ ان کی دنیا میں ہمیشہ سے یہ تمنا تھی کہ وہ سلطنت حقہ الٰہیہ کو دیکھ سکیں اور یوں ان کی زمانہ رجعت کی واپسی ان کے غم و حزن کی تلافی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

اس سے زیادہ سادہ الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کفار کی واپسی مراتب عذاب میں اضافہ کے لئے ہوگی اور مومنین کی واپسی ثواب کے درجات میں اضافہ کے لئے ہوگی۔ کافروں کو تحصیل ایمان و عمل صالح کے لئے واپس نہیں کیا جائے گا ان کی واپسی دراصل قیامت کی واپسی کا ایک حصہ متصور کی جائے گی۔

قرآن مجید میں لفظ "ساعۃ" بکثرت استعمال ہوا ہے اور روایات اہلبیت میں بعض مقامات پر "ساعۃ" کو زمان رجعت سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ روایات میں یہ

الفاظ وارد ہیں: اَیَّامُ اللّٰہِ ثَلَاثَۃٌ: یَوْمُ الظُّھُوْرِ، یَوْمُ الْکَرَّۃِ وَ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ۔ "تین دن اللہ کے خصوصی دن ہیں: ظہور کا دن۔ رجعت کا دن۔ روز محشر۔"

دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں: یَوْمُ الْمَوْتِ وَ یَوْمُ الْکَرَّۃِ وَ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ۔ "اللہ کے خصوصی تین دن ہیں: موت کا دن۔ رجعت کا دن۔ روز محشر۔"

زمانہ رجعت میں اٹھنے والے کافر

سوال ۴۱

مشہور ہے کہ امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کے زمانے میں کچھ خالص مومن اور کچھ بدترین کافر اٹھائے جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ کافر مرنے کے بعد آخرت کے طور طریقوں کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور اسے مبداء اور معاد پر یقین ہو جاتا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ جب دوبارہ دنیا میں آئے تو حالت کفر میں آئے؟

اس کے ساتھ یہ بھی واضح فرمائیں کہ مومن تو دنیا میں اپنی تکلیف شرعی ادا کر کے عالم برزخ میں رہ رہے ہوں گے تو انہیں عالم برزخ سے نکال کر دنیا میں پھر تکلیف شرعی میں مبتلا کرنے میں آخر کیا حکمت ہے؟

جواب

(الف) جس شخص کی مدت حیات میں اس پر حجت الٰہی تمام ہو چکی ہو اور وہ خدا کی نشانیاں اور دلائل کا مشاہدہ کرنے کے باوجود دولت ایمان سے محروم رہے اور انبیاءؑ کے اقوال اس پر کوئی اثر نہ کریں اور وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو ایسا شخص اگر ہزار بار بھی موت کا ذائقہ چکھے اور عالم برزخ کا مشاہدہ کرے اور ہزار بار بھی دنیا میں

لوٹایا جائے تو پھر بھی وہ ایمان قبول نہیں کرے گا کیونکہ اگر وہ ایمان لانے والا ہوتا تو پہلی بار ہی ایمان لایا ہوتا ایسے ہی افراد کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:
.... وَلَوْرُدُّوْا لَعَادُوْ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ.... (الانعام ۲۸) "اور اگر انہیں پلٹا بھی دیا جائے تو بھی وہ وہی کریں گے جس سے یہ روکے گئے ہیں۔"

اور ایسے افراد کے متعلق حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے لوگ انسانیت کے لئے کلنک کا ٹیکہ ہیں اور یہ لوگ کسی طور بھی انسان کہلانے کے حقدار نہیں ہیں۔ ایسے افراد حیوانوں سے بھی بدتر ہیں۔

اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ. (الاعراف ۱۷۹) "یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور یہی لوگ اصل میں غافل ہیں۔"

اور ایسے ہی افراد کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَاللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ. (الانفال ۲۲) "اللہ کے نزدیک بدترین زمین پر چلنے والے وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔"

لہذا کافر کے متعلق یہ تصور کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ قبر سے اٹھتے ہی مومن و موحد ہوگا۔ اس بیان سے انشاء اللہ شبہ دور ہوگیا ہوگا۔ کافر دنیا میں دوبارہ آنے کے بعد اپنی حیات اول کی طرح دنیا میں مشغول ہو جائے گا اور اس کی شہوات کا گرویدہ ہو جائے گا۔ (اس کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ) جب وہ قبر سے باہر آئے گا تو اسے برزخ کی سختیاں اور نکیرین کے سوالات سب کچھ بھول چکے ہوں گے اور اگر اسے یاد بھی رہ جائیں تو بھی وہ انہیں ایک ڈراؤنے خواب سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا۔ کافر ایسے اہل نسیان ہیں اگر وہ ہزار مرتبہ بھی مریں اور پھر زندہ کئے جائیں وہ پھر بھی حیوان کے حیوان ہی رہیں گے اور جو اہل عناد و کفر تھا وہ تمام پیدائشوں اور حالتوں میں ویسا ہی رہے گا۔

(ب) مومن کو زمانہ رجعت میں تکلیف شرعی کے لئے نہیں اٹھایا جائے گا بلکہ اسے اس کی پہلی زندگی کا بہتر ثمر دینے کے لئے اٹھایا جائے گا اور اسے اہلبیت طاہرین کی عظمت و سلطنت کا مشاہدہ کرایا جائے گا جس سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔

علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مومنین کو خوشی و مسرت کے علاوہ کچھ فضائل و اعمال کی تکمیل کا بھی موقع فراہم کیا جائے گا جسے وہ اپنی پہلی زندگی میں ماحول سازگار نہ ہونے کی وجہ سے بجالانے سے قاصر رہے ہوں گے۔

مثلاً چند اہل ایمان جن کی زندگی میں شدید تمنا تھی کہ انہیں راہ خدا میں شہادت نصیب ہو مگر انہیں بعض حالات کی وجہ سے شہادت نہ مل سکی ہو تو ایسے افراد کو امام زمانہ کی ہمرکابی میں شہادت کا شرف عطا کیا جائے گا جیسا کہ بحارالانوار میں امام جعفر صادقؑ کا یہ فرمان مرقوم ہے۔ آپؑ نے "وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا" (النمل ۸۳) یعنی جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گروہ کو محشور کریں گے، کی تفسیر میں فرمایا: لَيْسَ اَحَدٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ قُتِلَ اِلاَّ سَيُرْجَعُ حَتّٰى يَمُوْتَ وَلاَ اَحَدٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ مَاتَ اِلاَّ سَيُرْجَعُ حَتّٰى يُقْتَلَ. (بحارالانوار ج ۵۳۔ ص ۴۰) "جتنے مومن قتل کئے گئے ہوں گے ان سب کو لوٹایا جائے گا اور وہ اپنی عمر پوری کر کے طبعی موت مریں گے اور جو مومن طبعی موت مرے ہوں گے انہیں لوٹایا جائے گا یہاں تک کہ وہ شہادت کا رتبہ حاصل کریں گے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مومنین اپنی حتمی اجل سے قبل مارے گئے ہوں گے انہیں زمانہ رجعت میں لوٹایا جائے گا اور وہ اپنی پہلی زندگی کی تکمیل کریں گے اور ایسے مومنین جو شہادت کی دولت حاصل کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوں گے انہیں بھی لوٹایا جائے گا اور انہیں شہادت کی دولت سے سرفراز کیا جائے گا۔

عالم برزخ کی کمی بیشی اور قالب مثالی

سوال ۴۲

فرض کریں ایک شخص ہزار سال پہلے مرا اور ایک شخص آج مرا کیا عالم برزخ دونوں کے لئے ایک جیسا ہے کہ (جو شخص ہزار برس پہلے مرا اس کے لئے عالم برزخ کا عرصہ طویل ہوگا اور دوسرے کے لئے کم ہوگا؟) اس کے ساتھ "قالب مثالی" کی بھی وضاحت فرمائیں۔

جواب

(الف) عالم برزخ میں ارواح کے قیام کی مدت میں واقعی کمی بیشی ہے۔ زمانہ برزخ میں ارواح معطل نہیں رہتیں۔ اگر ارواح کا تعلق اہل ایمان سے ہوگا تو انہیں عالم برزخ کی نعمات حاصل ہوں گی اور اگر ارواح کا تعلق کفار و فساق سے ہوگا تو عذاب میں مبتلا ہوں گی اور اگر ارواح کا تعلق مستضعف افراد سے ہوگا یعنی ایسے افراد جو حق و باطل میں تمیز کرنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں یا جو بلاد کفر میں رہتے ہوں اور مذاہب کے مختلف ہونے کا کوئی علم نہ رکھتے ہوں یا اگر علم رکھتے ہوں تو اس بات کی قدرت نہ رکھتے ہوں کہ دوسرے علاقوں میں جائیں اور دینِ حق کے بارے میں چھان بین کریں اور اسی طرح کمسنی میں مرنے والے بچے اور پاگل افراد کی ارواح سے برزخ میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا اور ان کے لئے کوئی ثواب و عذاب نہیں ہوگا۔ ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہوگا۔ چاہے تو وہ قیامت میں ان سے عدل کا سلوک کرے یا ان کے ساتھ فضل کا سلوک کرے۔

(ب) قالب مثالی: قالب مثالی اس لطیف بدن کو کہا جاتا ہے جو موت کے بعد روح کو عطا کیا جاتا ہے اور وہ جسم دنیاوی جسم کی مکمل شبیہ ہوتا ہے جیسا کہ امام جعفر صادق

نے اسکے متعلق ارشاد فرمایا: لَوْرَاَیْتَهٗ لَقُلْتَ هُوَ هُوَ بِعَیْنِهٖ. "اگر تو عالم برزخ میں اس قالب مثالی کو دیکھے تو تو کہے گا کہ یہ بالکل وہی ہے۔" مقصد یہ ہے کہ جسم مثالی شکل وصورت میں دنیاوی جسم جیسا ہوتا ہے البتہ وہ صاف اور انتہائی لطیف ہوتا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار میں لکھا ہے: جسم مثالی لطافت کے اعتبار سے جن اور ملائکہ کی شبیہ ہوتا ہے۔

روایات میں وسعت قبر اور حرکت روح اور اس کا ہوا میں پرواز کرنا اور اپنے اہل خاندان کو دیکھنے کے آنے کا جتنا بھی تذکرہ ملتا ہے اس کا تعلق اسی بدن مثالی سے ہوتا ہے بعض محققین نے جسد مثالی کی تشبیہ آئینہ میں نظر آنے والی تصویر سے دی ہے اور کہا ہے کہ آئینہ میں نظر آنے والی تصویر اور جسم مثالی میں اتنا فرق ہے کہ آئینہ کی تصویر قائم بالغیر ہوتی ہے اور ادراک نہیں رکھتی جبکہ جسم مثالی اپنی ذات کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور اس میں روح موجود ہوتی ہے اور وہ حس و ادراک رکھتا ہے۔

کفار کے نیک عمل

سوال ۴۳

دنیا میں ایسے کئی کافر و مشرک گزرے ہیں جنھوں نے کئی اچھے کام کئے اور بہت سے بے دین موجدوں نے اپنی ایجادات سے کروڑوں افراد کو فائدہ پہنچایا۔ تو کیا ان کی انسان دوستی کی یہ خدمات ان کیلئے عذاب میں تخفیف کا موجب ہونگی یا نہیں؟

جواب

نیک کام اور انسانی معاشرے کی صلاح و فلاح کے کام اور نفع بخش ایجادات کا اخروی فائدہ تب نصیب ہوگا جب اس عمل کے ساتھ ایمان شامل ہوگا اور وہ عمل

صرف رضائے خداوندی کی غرض سے سرانجام دیا گیا ہوگا اور اس عمل کی اجرت اللہ کے علاوہ اور کسی سے طلب نہ کی گئی ہوگی۔ جبکہ غیر مسلم موجد کی نظر میں امور بالا کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

۱۔ اس کا عمل خالص خدا کے لئے نہیں ہوتا۔

۲۔ وہ ایمان باللہ کی دولت سے محروم ہوتا ہے۔

۳۔ اور وہ اپنے عمل کی اجرت حکومتوں اور کمپنیوں سے وصول کرتا ہے اور اس کا مقصود صرف اپنی چند روزہ شہرت کا حصول ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بھاری دنیاوی آسائشات حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اخروی فائدہ سے محروم رہے گا۔

اور اس مقام پر یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ انسانوں اور حیوانات پر احسان کرنے کے دنیا اور آخرت میں بڑے فوائد ہیں اور احسان کرنے والا اگرچہ کافر و فاسق بھی کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ اسے اجر سے محروم نہیں رکھتا۔ البتہ کافر ہونے کی صورت میں اسے آخرت کا ثواب نصیب نہیں ہوسکتا۔ اخروی ثواب کے عوض:

۱۔ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں دولت و ثروت عطا کرتا ہے یا

۲۔ اس سے کسی بڑی مصیبت کو ہٹا دیتا ہے یا

۳۔ اس کی کسی حاجت کو پورا کرتا ہے یا

۴۔ اس کو طویل عمر عطا کرتا ہے یا

۵۔ اس کی حالت میں ایمانی انقلاب برپا کرتا ہے جس کی وجہ سے اسے توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور اس کا انجام بخیر ہوتا ہے اور اگر امور بالا میں سے کچھ بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے عذاب میں تخفیف کرتا ہے۔ البتہ کمیت و کیفیت اور موقع و محل کے اعتبار سے احسان کے مراتب میں فرق ضرور ہوتا ہے۔

سکرات و غمرات موت

سوال ۴۴

موت کے سکرات اور غمرات سے کیا مراد ہے اور جن لوگوں کی موت اچانک واقع ہوتی ہے کیا وہ سکرات و غمرات سے دوچار ہوتے ہیں؟

جواب

سکرات و غمرات ان تکلیفوں کو کہا جاتا ہے جو حالت احتضار میں طاری ہوتی ہیں۔

سکرات: مرنے والے کی اس حالت کو کہا جاتا ہے جس میں وہ بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس سے غیر منظم الفاظ و حرکات صادر ہوتے ہیں۔

غمرات: ان شدید ترین گھڑیوں کو کہا جاتا ہے جن میں مرنے والا ایک طرح سے مبہوت و متحیر و مدہوش دکھائی دینے لگتا ہے۔

ناگہانی موت کی صورت میں انسان سکرات سے دوچار نہیں ہوتا لیکن یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ کسی شخص کا سکرات میں مبتلا ہونا اس کی بری موت کی دلیل نہیں ہے اور اسی طرح سے کسی شخص کا آسانی سے مرنا بھی اس کی موت کے اچھا ہونے کی سند نہیں ہے اور سکرات کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے کسی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ عین ممکن ہے کہ کسی مومن کی سکرات کی تلخی اس کے گناہوں کا کفارہ ہو اور اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کافر و فاسق کی موت کو اس کے لئے آسان بنادے کہ اس کی کسی نیکی کا بدلہ اسی دنیا میں دینا چاہتا ہو اور آخرت میں اس کے لئے حصہ نہ ہو۔

(اس مسئلے کی مزید وضاحت کیلئے کتاب "عقائد صدوق" کا مطالعہ فرمائیں۔)

تفسیر آیاتِ قرآن

قرآن مجید بیک وقت نازل ہوا یا تدریجاً نازل ہوا؟

سوال ۴۵

سورۂ قدر میں ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ۔ "ہم نے قرآن کو شب قدر میں نازل کیا۔"

آیا قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ پر ایک ہی شب میں نازل ہوا یا تدریجاً نازل ہوتا رہا؟

جواب

قرآن مجید کے لئے کئی مقامات پر لفظ "انزال" استعمال کیا گیا۔ مثلاً اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِo (قدر ۱) شَہْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآنُ (البقرہ ۱۸۵)، اِنَّا اَنْزَلْنَاہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبَارَکَۃٍ۔ (الدخان ۳) وغیرہ۔

لفظ "انزال" کے ظاہر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو ماہ رمضان المبارک میں بیک وقت پورے کا پورا نازل کیا گیا ہے لیکن قرآن مجید کی یہ آیت "وَقُرْآنًا فَرَقْنَاہُ لِتَقْرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّ نَزَّلْنَاہُ تَنْزِیْلًا۔" (بنی اسرائیل ۱۰۶) یعنی اور ہم نے قرآن کو متفرق بناکر نازل کیا ہے تاکہ تم تھوڑا تھوڑا لوگوں کے سامنے پڑھو اور ہم نے خود اسے تدریجاً نازل کیا ہے۔

(اور اس جیسی دوسری آیات میں لفظ "تنزیل" استعمال ہوا ہے جس کے معنی تدریجاً نازل ہونے کے ہیں۔)

امت اسلامیہ کا اجماع ہے کہ قرآن مجید تدریجی طور پر تیئیس برس کے عرصے تک نازل ہوتا رہا۔

(لفظ "انزال" میں یکبارگی نزول کا مفہوم پایا ہے اور لفظ "تنزیل" میں تدریجی نزول کا مفہوم پایا جاتا ہے اور بادی النظر میں یہ تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے اور دونوں مفہوم اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔)

مفسرین نے اس موضوع پر کافی خامہ فرسائی کی ہے لیکن اس کی بہترین توجیہ وہ ہے جسے امام جعفر صادقؑ نے بیان کیا ہے:

عَنْ حفص بنْ الْغیاث عَنْ اَبِیْ عَبْدِاللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ، قَالَ: سَاَلْتُہٗ عَنْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ "شَہْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْآنُ" وَ اِنَّمَا اُنْزِلَ فِیْ عِشْرِیْنَ سَنَۃً بَیْنَ اَوَّلِہٖ وَاٰخِرِہٖ؟ فَقَالَ اَبُوْ عَبْدِاللّٰہِ عَلَیْہِ السَّلَامُ: نَزَلَ الْقُرْآنُ جُمْلَۃً وَّاحِدَۃً فِیْ شَہْرِ رَمَضَانَ اِلَی الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ثُمَّ نَزَلَ فِیْ طُوْلِ عِشْرِیْنَ سَنَۃً. (الکافی ج ۲۔ ص ۶۲۸، ۶۲۹)

امام عالی مقام کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے بعثت پیغمبرؐ کے آغاز میں سارے کا سارا قرآن بیت المعمور کی طرف نازل کردیا اور پھر بیس سال کے عرصے تک ضرورت کے مطابق پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوتا رہا۔

ایک اور محقق مفسر نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ ابتدائے بعثت میں پورے قرآن کی حقیقت کو قلبِ مصطفیؐ پر نازل کردیا گیا تھا لیکن وہ الفاظ و حروف پر مشتمل نہ تھا، وہ صرف ایسی حقیقت قرآن تھی جس کے سمجھنے سے عقول بشر عاجز ہیں۔ بعدازاں الفاظ و حروف کی صورت میں بیس سال کے عرصے تک اسے حبیب خداؐ کی

زبان اطہر سے جاری کیا گیا۔

مفسر مذکور نے اس نظریہ کے اثبات کیلئے قرآن مجید کی متعدد آیات سے استدلال کیا ہے۔ مزید آگاہی کیلئے تفسیر المیزان کی جلد دوم کی طرف رجوع فرمائیں۔

ترتیب نزول اور ترتیب تدوین

سوال ۴۶

قرآن مجید کو ترتیب نزول کے مطابق مدون کیوں نہ کیا گیا؟

جواب

یہ درست ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب نزولی اور ترتیب تدوینی میں فرق ہے۔ مدنی سورتیں پہلے اور کی سورتیں بعد میں دکھائی دیتی ہیں۔ بعض مدنی آیات اواخر بعثت میں نازل ہونے والی آیات کی سورتوں کا حصہ ہیں اور بعض کی آیات مدنی صورتوں کا حصہ ہیں اور کچھ ناسخ آیات پہلے اور منسوخ آیات بعد میں ہیں۔

لیکن اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی ہی نگرانی میں یہ ترتیب دلائی تھی اور اس ترتیب سے قرآن کی فصاحت و بلاغت اور بیان احکام میں کوئی فرق نہیں آیا۔

انبیاءؑ کا قتل ناحق

سوال ۴۷

قرآن مجید میں یہود کی خباثتوں کے ضمن میں مذکور ہے:

... وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ... (آل عمران ۱۸۱)

"یہود نے انبیاءؑ کو ناحق قتل کیا۔"

(سوال یہ ہے کہ کیا انبیاءؑ کو حق سے بھی قتل کیا جاسکتا ہے جبکہ قتل بالحق کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ کوئی اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے تو واجب القتل ہو جاتا ہے۔

۲۔ شادی شدہ شخص زنا کا مرتکب ہو تو اسے سنگسار کیا جائے گا اور یوں وہ قتل ہو جائے گا۔

۳۔ کوئی شخص کسی کو قتل کرے تو اس کے قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا۔)

اور اگر بالفرض انبیاءؑ کو حق سے قتل کرنا ممکن ہے تو اس سے انبیاءؑ کی عصمت باقی نہیں رہتی۔

جواب

۱۔ ہم اس سوال کے دو جوابات عرض کرنا چاہتے ہیں۔

قاتل بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ قاتلوں کی پہلی قسم وہ ہوتی ہے جو کہ اپنے قتل کے اقدام کو صحیح سمجھتے ہیں اور کسی شبہ کی وجہ سے وہ اپنے عمل کو درست سمجھتے ہیں اور اپنے اعتقاد فاسد کے تحت مذکورہ قتل کو بالکل جائز سمجھتے ہیں۔

قاتلوں کی دوسری قسم وہ ہوتی ہے جو کہ خود اپنے ذہن میں بھی اپنے ظلم کو تسلیم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس اقدام قتل کی کوئی معقول یا غیر معقول وجہ نہیں تھی۔

جب قاتلوں کی ان دو اقسام کا موازنہ کیا جائے تو دوسری قسم کے قاتل پہلی قسم کے قاتلوں کی بہ نسبت زیادہ مجرم قرار پائیں گے کیونکہ ان بدبختوں کے پاس اقدام قتل کا کوئی جواز تک نہ تھا پھر بھی انہوں نے یہ اقدام کیا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی قاتل اپنے فعل کو حق قرار دیتا ہے اور کبھی قاتل خود ہی اپنے اقدام کو ناحق کہتا ہے۔

انبیاءؑ کے قتل کا معاملہ بھی یہی ہے کہ قاتلوں کے پاس ان کے قتل کا کوئی سچا یا جھوٹا جواز نہیں تھا اور "بغیر حق" کے لفظ کا تعلق قاتل کے نظریے کے ساتھ ہے۔ یعنی خود قاتل ہی اپنے اقدام کو ناحق سمجھتا ہے اور "بغیر حق" کے الفاظ عصمت انبیاءؑ کی دلیل قرار پاتے ہیں۔

۲۔ صفت اور قید کی دو قسمیں ہیں۔ "صفت لازمہ" وہ صفت جو تمام حالات میں موصوف کے ساتھ ہو۔ "صفت مفارقہ" وہ صفت جو بعض حالات میں موجود ہو اور بعض حالات میں موجود نہ ہو۔

صفت لازمہ کا مقصد زیادتی تاکید ہوتا ہے اور وہ شرط کے معانی میں استعمال نہیں ہوتی۔ مثلاً ہم کسی سے کہتے ہیں کہ "مسجد میں جھوٹ نہ بولو" تو اس جملے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ مسجد کے باہر تمہیں جھوٹ بولنے کی اجازت ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ جھوٹ بذات خود فعل قبیح ہے اور مسجد میں بہت زیادہ قبیح ہے۔

اسی طرح سے "قتلهم الانبیاءؑ" کے ساتھ صفت "بغیر حق" صفت لازمہ ہے۔ یہ شرط کے معنی میں نہیں ہے اور اس کا یہ مفہوم صحیح نہ ہوگا کہ بعض اوقات انبیاءؑ کو حق کے ساتھ قتل کرنا جائز ہوتا ہے۔ علم اصول میں یہ بات اپنے مقام پر ثابت ہے کہ وصف کا سرے سے کوئی مفہوم نہیں ہوتا۔

اجابت دعا

سوال ۴۸

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

... اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ... (المؤمن ۶۰)

"تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔"

اس آیت مجیدہ میں قبولیت دعا کی کوئی شرط بیان نہیں کی گئی۔ البتہ روایات میں دعا کی قبولیت کی چند شرائط بیان کی گئی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ شرائط دعا کے تقاضوں پر عمل کرنے کے باوجود بھی اکثر دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب

اللہ تعالیٰ ہرگز وعدہ خلافی نہیں کرتا اور وہ اپنے وعدے کے مطابق دعا مانگنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے لیکن دعا کے ثمرآور ہونے اور مطلوبہ چیز کے حصول کے لئے وہ کریم و رحیم یہ ضرور دیکھتا ہے کہ میرا بندہ جو کچھ مانگ رہا ہے یہ اس کے لئے بہتر بھی ہے یا نہیں؟

اگر مطلوبہ دعا کا ثمر بندے کے لئے بہتر ہوتا ہے تو عطا کردیتا ہے اگر وہ دعا بندے کے حق میں بہتر نہ ہو تو اسے اس کی مطلوبہ چیز عطا نہیں کرتا اور اس کے بدلے میں اسے ایسی چیز عطا کرتا ہے جو اس کے حق میں بہتر ہوتی ہے۔ یا اس کی دعا کو اعمال آخرت میں ذخیرہ کرلیتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے حقیقی فائدے اور حقیقی نقصان کو متعین کرنے میں بعض اوقات غلطی کرتا ہے اور وہ اپنی نادانی سے اس چیز کی درخواست کرنے لگ جاتا ہے جو اس کے حق میں بہتر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ. (البقرہ ۲۱۶) "عین ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو جو کہ تمہارے لئے بری ہو۔"

اس لئے جو چیز طلب کی گئی ہے، اگر (بندے کے) فائدہ کا باعث ہوگی تو

ضرور عطا کی جائے گی اور اگر اس کے لئے مفید نہ ہوگی تو اس کے بدلے میں وہ چیز جو اس کے فائدے کا سبب بنے اسے عطا کردی جائے گی یا اس کی آخرت کے لئے ذخیرہ کردی جائے گی۔

اس مقام پر اگر یہ سوال کیا جائے کہ جو چیز بندوں کے حق میں بہتر ہوگی وہ خود بخود اللہ فراہم کرے گا اور جو بہتر نہ ہوگی وہ کسی قیمت پر فراہم نہیں کرے گا۔ پھر دعا کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ امور کی بہتری کی بھی دو قسمیں ہیں۔ کچھ امور ایسے ہیں جن کی بہتری حتمی ہے اور کچھ امور ایسے ہیں جن کے لئے اللہ نے دعا اور طلب کی شرط عائد کی ہے کہ میرا بندہ مجھ سے مانگے گا تو عطا کروں گا۔ اسی لئے انسان کو دونوں قسموں کے لئے دعا مانگنی چاہئے کیونکہ جو امور طلب و دعا پر موقوف ہوں وہ حاصل ہوسکیں اور جن کا حصول حتمی ہو ان میں دعا کا ثواب حاصل ہوسکے اور انسان خدا کے کرم کا حقدار بن سکے اور بعض اوقات دعا کی تاثیر میں اس لئے تاخیر واقع ہوتی ہے تاکہ انسان اپنی احتیاج کے لئے زیادہ سے زیادہ دعا مانگ کر اللہ تعالیٰ کے مزید انعام و اکرام کا مستحق بن سکے۔

الکافی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: جب اللہ کو کسی شخص کی صدا پسند ہوتی ہے تو اس کی دعا کو فوراً قبول نہیں کرتا تاکہ بندہ اس کے لئے مزید دیر تک محو مناجات و دعا رہے۔

اور سوال میں جس امر کے متعلق پوچھا گیا ہے کہ "دعا کی جملہ شرائط کی موجودگی میں بھی اکثر دعائیں قبول نہیں ہوتیں" تو اس کے متعلق ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ ایسا سمجھنے کی بنیاد یہ ہے کہ انسان شرائط سے غافل ہوتا ہے اور اس جہان رنگ و بو میں جامع الشرائط دعائیں انتہائی کم ہیں اور اگر

جامع الشرائط دعا موجود ہو تو اس کی قبولیت یقینی ہوتی ہے۔

(قول اقبال: آہ جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے من المترجم)

قبولیت دعا کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ دعا میں اخلاص ہو یعنی انسان قلب و یقین کی گہرائیوں سے یہ سمجھ لے کہ مؤثر صرف اللہ کی ذات ہے اور اس کے علاوہ کوئی بھی سبب مؤثر نہیں ہے اور دعا کے وقت قلب غیراللہ کی طرف کسی طور سے بھی متوجہ نہ ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اُدْعُوْنِیْ" مجھے پکارو۔ یعنی میرے علاوہ کسی دوسرے کو نہ پکارو۔ یعنی باقی تمام اسباب سے انسان ہاتھ اٹھالے اور یہ یقین کرے کہ صرف اللہ ہی میرے مقصد کو پورا کرسکتا ہے۔ پوری مخلوق سے مکمل طور پر ناامید ہو اور خالق سے امید وابستہ ہو۔ ایسی دعا کا ثمر "استجب لکم" میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا ہے: اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ (البقرہ ۱۸۶) "میں دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔"

معلوم ہوا کہ اگر مانگنے والے کے ذہن میں یہ تصور موجود ہو کہ فلاں شخص بھی میرا یہ کام کرسکتا ہے تو اس نے حقیقت میں خدا کو پکارا ہی نہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے "انقطاع الی اللّٰہ" اور "اضطرار الی اللّٰہ" کی کیفیت پر دعا کی قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَکْشِفُ السُّوْٓءَ. (النمل ۶۲) "بھلا وہ کون ہے جو مضطر کی فریاد کو سنتا ہے جب وہ اس کو آواز دیتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کردیتا ہے۔"

اضطرار کی دو قسمیں ہیں : (۱) تکوینی۔ (۲) تکلیفی۔

اضطرار تکوینی سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس کوئی ظاہری سبب باقی نہ رہا ہو اور وہ تمام اسباب سے منقطع ہو کر خداوند عالم سے رابطہ قائم کرے۔ مثلاً کوئی شخص دریا میں گر پڑے اور اسے دور دور تک بچانے والا شخص کہیں نظر نہ آتا ہو تو ایسا شخص مضطر تکوینی کہلائے گا۔

اضطرار تکلیفی سے مراد یہ ہے کہ انسان توحید افعالی کے متعلق اس درجہ یقین پر پہنچ جائے کہ خدا کے سوا کسی کو مؤثر تصور نہ کرے اور تمام اسباب ظاہری کو ارادہ پروردگار کے ساتھ مشروط قرار دے اور اس کا یہ یقین اس کے وہم و گمان پر غالب آجائے۔ جس طرح سے دریا میں ڈوبنے والا شخص دل کی گہرائیوں سے خدا کو پکارتا ہے وہ بھی اسی اخلاص اور جذبے کی گہرائی سے خدا کو پکارے۔ اضطرار تکلیفی کا یہ مقام انتہائی کم افراد کو میسر آتا ہے اور حضرت امیر المومنینؑ نے مناجات شعبانیہ میں اللہ تعالیٰ سے اس مقام کی درخواست کی اور بارگاہ احدیت میں عرض کی : اِلٰهِیْ هَبْ لِیْ كَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْكَ. "پروردگار مجھے اپنے حضور کمال انقطاع کا مقام عطا فرما۔"

امام جعفر صادقؑ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں؟ آپ نے فرمایا: "لِاَنَّكُمْ تَدْعُوْنَ مَنْ لَا تَعْرِفُوْنَهٗ" یعنی کیونکہ تم اسے پکارتے ہو جسے تم پہچانتے نہیں ہو۔

اس بحث سے ثابت ہوا کہ جامع الشرائط دعا انتہائی کم ہے اور جامع الشرائط دعا کا ٹھکرایا جانا محال ہے۔ مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہماری ٹوٹی پھوٹی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور فقیر کا ذاتی تجربہ بھی یہی ہے۔ فقیر نے اللہ تعالیٰ سے ہزاروں دعائیں مانگیں جو کہ اس نے اپنی شان رحمانیت سے قبول فرمائیں۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ الْحَلِیْمِ الْكَرِیْمِ الْحَنَّانِ الْمَنَّانِ.

بیویوں میں عدل

سوال ۴۹

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا :

... فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْمَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا. (النسآء ۳)

"... جو عورتیں تمہیں پسند ہیں دو، تین، چار ان سے نکاح کر لو اور اگر ان میں انصاف نہ کر سکنے کا خطرہ ہے تو صرف ایک۔ یا جو کنیزیں تمہارے ہاتھ کی ملکیت ہیں۔ یہ بات انصاف سے تجاوز نہ کرنے کے قریب ہے۔"

اور پھر اسی سورہ میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِیْلُوْا كُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ... (النسآء ۱۲۹)

"اور تم کتنا ہی کیوں نہ چاہو عورتوں کے درمیان مکمل انصاف نہیں کر سکتے ہو لیکن اب ایک طرف بالکل نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو۔"

پہلی آیت میں زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت کو عدل کے ساتھ مشروط کیا گیا اور کہا گیا کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی پر قناعت کرو۔ دوسری آیت میں یہ کہا گیا کہ تم ہرگز عدل نہ کر سکو گے۔ تو کیا مذکورہ آیات ایک دوسرے کی متضاد نہیں ہیں؟ (العیاذ باللہ)

جواب

پہلی آیت میں تعدد ازواج کے لئے عدل کی شرط عائد کی گئی۔ مقصد یہ ہے کہ بیویوں کو یکساں حقوق فراہم کئے جائیں اور ان کے حقوق میں کسی طرح کی کمی و

بیشی درست نہیں ہے۔ ایک کو دوسری بیوی کی بہ نسبت زیادہ حقوق دینا پہلی کے حق میں ظلم ہے۔ اگر ایک بیوی کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کئے جائیں تو دوسری بیوی سے بھی حقوق زوجیت ضرور ادا کئے جائیں۔ جس شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیویوں کے لئے برابر کی باری مقرر کرے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا عدل قائم رکھنا ممکن ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس عدل کا حکم دیا اور تعدد ازواج کے لئے اسے شرط قرار دیا۔

نیز ان پر خرچ کرنے کے معاملے میں بھی عدل کو کاملاً ملحوظ خاطر رکھا ہے کیونکہ کسی ایک کو ترجیح دینا دوسری کے لئے ظلم ہوگا بلکہ مستحب ہے کہ ان کو دیکھنے میں بھی مساوات کا خیال رکھے اور کشادہ روئی سے ان سب پر نظر ڈالے۔ نیز مستحب ہے کہ برابری کی رعایت ان کے ساتھ ہر موقع پر کی جائے اور یہ کہ شب جس بیوی کے ساتھ گزاری جائے صبح بھی اسی کے ساتھ رہا جائے۔ بلاشک عدل کی یہ قسم جو بیویوں کے برابر کے حقوق کے بارے میں ہے تفصیل کے ساتھ بتائی گئی ہے۔ یہ امر ممکن ہے اور انسانی طاقت اور اختیار میں ہے۔ اسی لئے اس کا حکم دیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں یہ خبر دی گئی کہ تم بیویوں میں ہرگز عدل نہ کر سکو گے کہ یہ اختیار و استطاعت بشر سے باہر ہے۔ اسے "مودت قلبی میں عدالت" کہا جاتا ہے جو میل و محبت سے عبارت ہے۔ مثلاً کیونکر تمام بیویوں سے مساوی محبت کرے گا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قلبی میلان کا تعلق محبت و الفت سے ہے کیونکہ محبت و الفت کا تعلق براہ راست دل سے ہے اور انسانی دل خود اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک شخص کی دو بیویاں ہوں تو وہ ظاہری طور پر تو ان میں عدل ضرور کرے گا مگر دل میں دونوں سے یکساں محبت نہ کر سکے گا۔ اگر اس کی ایک بیوی بد صورت ہو اور دوسری خوبصورت ہو تو اس کا دل اس کی خوبصورت بیوی کی طرف

زیادہ مائل ہوگا اور اسی طرح سے ایک بیوی اخلاق و اطوار کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہو اور دوسری اس صفت سے محروم ہو تو ایسی صورت میں شوہر کا دل اخلاق و اطوار رکھنے والی بیوی کی طرف زیادہ مائل ہوگا اور دوسری کی طرف کم مائل ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے میلان قلبی کو معاف کیا ہے اور ظاہری عدل کا حکم دیا ہے۔

الکافی میں مرقوم ہے کہ ابن ابی العوجاء نے حضرت ہشام بن الحکم کے سامنے مذکورہ دونوں آیات پڑھ کر کہا تھا کہ ان آیات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ حضرت ہشام نے امام جعفر صادقؑ سے یہ مسئلہ پوچھا تو آپؑ نے فرمایا: اِنَّ الْاٰيَةَ الْاُوْلٰى فِي النَّفَقَةِ وَالثَّانِيَةَ فِي الْمَوَدَّةِ. "پہلی آیت کا تعلق نان و نفقہ سے ہے اور دوسری کا تعلق مودت و محبت سے ہے۔"

دو بیویوں سے یکساں محبت کرنا ناممکن ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقة." (سورۂ نساء آیت ۱۲۹) کہ ایسی صورت میں صرف ایک بیوی کی طرف مائل نہیں ہونا چاہئے کہ دوسری معلق نظر آنے لگے کہ نہ تو اسے لطف زوجیت حاصل ہو اور نہ اختیار طلاق حاصل ہو۔

آنحضرتؐ کے ہاں کئی بیویاں تھیں اور آپؐ ان میں مکمل عدل کرتے تھے اور آپؐ نے ازواج کے لئے باری مقرر کی ہوئی تھی۔ مگر اس کے باوجود بھی آپؐ نے بارگاہ احدیت میں عرض کی تھی: اَللّٰهُمَّ هٰذِهٖ قِسْمَتِيْ فِيْمَا اَمْلِكُ فَلَا تَاْخُذْنِيْ فِيْمَا تَمْلِكُ وَلَا اَمْلِكُ. "خدایا! یہ وہ تقسیم ہے جو میری ملکیت میں تھی اور جو کچھ میری ملکیت سے خارج ہے اور تیری ملکیت میں ہے اس کے متعلق میرا مواخذہ نہ کرنا۔"

زنا کے لئے چار گواہ کیوں؟

سوال ۵۰

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

۱۔ ... وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ. (البقرہ ۲۸۳) "اور خبردار گواہی کو نہ چھپانا اور جو گواہی کو چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہوگا اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔"

(اور مزید ارشاد ہے:

۲۔ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ. (البقرہ ۱۴۰) "اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جس کے پاس خدائی شہادت موجود ہو اور وہ پھر پردہ پوشی کرے اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔")

آیات بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ سچی گواہی کو چھپانا حرام ہے اور اللہ تعالیٰ نے دو عادل گواہ مقرر فرمائے ہیں لیکن زنا کے مسئلے میں چار گواہ لازمی قرار دیئے گئے اور حد تو یہ ہے کہ اگر تین گواہ بھی زنا کی عینی گواہی دیں تو ان پر حد قذف اسّی کوڑے جاری ہوتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ جبکہ قرآن مجید گواہی دینے کو واجب قرار دیتا ہے؟ علاوہ ازیں چار گواہوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے برائی مزید پھیلتی ہے کیونکہ بدکار افراد کا خیال یہ ہوتا ہے کہ نہ تو چار گواہ ہوں گے اور نہ ہی ہم پر حد شرعی نافذ ہوگی۔

درخواست ہے کہ اس مسئلے کا شافی اور کافی جواب عنایت فرمائیں۔

جواب

تمام امور کے اثبات کیلئے دو عادل گواہ ہی کافی ہیں مگر زنا اور لواطت کے اثبات

کیلئے چار عادل گواہ ضروری ہیں۔ (اور یہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ.... (النور ۱۳) "پھر ایسا کیوں نہ ہوا کہ یہ چار گواہ بھی لے آتے۔")

چار گواہوں کے لئے "حکم تعبدی" ہے اور یقیناً اس میں وہ مصلحتیں ہوں گی جن کے سمجھنے سے ہم قاصر ہیں اور ممکن ہے کہ ان مصالح میں ایک مصلحت یہ بھی ہو کہ خداوند جل شانہ راضی نہیں ہے کہ یہ دو گناہ آشکار ہوں کیونکہ ان کا ظاہر ہونا ان کے ارتکاب کی جرأت اور ذلیل و خوار ہونے کا سبب ہے۔ اسی لئے ان دو گناہوں کو کبیرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا مشہور ہونا صفت غیرت کے منافی ہے۔

حدیث میں ہے کہ اللہ انبیاءؑ سے زیادہ غیرت مند ہے اور انبیاءؑ مومنین سے زیادہ غیرت مند ہیں۔

گواہی کا چھپانا وہاں حرام ہوتا ہے جہاں حق کا اثبات اور باطل کا ابطال گواہی پر موقوف ہو اور اس کے ساتھ نہ صرف گواہ کو اپنے لئے یا تمام مومنین کے لئے بلکہ جس پر گواہی دی جارہی ہو کے لئے کسی ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔

قرض کی گواہی کے متعلق تو یہ بھی شق موجود ہے کہ جب مقروض تنگ دست ہو اور قرض خواہ اس کی تنگدستی کو مدنظر نہ رکھے اور قاضی کی عدالت میں اس کے خلاف مقدمہ درج کرے اور گواہوں کی گواہی سے اس پر حق ثابت ہو جائے اور اس کے پاس ادائیگی کے لئے کچھ نہ ہو تو قاضی اس مقروض کو زندان میں بھیج سکتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں گواہوں کے لئے گواہی دینا صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح سے جو شخص زنا کے مقدمے میں حاکم شرع کے سامنے گواہی دینا چاہتا ہو تو اسے گواہی دینے سے قبل یہ دیکھ لینا چاہیے کہ آیا اس کے علاوہ تین دیگر عادل گواہ بھی موجود ہیں۔ اگر وہ یہ دیکھے کہ اس کے ساتھ تین اور گواہی کے لئے موجود ہیں تو گواہی دے اور اگر نصاب شہادت پورا نہ ہو اور گواہوں کی تعداد کم ہو تو

اسے گواہی نہیں دینی چاہئے کیونکہ چار سے کم افراد کی گواہی سے زنا ثابت نہیں ہوگا بلکہ ہر گواہ پر حد قذف بھی جاری کی جائے گی۔

کیونکہ حد کے جاری کرنے کے لئے زنا کی شہادت شرعی ثبوت کے بغیر دینا خود ان کی اپنی جانب سے ہے جو اعتراض کا باعث نہیں ہے اور یہ کہ سوال میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ طریقہ زنا کو پھیلانے کا سبب بنے گا صحیح نہیں بلکہ اس ذریعے سے قذف کو روکنے میں مدد ملتی ہے۔ سخت سزا کے پیش نظر لوگ ایک دوسرے پر زنا کا الزام نہیں لگا سکیں گے۔ نیز زنا کے گناہ کے بڑا ہونے کو سمجھیں گے۔

علم غیب

سوال ۵۱

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَافِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ۔

(لقمان ۳۴) "یقیناً اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی پانی برساتا ہے اور شکم کے اندر کا حال جانتا ہے اور کوئی نفس یہ نہیں جانتا ہے کہ وہ کل کیا کمائے گا اور کسی کو نہیں معلوم کہ اسے کس زمین پر موت آئیگی۔ بیشک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔"

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ غیب صرف ذات حق کے ساتھ مخصوص ہے جبکہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ بعض لوگ غیب کی خبریں دیتے ہیں اور وہ بالکل درست ثابت ہوتی ہیں۔

درخواست ہے کہ اس اشکال کو دور فرمائیں۔

جواب

تمام عوالم وجودی کے ظاہر و باطن کا احاطہ حضرت حق سبحانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک اور نظیر نہیں ہے۔ جس طرح سے وہ خالق کل ہے اسی طرح سے وہ تمام کائنات کو محیط ہے اور صرف وہی ہے جس کا علم اس کی عین ذات ہے۔

البتہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غیب ایسے ہیں جو صرف باری تعالیٰ سے مخصوص ہیں اور مخلوقات میں سے کسی کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کسی ملک مقرب اور کسی نبی مرسل کو بھی اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ ذات حق کی ماہیت و کیفیت و مکان کا تعلق بھی اسی سے ہے (جیسا کہ حضرت امیرالمومنینؑ نے دعائے مشلول میں کہا ہے: یَامَنْ لاَّ یَعْلَمُ مَاھُوَ وَلاَ کَیْفَ ھُوَ وَلاَ اَیْنَ ھُوَ اِلاَّ ھُوَ۔ "اے وہ ذات کہ جس کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے اور وہ کیسا ہے اور وہ کہاں ہے سوائے اُس کے۔")

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین اور ائمہ طاہرینؑ کو جتنا اس کی مشیت کا اقتضاء تھا، غیب کا علم عطا کیا ہے اور وہ اتنا ضرور جانتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے کا جو تذکرہ موجود ہے اس سے یہ مراد ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے پاس بھی ذاتی طور پر غیب کا علم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء و مرسلین کو غیب سے جتنا چاہا نوازا۔[۱]

۱۔ جیسا کہ سورۂ جن میں فرمان خداوندی ہے: عَالِمُ الْغَیْبِ فَلاَ یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلاَّ مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالاَتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا۔ (الجن ۲۶ تا ۲۸) "وہ عالم الغیب ہے اور اپنے غیب پر کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا ہے۔ مگر جس رسول کو پسند کرے تو اس کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر کردیتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات کو پہنچادیا ہے اور جس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس پر حاوی ہے اور سب کے اعداد کا حساب رکھنے والا ہے۔"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

علاوہ ازیں علم فراست رکھنے والے، منجمین اور علم جفر کے دعویدار جنات کی تسخیر کی وجہ سے جو کچھ بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں تو ان کی خبریں تمام حوادث کے متعلق نہیں ہوتیں بلکہ اقل القلیل حوادث کے متعلق ہوتی ہیں اور ان کی اطلاعات ہمیشہ ناقص ہوتی ہیں اور وہ کسی طور بھی وثوق کے قابل نہیں ہوتیں جبکہ ان کی بہ نسبت اگر کوئی حاذق طبیب کسی مریض کی نبض دیکھ کر اس کی سابقہ زندگی کے متعلق خبر دے تو وہ زیادہ صحیح ہوتی ہے کیونکہ اس کی خبر اس کی مہارت و تجربہ پر مبنی ہوتی ہے۔

علم فراست تمام ترظنیات پر مبنی ہے اور علم جفر ورمل اور اس طرح کے دیگر مخفی علوم بھی پوری طرح سے لوگوں تک نہیں پہنچے۔ اسی لئے ان کی اکثر پیشن گوئیاں غلط ثابت ہوتی ہیں اور ان کی خبر کے غلط ہونے کی بعض اوقات وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے محصلوں یا اپنے ہمزاد سے حاصل کردہ خبر سن کر اس کی پیشن گوئی تو کر دیتے ہیں لیکن انہیں اس کے موانع کا علم نہیں ہوتا۔ اسی لئے ان کی پیشن

(گزشتہ سے پیوستہ)

یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ غیب کا ذاتی علم صرف پروردگار کے پاس ہے لیکن وہ جس نمائندہ کو پسند کرتا ہے اسے اس علم کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور عطا کر دیتا ہے اور یہ بات علم غیب کے بارے میں افراط و تفریط کے درمیان ایک معتدل راستہ ہے جس سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اصل علم پروردگار کے پاس ہے اور بندہ کو عطائے پروردگار سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا جب تک عطائے پروردگار کا ثبوت نہ مل جائے یا بندے کا خدا سے مخصوص تعلق ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک علم غیب کے کسی دعویٰ کی تصدیق نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی بندے کو صاحب علم غیب تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اسی مخصوص تعلق ہی کی طرف قرآن مجید نے پسندیدہ رسول اور نمائندہ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ خدا اور اولیائے خدا کے علم غیب میں حسب ذیل فرق ممکن ہیں:

۱۔ خدا کا علم ذاتی ہے اور اولیائے خدا کا علم عطائی ہے۔
۲۔ خدا کا علم محیط ہے اور اولیائے خدا کا علم بقدر مشیت ہے۔
۳۔ خدا کا علم غیب فعلی ہے اور اولیائے خدا کا علم ارادی ہے۔

گوئی غلط ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً وہ ایک شخص کے مرنے کی پیشن گوئی کر دیتے ہیں لیکن وہ شخص صلہ رحمی کرتا ہے یا صدقہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی آئی ہوئی قضا کو اس سے ہٹا دیتا ہے اور یوں ان کی پیشن گوئی غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

اسی لئے شریعت طاہرہ نے ان لوگوں کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا اور ان کی تصدیق کرنے سے روکا ہے اور اس کے، عکس یہ حکم دیا گیا کہ وہ خدا پر بھروسہ رکھیں اور محنت سے اپنا کام جاری رکھیں اور صدقہ دیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں خلاصہ یہ ہے کہ تمام عوالم کے علم ذاتی کا عالم صرف اور صرف خدائے عزوجل ہے اور علوم غیبیہ جو انبیاء و ائمہ علیہم السلام کے پاس ہیں وہ خداوند عالم کے ان پر وہبی انعامات میں سے ہیں۔ نیز یہ کہ اگر کبھی کسی نجومی وغیرہ کی کوئی پیشن گوئی سچی بھی ثابت ہو جائے تو یہ محض اتفاق ہوتا ہے۔ ورنہ ان کی اکثر و بیشتر پیشن گوئیاں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں۔

یہ نکتہ ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ منجمین کی خبر علم غیب کی جائے ظن اور وہم پر مبنی ہوتی ہے جسے کسی طرح سے بھی علم غیب کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا اور ان کے علم کی بنیاد بھی تخمین و ظن پر ہے اور پھر یہ کہ ان کی پیشن گوئی ظاہری اسباب کی مرہون منت ہوتی ہے جبکہ علم غیب بدون اسباب اللہ تعالیٰ سے مخصوص ہے یا وہ جسے جتنا چاہے عطا کر دے اور مزید یہ کہ منجمین کی خبر ہمیشہ اجمالی ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی منجم کسی شخص کی موت کی خبر دیتا ہے تو وہ یہ نہیں بتا سکے گا کہ اسکی زندگی کا خاتمہ کس وقت ہوگا اور کن حالات میں اسکی زندگی کا چراغ گل ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کے تمام واقعات اور ان کی جزئیات و خصوصیات کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

انما الغیب للّٰہ ولاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلی العظیم۔

مسائل فقہیہ

سوال ۵۲

نوافل اور مستحبات میں کیا فرق ہے اور نوافل یومیہ کو کس وقت تک ادا اور کب قضا کی نیت سے پڑھنا چاہئے؟

جواب

نوافل سے وہ تمام اعمال مراد ہیں جو قرب خداوندی کے لئے مطلوب ہوں لیکن ان کی ادائیگی ضروری نہ ہو اور انہیں ترک کرنا جائز ہو۔

لغوی طور پر تمام مستحبات "نوافل" کا حصہ ہیں۔ البتہ فقہاء کے نزدیک لفظ افل خاص ہے اور اس سے غیر واجب نمازیں مراد لی جاتی ہیں۔ نوافل کا اطلاق تمام ستحب نمازوں پر کیا جاتا ہے جن میں افضل نوافل یومیہ ہیں جو کہ چونتیس رکعات ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

فجر کے دو نوافل ہیں اور ظہر اور عصر کے آٹھ آٹھ نوافل ہیں۔ مغرب کے چار نوافل ہیں اور عشاء کے دو نوافل ہیں جو بیٹھ کر ادا کئے جاتے ہیں اور اگر کھڑے ہو کر ادا کئے جائیں تو صرف ایک رکعت پڑھنا پڑتی ہے۔ اسی لئے اسے ایک تصور کیا جاتا ہے اور نماز شب کی گیارہ رکعات ہیں۔

ظہر کے نوافل کو فریضہ ء ظہر سے پہلے پڑھنا چاہئے اور سورج کے زوال

سے لیکر سایہ دو برابر ہونے تک انہیں ادا کیا جاسکتا ہے اور عصر کے نوافل کو فریضہ ء عصر سے پہلے ادا کرنا چاہئے اور سایہ چار برابر ہونے تک انہیں ادا کیا جاسکتا ہے۔

اگر نماز ظہر و عصر کے نوافل قضا ہو جائیں تو نماز عصر کے بعد ان کی قضا بجالائی جاسکتی ہے۔ پہلے ظہر کے نوافل ادا کئے جائیں پھر عصر کے نوافل ادا کئے جائیں اور نیت میں ادا اور قضا کی نیت نہیں کرنی چاہئے بشرطیکہ نوافل دن میں ہی ادا کئے جائیں اور اگر نوافل رات کے وقت ادا کئے جائیں تو قضا کی نیت سے ادا کئے جائیں۔

نماز مغرب کے نوافل نماز مغرب کے بعد ادا کرنے چاہئیں اور افق کی سرخی غائب ہونے تک انہیں پڑھا جاسکتا ہے اور جب افق کی سرخی غائب ہو جائے اور سیاہی چھا جائے تو ان کی قضا پڑھنی چاہئے۔

نماز عشاء کے نوافل فریضہ ء عشاء کے بعد آدھی رات تک پڑھے جاسکتے ہیں۔ فجر کے نوافل نماز فجر کے فریضہ سے قبل پڑھے جاتے ہیں اور فجر اول سے مشرق کی سرخی نمودار ہونے تک انہیں پڑھا جاسکتا ہے۔

نماز شب کا وقت نصف شب سے شروع ہو کر اذان فجر تک باقی رہتا ہے اور جسے یہ اندیشہ ہو کہ وہ بیدار نہیں ہو سکے گا وہ نصف شب سے پہلے بھی پڑھ سکتا ہے۔[1]

نماز شفع میں قنوت کا کیا حکم ہے؟

سوال ۵۳

نماز شب اور بالخصوص نماز شفع کے لئے سورۃ اور قنوت کی روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ کس طرح سے ادا کرتے ہیں۔ اس کی وضاحت فرمائیں؟

[1] امام جعفر صادقؑ نے اول شب میں نماز تہجد پڑھنے سے منع فرمایا ہے بعد اسکے دن اس کی قضا بجالانے کو افضل قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو "من لا یحضرہ الفقیہ" حدیث ۱۳۷۷، ۱۳۷۸۔

جواب

نماز شب یعنی نماز تہجد کی آٹھ رکعتیں ہیں اور ہر دو رکعتوں کے آخر میں سلام پڑھا جائے گا اور یوں آٹھ رکعتیں چار سلاموں سے مکمل ہوں گی اور ہر دوسری رکعت میں رکوع سے قبل دعائے قنوت مستحب ہے اور اس کے لئے کتب ادعیہ میں دعائیں اور سورتیں لکھی ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔

نماز شفع بھی دوسری دو رکعتوں کی طرح سے پڑھنی چاہئے البتہ دوسری رکعت کی قنوت میں اختلاف ہے اور فقہاء میں قول مشہور یہ ہے کہ نماز شفع میں قنوت مستحب ہے ابوالضحاک کی روایت میں مذکور ہے:

امام علی رضاؑ نے نماز شفع کی دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھی۔ لیکن عبداللہ بن سنان نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: القنوت: وفی الوتر فی الرکعة الثالثة. "وتر کی تیسری رکعت میں قنوت پڑھنی چاہئے۔" (بحارالانوار ج ۸۷، ص ۲۲۳)

پس قنوت کا پڑھنا افضلیت اور تاکید استحباب پر محمول ہے، اسے ترک نہیں کرنا چاہئے اور اسے اہمیت دینی چاہئے قنوت وتر کی واحد رکعت میں ہے جسے تیسری رکعت شمار کیا جاتا ہے۔

اور فقیر کا دستور العمل یہ ہے کہ جب بھی مجھے نماز شب کی توفیق نصیب ہوتی ہے تو میں نماز شفع کی دوسری رکعت میں دعائے قنوت ضرور پڑھتا ہوں۔

مفردہ وتر میں قنوت کی زیادہ تاکید ہے قرأت کے بعد قنوت میں ستر مرتبہ "اَستَغفِرُ اللّٰهَ وَ اَسئَلُهُ التَّوبَةَ" پڑھنا چاہئے۔

الفقیہ اور مصباح شیخ کفعمی میں مذکور ہے: امام سجادؑ قنوت وتر میں تین سو مرتبہ "اَلعَفو" پڑھا کرتے تھے۔

نماز شب کی مزید ادعیہ و تعقیبات کے لئے دعاؤں کی کتابوں (مصباح اور مفاتیح الجنان) کی طرف رجوع کریں۔

ادائیگی قرض کی اہمیت

سوال ۵۴

اگر وقت نماز میں کوئی قرض خواہ کسی مقروض سے اپنے قرضہ کا مطالبہ کرے تو کیا مقروض کو پہلے نماز پڑھنی چاہئے یا قرض ادا کرنا چاہئے اور یہ بھی خیال رہے کہ اگر مقروض قرضہ کو واپس کرے تو نماز کا اول وقت نکل جائے گا اور اسے مشترک وقت میں نماز ادا کرنی پڑے گی۔

جواب

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جب کسی مکلف پر بیک وقت دو امر واجب ہوں اور ان میں سے ایک کا وقت وسیع ہو اور دوسرے کا تنگ ہو تو انسان کو پہلے وہ فریضہ ادا کرنا چاہئے جس کا وقت تنگ ہو پھر دوسرے فرض کو ادا کرنا چاہئے۔ انسان جب تک تنگ وقت کا فریضہ ادا نہ کرے اس وقت تک اسے وسیع وقت کا فریضہ ادا نہیں کرنا چاہئے۔ لہذا اگر قرض خواہ اپنے قرض کا مطالبہ کرے اور وہ اس کے لئے جلد ادائیگی کی خواہش کا اظہار کرے تو مقروض کو چاہئے کہ اول وقت میں نماز ادا نہ کرے اس کی بجائے مشترک وقت میں نماز ادا کرے۔

اگر کوئی شخص قرض خواہ کو قرضہ ادا کرنے میں تاخیر کرے اور اس کی بجائے نماز پڑھنے میں مصروف ہو جائے تو وہ معصیت کار شمار ہوگا اور بر بنائے احتیاط اسے اپنی نماز کا اعادہ کرنا چاہئے۔

اور اگر کوئی شخص وسیع وقت میں نماز پڑھنے میں مصروف ہو اور دوران نماز قرض خواہ اس سے اپنا قرض طلب کرے اور قرض کی ادائیگی نماز توڑنے پر موقوف ہو تو اسے اپنی نماز توڑ دینی چاہئے اور قرض ادا کرنا چاہئے۔ اگر وہ اپنی نماز کو نہ توڑے تو وہ معصیت کار متصور ہوگا جبکہ اس کی نماز درست ہوگی مگر بہتر احتیاط اسے نماز کا اعادہ کرنا چاہئے۔

مال حرام سے خریداری

سوال ۵۵

اگر کوئی شخص مال حرام سے لباس خریدے اور دل میں یہ ارادہ رکھے کہ مناسب وقت پر وہ مال اصل مالک کو واپس کر دے گا تو آیا اس کے لئے اس لباس کا استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب

جب بھی کوئی شخص کسی معین حرام کی رقم سے کوئی چیز خرید کرے تو معاملہ باطل ہے اور خرید کردہ چیز میں ہر قسم کا تصرف حرام ہے اور وہ چیز اسی کی متصور ہوگی جس کی دولت سے اس نے مذکورہ چیز خرید کی ہوگی اور خریدار کی ملکیت میں منتقل نہ ہوگی۔

البتہ اگر کوئی شخص لباس یا کوئی دوسری چیز ادھار خریدے اور دوکاندار کے ادھار کی ادائیگی مال حرام سے کرے تو معاملہ صحیح ہوگا اور خرید کردہ چیز میں تصرف حلال ہوگا۔ لیکن حقدار کو رقم کی واپسی اس پر باقی رہے گی اور اسے چاہئے کہ وہ حقدار کو اس کا حق فوراً واپس کرے۔

بیک وقت قصر و تمام کا حکم کیوں؟

سوال ۵۶

مسافر کے لئے نماز قصر میں یہ فلسفہ پوشیدہ ہے کہ مسافر کو سہولت بہم پہنچائی جائے جبکہ علماء و مراجع کی کتب فقہ میں بعض احکام کے ضمن میں یہ حکم موجود ہے کہ مسافر کو احتیاط واجب کی بنا پر قصر اور مکمل نماز ادا کرنی چاہئے۔ تو کیا اس حکم سے مسافر کی زحمت دوگنا چوگنا نہ ہو جائے گی؟

جواب

اس سوال کا جواب ایک تمہید پر موقوف ہے جسے مختصر الفاظ میں ہم یوں بیان کرتے ہیں:

جب ادلہ شرعیہ یعنی قرآن و سنت اور اجماع و عقل سے کوئی حکم ثابت ہو جائے تو مکلف کے لئے اس کا بجالانا ضروری ہو جاتا ہے اور مکلف کا یہ بھی فریضہ ہے کہ وہ اس حکم کو اس انداز سے بجالائے کہ اسے خود یقین ہو جائے کہ میں نے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔

عقل انسانی کا یہی فیصلہ ہے اور اپنے فرض سے عہدہ برا ہونے کا یقین دو طرح سے حاصل ہوتا ہے:

۱۔ تفصیلی:

انسان کو اپنے فریضہ سے عہدہ برا ہونے کا یقین اس وقت ہوتا ہے جب وہ اس کے تمام اجزاء و شرائط پر مکمل عمل کرے۔ مثلاً شریعت طاہرہ کا حکم ہے کہ نماز کے لئے آب مطلق سے وضو کیا جائے (اور دو اعضاء کو دھویا جائے اور دو اعضاء کا مسح کیا جائے۔) اس صورت میں کہ مکلف آب مطلق رکھتا ہو اور اس سے وضو

کرے۔ لہذا اگر کوئی شخص مذکورہ شرائط کے تحت وضو کرے گا تو اسے یقین ہو جائے گا کہ میں اپنے فریضہ سے باحسن وجوہ عہدہ برا ہو چکا ہوں۔

۲۔ اجمالی :

انسان کو اجمالی یقین کا مرحلہ اس وقت پیش آتا ہے جب وہ تفصیلی یقین حاصل کرنے سے بوجہ قاصر ہو۔ اسی لئے وہ اپنے عمل کو باربار سرانجام دیتا ہے تاکہ اسے اپنے فریضہ کی ادائیگی کا یقین ہو جائے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس دو برتنوں میں پانی بھرا ہوا ہو اور ان برتنوں کے علاوہ اس کے پاس پانی موجود نہ ہو اور تلاش کرنے پر بھی پانی ملنا مشکل ہو اور اسے یہ یقین ہو کہ ان برتنوں میں سے ایک کے اندر مضاف پانی ہے مگر اسے یہ پتہ نہ چل سکتا ہو کہ کس برتن کا پانی مضاف ہے اور کس برتن کا پانی مطلق ہے۔ اب اگر وہ ایک برتن کے پانی سے وضو کرے تو اسے وضو کی صحت کا یقین ہرگز پیدا نہ ہوگا کیونکہ یہ احتمال بہر حال قائم رہے گا کہ ممکن ہے کہ پانی مضاف ہو۔

ایسے موقع پر عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے فریضہ کی صحت کے یقین کے لئے اسے دونوں برتنوں سے وضو کرنا چاہئے۔ لہذا ایسے شخص کے لئے یہ پوچھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ شخص مذکور سے وضو کا تکرار کیوں کرایا گیا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم اصل سوال کی طرف آتے ہیں۔

جب مسافر کے لئے تمام شرائط مکمل ہیں یا کچھ کم ہیں اور انسان کسی نتیجہ پر بھی نہ پہنچ سکتا ہو تو اسے اپنے فرض سے عہدہ برا ہونے کا یقین حاصل کرنے کیلئے دونوں طریقوں پر عمل کرنا پڑے گا۔ وہ نماز قصر بھی پڑھے گا اور پوری بھی پڑھے گا۔

اس سے زیادہ سادہ لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شارعؑ نے نماز کی تکرار کا حکم نہیں دیا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ حکم قصر کے فلسفہ کے خلاف ہے۔ یہ

عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ اور اس مقام پر عقل یہ کہتی ہے کہ دونوں طرح سے نماز پڑھی جائے تاکہ یہ یقین پیدا ہو جائے کہ فریضہ کی ادائیگی صحیح طریقہ سے ہوئی ہے۔

قطبین میں نماز کیسے پڑھی جائے؟

سوال ۵۷

قطب شمالی اور قطب جنوبی کے قریب جہاں رہائش ممکن ہے وہاں کے مسلمان اپنی پنجگانہ نمازیں کیسے پڑھیں جبکہ وہاں چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات ہوتی ہے؟

جواب

جہاں تک ہماری اطلاعات کا تعلق ہے تو اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں انسانی آبادی کی رہائش ناممکن ہے اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ وہاں رہائش رکھی جاسکتی ہے تو ایسے مقام پر کسی مسلمان کو رہائش نہیں رکھنی چاہئے کیونکہ ایسے مقام پر اوقات نماز کا تعین مشکل ہے اور ایسے مقام پر ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنے اور کھولنے کا وقت طے کرنا مشکل ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو وہاں رہائش اختیار نہیں کرنی چاہئے اور اگر کوئی مسلمان ایسے مقام پر رہائش پذیر بھی ہو تو اسے وہاں سے ہجرت کرنی چاہئے۔

فقہائے کرام "تعرف بعدالهجرة" کے مسئلہ پر متفق ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی شہر یا ملک میں احکام اسلام پر عمل کرنا دشوار اور ناممکن ہو تو وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہو جاتا ہے اور اس کی بجائے کسی ایسے شہر اور ملک میں چلے جانا واجب ہو جاتا ہے جہاں وہ اپنے دینی احکام پر عمل کر سکتا ہو اور اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا۔

وَ نَقَلَ الْمَجْلِسِیُّ عَلَیْهِ الرَّحْمَةُ عَنِ الْعَلاَّمَةِ (ره) فِیْ کِتَابِ الْمُنْتَهٰی لَمَّا نَزَلَ قَوْلُهٗ تَعَالٰی "اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا" اَوْجَبَ النَّبِیُّ الْمُهَاجَرَةَ عَلٰی مَنْ یَّضْعُفُ عَنْ اِظْهَارِ شَعَائِرِ الْاِسْلَامِ.

علامہ مجلسیؒ نے کتاب المنتھی میں علامہ سے نقل کیا ہے کہ جب قرآن مجید کی یہ آیت "اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا" کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے ؟ نازل ہوئی تو پیغمبر اسلامؐ نے ہر اس شخص پر ہجرت کو فرض قرار دیا جو شعائر اسلام بجالانے سے قاصر ہو۔

اگر بالفرض کسی مسلمان کو کسی مجبوری کی وجہ سے وہاں رہنا پڑے تو وہ کرۂ ارض کے درمیان میں واقع ممالک کے نظام الاوقات کے تحت اپنی نمازیں بجالائے اور اسی طرح ماہ مبارک رمضان کے اوقات کا تعین کرے اور اسی وجہ کو مرحوم سید نے رسالہ عروۃ الوثقیٰ میں رقم فرمایا ہے کہ جو کوئی ان مقامات میں ہو وہ اوقات نماز کے لئے متعارف ممالک کے اوقات سے رجوع کرے اور آج کے دور میں ایسا کرنا بڑا آسان ہے کیونکہ گھڑی، ریڈیو اور ٹیلی گراف اور ٹی وی کے ذریعے سے انسان بخوبی معلوم کرسکتا ہے کہ دوسرے ممالک میں اس وقت کیا وقت ہوا ہے اور ان میں نماز کا کیا وقت مقرر ہے۔ اور دوسرے ممالک کے نظام الاوقات کو مدنظر رکھ کر ماہ رمضان کے روزے رکھنے اور کھولنے کے وقت کا تعین کرے۔[1]

میں عرض کرتا ہوں کہ ہر چند ان مقامات پر آفتاب طلوع و غروب نہیں کرتا اور وہاں کی راتیں دائرہ کی حرکت کی طرح محسوس ہوتی ہیں لیکن وہاں آفتاب کے سب سے بلند مقام کو ظہر خیال کرنا چاہئے اور اس کی حرکت کے سب سے نچلے

۱۔ ناچیز کا خیال ہے کہ قطبین میں رہائش پذیر افراد کو چاہئے کہ وہ اپنی عبادات کے لئے خانہ کعبہ کے اوقات کو میزان قرار دیں اور کعبہ شریف کے نماز روزہ کے اوقات کو اپنی عبادات کے لئے معیاری وقت قرار دیں۔ ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب ۔ من المترجم عفی عنه۔

نقطے کو نصف شب متصور کرنا چاہئے اور ان کے درمیان اوقات نماز کا تعین کرلینا چاہئے اور یہ وجہ قوت سے خالی نہیں ہے۔

غلاموں کی خرید و فروخت

سوال ۵۸

کیا موجودہ دور میں غلاموں کی خرید و فروخت جائز ہے ؟ اگر اگر کوئی شخص افریقہ کے چند وحشیوں کو پکڑ کر اپنا غلام بنالے اور دوسرے ملک میں لے جاکر انہیں فروخت کرے تو کیا اس کا یہ عمل شرعی اعتبار سے درست ہوگا؟

علاوہ ازیں قرآن مجید میں جان بوجھ کر روزہ توڑنے اور چند دیگر امور کے لئے غلام آزاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور موجودہ دور میں غلامی نظام نہ ہونے کی وجہ سے ان احکام پر عمل ناممکن ہوچکا ہے تو کیا یہ حکم مطلق اور ہمیشہ کے لئے ہوگا؟

جواب

جی ہاں! مسلمان کے لئے جائز ہے کہ کافر کو پکڑ کر اپنا غلام بنالے۔ خواہ وہ کسی بھی رلو پر ہو اور جہاں بھی ہو اسے پکڑلے اور اپنا غلام قرار دے لے۔ البتہ غلام بنانے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ان کفار سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ تو موجود نہیں اور وہ کافر ذمی تو نہیں ہیں۔ اگر معاہدہ موجود نہ ہو اور وہ اسلامی ریاست کے ذمی بھی نہ ہوں تو ایسے کافروں کو غلام بنانا جائز ہے اور ان کی خرید و فروخت حلال ہے۔

اور جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ اسلام نے بہت سے مقامات پر غلام آزاد کرنے کو واجب کیا ہے اور موجودہ دور میں غلاموں کا کہیں وجود نہیں ہے کیونکہ چند ہی سال گزرے ہیں کہ غلامی متروک قرار دی گئی ہے اسی لئے غلام آزاد کرنے کا

حکم ساقط ہے اور اس کے بدلے میں بھی کوئی حکم موجود نہیں ہے اور اس کے لئے کفارہ مخیرّہ اور کفارہ جمع میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اسلام میں غلام بنانے کی حکمت

جب سے ریاستہائے متحدہ امریکہ نے غلامی کو ختم کرنے کا اعلان کیا ہے تب سے ہی اسلام دشمن عناصر نے (اپنے مخصوص اہداف حاصل کرنے کے لئے) اسلام کو مسئلہ غلامی کی وجہ سے اپنی شدید ترین تنقید کا نشانہ بنالیا ہے (اور دنیا کو یہ باور کرانے میں مصروف ہیں کہ اسلام انسانی آزادی کا قائل نہیں ہے اور اسلام غیر مسلموں کو انسانی حقوق دینے پر آمادہ نہیں ہے وہ انہیں ہر قیمت پر مسلمانوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔)[1]

اور امکان ہے کہ بعض غیر مطلع لوگوں کے ذہنوں میں اس (زہریلے

۱۔ جس وقت اسلام دنیا میں نمودار ہوا اس وقت پوری دنیا میں غلامی کا رواج تھا اسی لئے اسلام نے اسے ممنوع قرار نہیں دیا اور اس کی بجائے اس نے غلاموں کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ آسان بنایا اور اسلام نے غلام آزاد کرنے کے عمل کو انسانیت کی عظیم خدمت قرار دیا اور اس کے ساتھ ساتھ قتل خطا اور روزہ اور دیگر خطاؤں کے کفارے میں غلام آزاد کرنے کا حکم دیا اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک روا رکھنے کا درس دیا۔ حد یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے پیروکاروں کو یہ حکم دیا کہ تم انہیں غلام اور کنیز کہہ کر نہ پکارو بلکہ اس کی بجائے بیٹا، بیٹی کے الفاظ سے انہیں آواز دو۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے مشہور خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا: غلاموں کو ان کی طاقت سے زیادہ کام کرنے پر مجبور نہ کرو اور جو خود کھاؤ انہیں بھی کھلاؤ اور جو خود پہنو انہیں بھی پہننے کے لئے دو۔

غرضیکہ اسلام نے غلاموں کو شفقت و محبت دی اور پوری دنیا یہ جانتی ہے کہ زید بن حارثہ نبی اکرمؐ کا غلام تھا لیکن رسول اکرمؐ نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا قرار دیا تھا اور آپؐ نے اس کی شادی اپنی پھوپھی زاد کے ساتھ کی تھی۔ اگر اسلام دشمن افراد کے پاس اس سے بہتر مثال موجود ہو تو پیش کریں۔

علاوہ ازیں اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اسلام نے غلامی کی اجازت اس لئے نہیں دی تھی کہ اسے انسانی آزادی سے چڑ تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پروپیگنڈے) کا اثر ہو گیا ہو۔ لہٰذا اس حکم کی حکمت کے بارے میں مختصر اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ غلامی صرف اسلام سے مخصوص نہیں رہی بلکہ تمام قوموں میں ہر زمانے میں اس کا وجود رہا ہے اور ہر قوم میں غلامی اور غلام کے بارے میں مخصوص طریقہ رائج رہا ہے اور ان میں سے بعض کا طریقہ تو بہت (لرزا دینے اور) رلانے والا رہا ہے۔ خاص طور پر غلامی کا مشغلہ یورپ میں بہت دردناک انداز میں رہا اور اپنے غلاموں کے ساتھ ان کے برتاؤ دل دہلا دینے والے تھے۔ (جو کوئی یورپ، امریکہ اور تمام اقوام میں ان واقعات کی تفصیل معلوم کرنا چاہے وہ کتاب دائرۃ المعارف مصری سے رجوع کرے)۔

اور بالجملہ دین مقدس اسلام میں یہ حکم تمام نوع بشر کے درمیان جاری رہا ہے اس شرط کے ساتھ کہ کافر غلام ہو اور ذمی نہ ہو۔ درحقیقت کافر کی غلامی نہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان خدا پرست بنیں اور متعدد خداؤں کی بجائے خدائے واحد کی اطاعت کریں اور دنیا میں آزاد و متمدنانہ زندگی بسر کریں۔ اسی ہدف کے حصول کے لئے اسلام نے غلامی کو جائز قرار دیا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وحشی قبائل کے افراد جب مسلمانوں کی غلامی میں آئے تو آزاد لوگوں کے آقا بن گئے اور جب وحشی غلاموں نے مسلمانوں سے قرآن مجید سنا اور انسانیت کا درس حاصل کیا تو وہ اپنی رضا و رغبت سے مسلمان بن گئے اور یوں اس غلامی کی وجہ سے انہیں صدیوں کی جہالت اور نادانی سے نجات ملی اور وہ معاشرے کے لئے کارآمد افراد بن گئے۔

اسلامی تاریخ میں ہمیں ایسی مثالیں بہ کثرت مل سکتی ہیں کہ غلام وزیر بنے، غلام مشیر سلطنت کے عہدوں پر فائز ہوئے، غلام سپہ سالار بنے اور ملکوں کے فاتح کہلائے۔ دنیا کے نقشے پر آج بھی ہمیں جبرالٹر کا نام دکھائی دیتا ہے جو کہ جبل الطارق کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور طارق بن زیاد ایک غلام ہی تھا۔ مگر یہ اسلام کا فیض ہے جس نے ایک غلام کو سپہ سالار کا منصب عطا کیا اور یوں اس کے نام سے زمین کا ایک خطہ مخصوص ہو کر رہ گیا۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام غلام برائے غلامی کا قائل نہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

صرف خود اس کے حق میں بلکہ عالم بشریت کے لئے ایک اعزاز ہے کیونکہ وہ غلامی کے واسطے سے مسلمانوں سے نزدیک ہو جاتا ہے اور دین اسلام کے حقائق سے باخبر اور آگاہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً شرع میں غلاموں کے بارے میں جو احکامات دیئے گئے ہیں (جیسا کہ اشارہ کیا گیا) کا مشاہدہ کر کے اور ان غلاموں کے حالات جان کر جو روحانیت اور تقویٰ کے مقامات پر فائز ہونے میں کامیاب ہوئے جن کے متعدد تذکرے کتب تواریخ میں درج ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کچھ افراد خدا پرستی اور تقویٰ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ نیز چند غلام اپنی دانائی اور مستعدی کی بدولت اسلام کے اہم بازو ثابت ہوئے اور ان میں سے بعض نے وزارت اور بادشاہی کا منصب بھی حاصل کیا۔

غلاموں کے بارے میں شرعی احکام

جو کوئی احکام شرع سے واقف ہے اس پر یہ پوشیدہ نہیں ہے کہ شرع مقدس نے غلاموں کے آزاد کرنے کی کس قدر کوشش کی ہے اور یہ کہ جو کوئی غلام ہوگا مسلمانوں کے قرب سے فائدہ اٹھانے کے بعد آزاد ہو جائے گا اور ان امور کی انجام دہی کے لئے واجب اور تاکیدی احکام صادر فرمائے ہیں جن میں کفارۂ قتل اور روزہ توڑنے کا کفارہ وغیرہ قرار دیئے ہیں۔ نیز غلاموں کے بارے میں تاکیدی سفارشات کی ہیں۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

بلکہ غلام برائے تعلیم و تربیت و تمدن کا قائل ہے اور اسلام نے غلامی کی اجازت صرف اسی لئے دی تاکہ اس ذریعے سے، وحشی افراد کو، انسان اور جاہلوں کو، صاحب علم اور بت پرستوں کو، خدا پرست بنا کر معاشرے کے حوالے کیا جائے اور دنیا سے جہالت کی تاریکیوں کا خاتمہ کیا جا سکے۔ (از مترجم)

غلاموں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک

اسلام نے غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید نے جہاں "بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا" کے تحت ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا وہاں "وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" (سورۂ نساء آیت ۳۶) کہہ کر غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ بھی مشفقانہ سلوک کا حکم دیا۔

پیغمبر اسلامؐ اور ان کے وصی برحق نے اپنی وصیت میں انہیں یاد رکھا اور فرمایا: وَعَلَیْکُمْ بِالضَّعِیْفَیْنِ اَلنِّسَآءَ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ. (معانی الاخبار ص ۲۸۲)

"دو کمزور طبقوں، عورتوں اور غلاموں کا خصوصی خیال رکھنا۔"

ولیمہ، وکیرہ اور حبوہ سے کیا مراد ہے؟

سوال ۵۹

ولیمہ اور وکیرہ میں کیا فرق ہے نیز "حبوہ" سے کیا مراد ہے؟

جواب

"ولیمہ" کھانا کھلانے کو کہا جاتا ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں اور "وکیرہ" بھی اس کی ایک قسم ہے اور مکان خریدنے یا مکان تعمیر کرنے پر جو کھانا کھلایا جائے اسے "وکیرہ" کہا جاتا ہے۔

حضرت رسول اکرمؐ کا فرمان ہے: لاَ وَلِیْمَةَ اِلاَّ فِیْ خَمْسٍ فِیْ عُرْسٍ اَوْ خُرْسٍ اَوْ عِذَارٍ اَوْ وِکَارٍ اَوْ رِکَازٍ.

معانی الاخبار میں امام علی رضاؑ سے درج بالا حدیث کی حسب ذیل تشریح

منقول ہے: فاما العرس فالتزویج، والخرس النفاس بالولد، والعذار الختان، والوکار الذی یشتری الدار، والرکاز الرجل یقدم من مکة. "پانچ مقامات پر کھانا کھلانا چاہئے: (۱)شادی کے موقع پر۔ (۲)بچہ کی پیدائش پر۔ (۳)بچہ کے ختنہ کے وقت۔ (۴)گھر خریدنے کے وقت۔ (۵)سفر حج سے واپسی پر۔

دوسری حدیث میں ہے: مکان خریدنے پر کھانا کھلایا جائے اور نیا مکان تعمیر کرنے پر موٹا تازہ دنبہ ذبح کر کے مسکینوں میں اس کا گوشت تقسیم کیا جائے۔

"حبوہ" سے مراد یہ ہے کہ باپ کی میراث میں سے اس کا لباس اور اس کی انگوٹھی اور تلوار اور اس کا قرآن بڑے بیٹے کو دیا جائے لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ مرنے والا کا ترکہ صرف مذکورہ چیزوں میں ہی منحصر نہ ہو اور مذکورہ سامان مرنے والے کے قرضے کی مقدار میں نہ ہو۔

تقیہ کیا ہے؟

سوال ۶۰

تقیہ کی تعریف کریں اور یہ بھی واضح فرمائیں کہ کیا نبی و امام نے بھی تقیہ کیا تھا اور شیعوں کے متعلق تقیہ کا کیا حکم ہے؟

جواب

شیخ انصاری رحمۃ اللہ نے تقیہ کی حسب ذیل تعریف کی ہے:

"التحفظ عن ضرر الغیر بموافقته فی قول او فعل مخالف للحق." یعنی تقیہ اپنے آپ کو غیر کے ضرر سے بچانے کا نام ہے کہ انسان حق کی مخالفت میں کسی کے قول و فعل میں موافقت کرے۔

اقسام تقیہ

شہید اول علیہ الرحمہ نے تقیہ کی پانچ اقسام بیان کی ہیں: (۱)واجب (۲)حرام (۳)مستحب (۴)مکروہ (۵)مباح۔

اسی طرح شیخ رحمۃ اللہ نے رسالہ تقیہ میں تقیہ کی مذکورہ پانچ اقسام پر بحث کی ہے اور ہر ایک قسم کے موقع و محل کا تذکرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

واجب تقیہ

تقیہ کی اس قسم کا موقع یہ ہے کہ تقیہ کی وجہ سے انسان کسی ایسے نقصان سے محفوظ رہ سکے جس سے بچنا انتہائی ضروری ہو۔ مثلاً انسان تقیہ کے ذریعے سے اپنی جان یا کسی دوسرے کی جان یا ایسے مال کو ضرر سے بچا سکے جس کی حفاظت ضروری ہو اور جب انسان کو تقیہ نہ کرنے کی وجہ سے اپنی یا کسی دوسرے مومن کی جان کو ضرر پہنچنے کا علم ہو یا گمان ہو تو تقیہ واجب ہو جاتا ہے۔

مستحب تقیہ

جب انسان کو اس موقع پر تو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو لیکن ترک تقیہ کی وجہ سے مستقبل میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ مثلاً کوئی مومن کسی ایسے شہر میں رہتا ہو جہاں اغیار بہت زیادہ ہوں تو اگر وہ مومن ان سے تعلقات قائم نہ کرے اور ان کی جماعت میں کبھی شریک نہ ہو جس کی وجہ سے عامۃ الناس کی مخالفت کا اندیشہ ہو اور اس سے نقصان پہنچنے کا امکان ہو تو ایسی صورت میں تقیہ کرنا مستحب ہے۔

ناقابل برداشت ضرر سے بچنے کیلئے تقیہ کرنا مستحب ہے اور مستحب تقیہ کے تحت انسان ایسے مستحبات کو چھوڑ سکتا ہے جو اغیار کی نظر میں ناپسندیدہ ہوں۔ مثلاً بعض اجزائے اذان کو بھی انسان چھوڑ سکتا ہے اور اگر اغیار سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے کو حرام

اور بدعت سمجھتے ہوں اور سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے کی وجہ سے اسے یا کسی دوسرے مومن کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو پھر تقیہ واجب ہو جائیگا اور سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے کی وجہ سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو صرف نفرت کا احتمال ہو تو پھر تقیہ مستحب ہوگا۔

مکروہ تقیہ

جب انسان کو حال اور مستقبل میں کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو مگر وہ مستحب امور کو ترک کردے اور اس کے ترک کرنے کے وجہ سے لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ یہ امور مستحب نہیں ہیں اس صورت میں تقیہ کرنا مکروہ ہوگا۔

علاوہ ازیں ایسے موارد بھی مکروہ تقیہ میں شمار ہوں گے جن سے بعض ترجیحات کی بناپر نقصان اٹھانا پڑے۔ مثلاً ایسا شخص جو معاشرے میں لائق توجہ و راہبری ہے وہ کلمہ کفر ادا کرنے یا اہلبیتؑ کو دشنام کرنے پر مجبور ہو جائے۔ پس گو کہ جان کی حفاظت کے لئے ایسا کرنا جائز ہے لیکن مکروہ ہے (جیسا کہ جناب عمارؓ نے تقیہ کیا تھا) اور اگر تقیہ ترک کر کے اعلائے کلمہ حق کرے (مثل جناب میثم تمارؓ) تو اس نے بہتر کو اختیار کیا۔ چنانچہ اگر (اس کے نتیجے میں) شہید ہو جاتا ہے تو جملہ شہداء میں شمار کیا جائے گا۔

مباح تقیہ

لیکن اگر مجبور شخص معاشرے میں رہبری کے منصب پر فائز نہیں ہے تو اسے "تقیہ مباح" اپنانا چاہئے۔ یعنی چاہے تو تقیہ کرے یا تقیہ ترک کرے، خواہ قتل ہو جائے۔

حرام تقیہ

اگر کبھی ایسا موقع آجائے کہ خود کو یا کسی اور کو محفوظ رکھنے کی وجہ سے

دوسرے مومن کی جان کو یقینی خطرہ کا سامنا کرنا پڑے تو ایسی صورت میں تقیہ کرنا حرام ہے۔

عَنْ اَبِیْ جَعْفَرٍ: اِنَّمَا جُعِلَتِ التَّقِیَّةُ لِیُحْقَنَ بِهَا الدِّمَاءُ فَاِذَا بَلَغَ الدَّمَ فَلاَ تَقِیَّةَ. امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: تقیہ اس لئے رکھا گیا کہ اس سے خون محفوظ رہ سکیں اور اگر تقیہ کی وجہ سے کسی مظلوم کا خون بہنے لگے تو کوئی تقیہ نہیں ہے۔

تقیہ برائے نبی و امام

نبی و امام لوگوں کے رہبر ہوتے ہیں اور عقلی طور پر یہ جائز نہیں کہ نبی و امام اپنی یا امت کی حفاظت کے لئے تقیہ کریں اور حق کے خلاف بات کریں یا حق کے خلاف کوئی عمل کریں کیونکہ تقیہ حق کو پوشیدہ رکھنا اور اصل واقعہ کو چھپانا ہوتا ہے لیکن اگر دشمن کے شدید خوف کی بنا پر تقیہ کرنا پڑے تو وہ پیغمبر اور امام پر جائز بلکہ واجب ہوگا لیکن ان کے تقیہ میں شرط یہ ہے کہ وہ تقیہ سے پہلے حق کو واضح کریں یا یہ کہ تقیہ کے وقت بھی وہ ایسا قرینہ قائم کریں جس سے معلوم ہو کہ یہ بات اظہار حق کی جائے تقیہ پر محمول ہے یا یہ کہ جب اسباب تقیہ ختم ہو جائیں تو حق کو بیان کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر ہم ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے تقیہ کے مقامات کو گہری نظر سے دیکھیں تو ہمیں ان کا تقیہ مذکورہ تین شرائط سے خالی دکھائی نہیں دے گا۔ ائمہ نے کبھی تقیہ سے پہلے حق کو واضح کیا اور کبھی تقیہ کے وقت کوئی نہ کوئی ایسا قرینہ قائم کیا جس سے وضاحت ہوتی تھی کہ ان کا یہ قول مبنی بر تقیہ ہے یا یہ کہ انہوں نے اسباب تقیہ کے ختم ہونے کے ساتھ ہی حق کی وضاحت کردی تھی۔

سوال ۶۱

فرض کریں مکہ میں تیئیس رمضان المبارک کی شب، شب جمعہ ہوتی ہے جبکہ مشرق بعید میں تیئیس رمضان کی شب ہفتہ یا اتوار کی شب کو ہوتی ہے اور مغرب بعید میں جمعرات کی شب تیئیس رمضان ہے اور تیئیس رمضان کے متعلق لیلۃ القدر کا زیادہ امکان ہے اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے : تَنَزَّلُ الْمَلاَئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ. "اس رات میں ملائکہ اور روح، اللہ کے اذن سے ہر امر لے کر اترتے ہیں۔" اور اسی طرح اس شب ہر امر حکیم کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ افق کے اختلاف کی وجہ سے مغربی ممالک میں جمعرات کی شب اور کرۂ ارض کے درمیانی ممالک میں جمعہ کی شب اور مشرقی ممالک میں ہفتہ کی شب کو تیئیس رمضان المبارک کی رات بنتی ہے تو اس صورت میں انسان کس رات کو اپنے لئے شب قدر سمجھے اور ان تین راتوں میں سے کس رات کو عبادت میں بسر کرے؟

جواب

اس سوال کا جواب ایک مختصر مقدمہ پر موقوف ہے۔

مہینہ کی چاند رات وہ ہوتی ہے جب چاند آفتاب کی تیز روشنی سے نکل کر دیکھنے کے قابل ہو اور فضا صاف ہو اور فضا میں بادل اور دھند وغیرہ پھیلی ہوئی نہ ہو اور چاند دکھائی دے تو وہ رات قمری ماہ کی شب اول شمار کی جاتی ہے۔

اب اگر ایک شہر میں چاند نظر آجائے اور بعض شہروں میں دھند اور بادل کی وجہ سے چاند دکھائی نہ دے تو کیا ان کے لئے بھی وہ رات چاند رات ہوگی یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ان کا افق ایک ہو تو ان کے لئے بھی وہی شب چاند رات متصور کی جائے گی اور اگر افق جدا ہوں تو اکثر فقہاء کا فتویٰ یہ ہے کہ جب دو شہروں کے افق جدا ہوں تو ایک شہر میں چاند کا نظر آنا دوسرے شہر کے لئے معتبر نہ ہوگا۔ اسی لئے جداگانہ افق کی وجہ سے دوسرے علاقے والوں کے لئے ماہ رمضان کا پہلا روزہ ثابت نہ ہوگا اور نہ ہی عیدالفطر ثابت ہوگی لیکن اس کے برعکس بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ چاند کا کسی بھی مقام پر نظر آجانا تمام لوگوں کے لئے معتبر ہے۔

جیسا کہ علامہ نے تذکرہ میں لکھا ہے : رویت ہلال کے لئے بلاد بعیدہ اور بلاد قریبہ کا کوئی فرق نہیں ہے ایک مقام کی رویت تمام دنیا کے لئے معتبر ہے۔

اس کی دلیل ہشام کی حدیث صحیح میں وارد ہے : عَنْ اَبِیْ عَبْدُاللّٰهِ عَلَيْهِ السَّلاَمُ قَالَ: اِنْ كَانَتْ لَهُ بَيِّنَةٌ عَادِلَةٌ عَلٰى اَهْلِ مِصْرَ اَنَّهُمْ صَامُوْا ثَلاَثِيْنَ عَلٰى رُؤْيَتِهٖ قَضٰى يَوْمًا. "امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: اگر کسی شخص نے انتیس روزے رکھے ہوں بعد میں عادلانہ گواہی سے اسے معلوم ہو جائے کہ دوسرے شہر والوں نے تیس روزے رکھے ہیں تو وہ ان کے مطابق عید کرے اور ایک دن کی قضا کرے۔"

اور اسی طرح موثق حدیث میں بصری نے کہا : فَاِنْ شَهِدَ اَهْلُ بَلَدٍ اٰخَرَ فَاقْضِهٖ. "اگر دوسرے شہر والے یہ گواہی دیں کہ انہوں نے چاند دیکھا تھا تو وہ جس دن کا روزہ نہ رکھ سکا ہو وہ اس دن کی قضا کرے۔"

مقصد یہ ہے کہ رویت کسی بھی شہر میں ثابت ہو جائے تو دوسرے شہروں کے لئے بھی رویت ثابت ہو جائے گی۔ صاحب جواہر، صاحب مستند اور صاحب مستمسک نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے اور یہ فتویٰ دیا ہے کہ کسی بھی مقام پر چاند رات ہو جائے تو وہ تمام معمورہ کے لئے چاند رات متصور ہوگی اور ۲۳ ویں شب گزرنے

سے پہلے اس شب کی فضیلت حاصل کرنے کیلئے عبادت بجالانی چاہئے کیونکہ شبہ قوی ہے کہ یہ لیلۃ القدر ہے اور بالجملہ تیئیسویں شب کہ اس میں لیلۃ القدر ہونے کا شبہ ہے واقعاً ایک سے زیادہ نہیں ہے لیکن چونکہ اکثر فقہاء اوپر ذکر شدہ حدیث کو شرائط کے ساتھ جانتے ہیں کہ بلاد قریبہ یا جن کا افق ایک ہو یعنی چاند کا ایک شہر میں دکھائی دے جانا کسی دور کے شہر کے لئے جس کا افق مختلف ہو سبب نہیں قرار پاتا کہ وہاں اول ماہ قرار دیا جائے بلکہ یہ حکم صرف ان شہروں کیلئے مخصوص ہے جو قریب ہوں یا جن کا افق ایک ہو۔ پس جو کوئی لیلۃ القدر کی فضیلت حاصل کرنا چاہے اسے چاہئے کہ احتیاط پر عمل کرے۔ یعنی رویت ہلال کی بنا پر اسکے اپنے شہر یا مشترکہ افق والے شہروں کے مطابق تیئیسویں شب میں اعمال بجالائے نیز دور اور غیر مشترکہ افق کے شہروں کے رویت ہلال کے مطابق بھی تیئیسویں شب کے اعمال انجام دے۔

مثلاً کسی کے شہر میں یا مشترکہ افق کے شہر میں رویت ہلال کے بموجب ہفتہ کی رات ۲۳ویں شب ہے اور چونکہ دور کے شہروں میں جن کا افق مختلف ہے ایک شب قبل رویت ہلال کے مطابق ۲۳ویں شب ہو چکی ہے، یعنی شب جمعہ وہاں ۲۳ویں شب ہوگی تو چاہئے کہ شب جمعہ اور شب ہفتہ دونوں میں عبادت کرے تاکہ ۲۳ویں شب کی فضیلت حاصل کرنے کا یقین ہو جائے۔

بالجملہ اوپر ذکر شدہ صحیح اور موثق حدیثوں کا ماحصل یہ ہے کہ لیلۃ القدر تو صرف ایک ہی رات ہوتی ہے اور اس کے علاوہ نہیں اور وہ شب مشخص ہوتی ہے اور تمام مقامات پر ہمیشہ ایک سے زیادہ شب قدر نہیں ہوتی۔

شہروں کے مختلف ہونے سے تیئیسویں شب کے ایک سے زیادہ ہونے کا امکان ہے جسے تمام فقہاء نے اختیار کیا ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا۔ پس شب قدر کی فضیلت حاصل کرنے کے مشتاق ثواب کو اختلاف ہونے کی صورت میں دو راتوں کو

جاگ کر عبادت میں گزارنا چاہئے۔

اور اگر سوال یہ ہو کہ طلوع و غروب آفتاب کی مناسبت سے شہروں میں فرق ہوتا ہے بلکہ ایک ہی وقت کہیں دن ہوتا ہے اور کہیں رات تو اس کے جواب میں میں کہوں گا کہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ ہر شہر میں لیلۃ القدر اول غروب آفتاب سے طلوع فجر تک ہوتی ہے۔ اس بنا پر اور شہروں کے مختلف ہونے کی وجہ سے لیلۃ القدر ۲۴ گھنٹے کی ہوتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہوا ہے کہ روز قدر بھی فضیلت میں شب قدر کی طرح ہے اور شاید اس کا راز یہ ہے کہ جس وقت ایک شہر میں روز قدر ہوگا اسی وقت کسی دوسرے شہر میں شب قدر ہوگی اور بالجملہ ۲۴ گھنٹے میں ملائکہ کا نزول ہے اور اسی طرح شب قدر کے تمام آثار ہر شہر میں غروب آفتاب سے طلوع فجر تک ہوں گے۔

حرامزادہ میراث سے کیوں محروم ہے؟

سوال ۶۲

حرامزادہ میراث سے کیوں محروم ہے (جبکہ وہ اپنے باپ کا نطفہ ہے اور اپنی ماں کا بیٹا ہے)؟

جواب

شریعت طاہرہ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ ولد الزنا، زانی مرد اور زانیہ عورت کی میراث کا حقدار نہیں ہوتا۔ اگر وہ مر جائے تو اس کا ناجائز باپ اور ناجائز ماں بھی اس کی میراث حاصل نہیں کر سکتے اور وہ شخص بے اولاد ہو کر مر جائے تو وہ "من لا وارث له" (جس کا کوئی وارث نہ ہو) کے حکم میں ہوگا اور اس کا چھوڑا ہوا ترکہ نبی و

امام یا نائب امام سے متعلق ہوگا۔

میراث نسب صحیح شرعی پر موقوف ہے اور ولد الزنا نسب صحیح سے محروم ہوتا ہے اور وہ ناجائز نطفہ کی پیداوار ہونے کی وجہ سے کسی احترام کے لائق نہیں ہوتا۔ البتہ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ زانی کو ایسے ناجائز بچے کے لئے ازروئے ترحم وصیت کرنی چاہئے لیکن یہ واضح رہے کہ مذکورہ وصیت اول و آخر جذبہ ترحم پر مبنی ہوگی ورنہ حرامزادہ کسی طور پر بھی میراث کا حقدار نہیں ہے۔

کتاب کافی میں مرقوم ہے کہ انصار میں سے ایک شخص امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میں نے اپنے غلام کو اپنی کنیز سے زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور میری وہ کنیز اس غلام سے حاملہ ہوئی اور نوماہ بعد اس نے ایک بچی کو جنم دیا۔

امام علیہ السلام نے فرمایا: اس کی پرورش کرو اور اس کو فروخت نہ کرو اور نان و نفقہ فراہم کرو یہاں تک کہ وہ مر جائے یا اللہ اس کے لئے کوئی کشائش پیدا کرے اور جب تمہاری موت کا وقت آئے تو اس پر انفاق کرنے کی وصیت کرو۔

اگر حرامزادے کے لئے میراث کا اجراء تسلیم کرلیا جائے تو اس سے حسب ذیل نقصان مرتب ہوں گے:

۱۔ معاشرے میں زنا زیادہ پھیل جائے گا اور اس کے ساتھ جھوٹ کو رواج حاصل ہوگا۔

۲۔ جھوٹی گواہی کی وجہ سے لوگ دولت مند افراد کی دولت ہتھیانے کی عادت پیدا کرلیں گے۔

یہود و نصاریٰ کی نجاست اصلی ہے یا عارضی؟

سوال ۶۳

دور حاضر کے یہود و نصاریٰ ذاتی طور پر نجس ہیں یا اس لئے نجس ہیں کہ یہ لوگ نجاسات سے پرہیز نہیں کرتے؟

یہودیوں کا وہ گروہ جو اللہ کو مجسم مانتا ہے اور حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ کہتا ہے اور نصاریٰ کا جو طبقہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا تسلیم کرتا ہے، تو کیا یہ گروہ نجس العین کافر متصور ہوں گے؟

جواب

اکثر فقہاء رضوان اللہ علیہم یہود و نصاریٰ کی ذاتی نجاست کے قائل ہیں اور کچھ قلیل علماء کا نظریہ یہ ہے کہ مذکورہ مذاہب کے افراد ذاتی طور پر پاک ہیں اور عارضی نجاست کی وجہ سے متنجس ہیں کیونکہ یہ لوگ خنزیر اور شراب کے رسیا ہیں۔

اس مسئلہ کی توضیح کے لئے طرفین کے دلائل کا جائزہ لینا ضروری ہے جس کے لئے کافی وقت درکار ہے۔اسی لئے اس مسئلے کے تفصیلی جواب سے معذور ہیں۔

نذر کیسی ہونی چاہئے؟

سوال ۶۴

کیا نذر ہر طرح کی مانی جاسکتی ہے یا صرف ایسے امور کی مانی جاسکتی ہے جو اطاعت الٰہی میں شمار کئے جاتے ہوں؟

جواب

نذر ایسے امور کی مانی چاہئے جن کا تعلق اطاعت خداوندی سے ہو اور شریعت کا رجحان ثابت ہو۔ یعنی نذر ایسے امور کی مانی چاہئے جو واجب یا مستحب ہوں یا ترک حرام و ترک مکروہ کی نذر مانی چاہئے۔ بالفاظ دیگر عبادت و اطاعت کی نذر مانی چاہئے جس سے تقرب خداوندی کا حصول ممکن ہو۔

انجکشن سے حمل

سوال ۶۵

سو سال قبل مرنے والے شخص کے مادہ منویہ کو کیمیائی طریقے سے محفوظ رکھا گیا ہو اور پھر ایسی عورت میں اس کے جرثومے داخل کئے جائیں جس کا شوہر موجود نہ ہو اور اگر اس سے بچہ پیدا ہو جائے تو کیا وہ بچہ حرامزادہ ہوگا؟

جواب

اس ذریعے سے پیدا ہونے والے بچے کے حرامزادہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

متفرق سوالات

سورۂ ولایت

سوال ۶۶

قرآن مجید کا چیلنج ہے کہ اس کی ایک سورت کے مقابلے میں دنیا جہان کے انسان و جنات بھی جمع ہو جائیں تو بھی اس جیسی سورت نہیں بنا سکیں گے۔

"سورۂ ولایت" کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس سورت کو بعض لوگوں نے اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لئے قرآن مجید سے حذف کردیا تھا۔ (اگر یہ بات سچی ہے تو قرآن مجید میں کمی لازم آئے گی اور یوں قرآن کامل نہیں رہے گا۔ اور اگر بالفرض یہ کسی انسان کی تراشیدہ ہے تو کم از کم اس سے یہ تو پتا چل جاتا ہے کہ قرآن کی سورت کے مقابلے میں سورت بنائی جاسکتی ہے اور یوں قرآن کا چیلنج اپنے مقام پر قائم نہیں رہتا) کیا مذکورہ سورت کلام باری تعالیٰ ہے؟

جواب

(یہ حقیقت ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ قرآن مجید ہر لحاظ سے کامل و اکمل کتاب ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی کمی بیشی نہیں ہے اور یہ بھی

حقیقت ہے کہ قرآن جیسا کلام نہ تو اولین سے بن آیا اور نہ ہی قیامت تک کسی سے بن سکے گا۔ البتہ چند جُہّال نے اپنی طرف سے اس طرح کی کوشش ضرور کی تھی لیکن خاک کو عالمِ پاک سے کوئی نسبت نہیں ہوتی اور ان کے خودساختہ کلام کو جب قرآن مجید کے مقابلے میں پیش کیا جائے تو ان کا کلام جگمگاتے ہوئے جواہر کے سامنے پتھروں کا ڈھیر نظر آتا ہے۔

قرآن مجید نے اپنے چیلنج میں کہا ہے: فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ. "اس جیسی ایک سورت اپنی طرف سے بنا کر لاؤ۔"

قرآن مجید نے اناپ شناپ لانے کا چیلنج نہیں دیا بلکہ یہ کہا کہ قرآن کی سورت جیسی سورت لاؤ۔ یعنی جس طرح سے قرآن کی ہر سورت اپنے مقام پر فصاحت و بلاغت کا شہ پارہ ہے تم بھی ویسی ہی شہ پارہ تخلیق کر کے لاؤ)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سورۂ ولایت کا خالق کائنات کا بدذوق اور فصاحت و بلاغت سے ناواقف ترین شخص تھا جسے صحیح جملے بنانے کا بھی طریقہ نہیں آتا تھا اور مذکورہ خود ساختہ سورت بنانے والے شخص نے غیر مربوط جملوں کو بدترین ترکیب دے کر پچیس آیات تخلیق کیں اور اس کا نام "سورۃ الولایہ" رکھ دیا۔

اس سورت کے خود ساختہ ہونے کی پہلی دلیل یہ ہے کہ فصل الخطاب کے مؤلف نے اسے دبستان للمذاہب نامی کتاب سے نقل کیا اور اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ کسی بھی شیعہ کتاب میں اس نام کی کوئی سورت نہیں ہے۔ نامعلوم دبستان للمذاہب کے مؤلف نے اسے کہاں سے نقل کیا اور اسے شیعوں کے نام سے کیوں منسوب کیا؟

(علاوہ ازیں ہمیں اس سورت کے بطلان کے لئے خارجی شہادتوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ خود یہ سورت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ کسی بدبخت جاہل کی

ساختہ پرداختہ ہے)۔

اس خود ساختہ سورت کا اسلوبِ قرآن سے دور کا بھی واسطہ نہیں اس سورت کا مفہوم انتہائی رکاکت و بدنظمی پر مبنی ہے اور تیسرے یہ خود ساختہ سورت بہت سے اغلاط پر مشتمل ہے اور ہر وہ شخص جو صرف و نحو اور معانی و بیان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے وہ اس سورت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ اغلاط پر مشتمل ہے۔

آپ "سورۃ الولایہ" کا ذرا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیں: "وَاصْطَفٰى مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَجَعَلَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِيْ خَلْقِهٖ."

اس نام نہاد آیت کا نہ تو کوئی سر ہے اور نہ ہی پیر ہے۔ اس کا ترجمہ کچھ یوں ہے: "اور اس نے ملائکہ میں سے چنا اور مومنین میں سے بنایا، وہ اس کی خلق میں۔"

مذکورہ تینوں جملے غیر مربوط ہیں اور تینوں جملے کلام تام نہیں ہیں۔ ناقص ہیں اور مرکب مفید نہیں ہیں۔

پہلے جملے وَاصْطَفٰى مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ "اور اس نے ملائکہ میں سے چنا" اور آج تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ ملائکہ میں سے کسے چنا۔

دوسرا جملہ یہ ہے: وَجَعَلَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. "اور مومنین میں سے بنایا" لیکن یہ پتا نہیں کہ کسے مومنین میں سے بنایا۔ کم از کم اس خود ساختہ آیت سے تو کوئی پتا نہیں چلتا۔

اس خود ساختہ آیت کا تیسرا جملہ: اُولٰٓئِكَ فِيْ خَلْقِهٖ. "وہ اس کی خلق میں" اُولٰٓئِكَ کا اشارہ اور ناقص جملہ سے مراد کون ہے؟

خود ساختہ سورت کی چند دوسری آیات ملاحظہ فرمائیں: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِكَ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ. "ان لوگوں کی مثال جو تجھ سے کیا ہوا عہد پورا کرتے ہیں میں نے انہیں نعمتوں والی جنتیں بدلہ میں دی ہیں۔"

سوال یہ ہے کہ ایفائے عہد کرنے والوں کی مثال کس سے دی گئی؟ خود ساختہ آیت میں اس کا جواب موجود نہیں ہے۔

ایک اور خود ساختہ آیت ملاحظہ فرمائیں: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی وَ هَارُوْنَ بِمَا اَسْتَخْلِفُ فَبَغَوْا هَارُوْنَ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ۔ "اور بے شک ہم نے موسیٰ و ہارونؑ کو بھیجا، جس سے میں خلیفہ بناتا ہوں۔ انہوں نے ہارون سے بغاوت کی پس صبر ہی بہتر ہے۔"

طرفہ آیت کے کلمہ "بِمَا اَسْتَخْلِفُ" کا یہاں کیا موقع و محل ہے؟ اور "فَبَغَوْا" پس انہوں نے بغاوت کی۔ سوال یہ ہے کہ بغاوت کرنے والے کون تھے؟ (ان کا اس آیت میں کہیں نام و نشان نہیں ہے)۔ "فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ" پس صبر ہی بہتر ہے۔ (اب پتا نہیں چل سکتا کہ صبر کرنے والا کون ہے اور اس کا روئے سخن کس کی طرف ہے؟ ان سوالات کا جواب خود ساختہ آیت میں دور تک دکھائی نہیں دیتا)۔

اسی طرح کی ایک غیر مربوط آیت بھی ملاحظہ فرمائیں: ولقد اتینا بك الحکم کالذی من قبلك من المرسلین وجعلنا لك منهم وصیا لعلهم یرجعون.

اس طرفہ آیت کے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ "اتینا بك الحکم" کا معنی کیا ہے اور مزید یہ کہ "منهم" اور "لعلهم" کی ضمائر کا مرجع کیا ہے؟

مرحوم آشتیانی علیہ الرحمہ نے حاشیہ رسائل میں کیا ہی خوب لکھا:

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ یہ قرآن مجید کی سورت نہیں ہے۔ عربی جاننے والا ہر شخص ایسا کلام تیار کر سکتا ہے اور حقیر یہ کہتا ہے کہ علوم عربیہ سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص ایسا مہمل اور غیر مربوط کلام کرنے پر راضی نہیں ہو سکتا۔ اس خود ساختہ سورت میں فصاحت و بلاغت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے اور مذکورہ آیات میں باہمی ربط کا بھی فقدان ہے۔

چند علوم کے موضوع

سوال ۶۷

اصول فقہ، معقول، منقول، کلام، منطق، معانی بیان اور حکمت جیسے علوم کا موضوع بحث کیا ہے؟

جواب

علم معقول وہ علم ہے جس میں عقلی قضایا پر بحث کی جاتی ہے اور ان کے اثبات کے لئے صرف عقل سے ہی کام لیا جاتا ہے۔

علم منقول میں احکام شرعیہ پر بحث کی جاتی ہے اور احکام شریعت کا بنیادی ماخذ کتاب و سنت ہے۔

سادہ الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم معقول میں عقلیات اور علم منقول میں نقلیات پر بحث کی جاتی ہے اور علم حکمت کا تعلق عقلی علوم اور فقہ کا تعلق نقلی علوم سے ہوتا ہے۔

علم اصول: وہ علم ہے جس میں قواعد فقہ پر بحث کی جائے۔

فقہی احکام کے استنباط کے لئے قواعد فقہ کی اشد ضرورت ہے اور ان قوانین کے بغیر فقہ کے ادلہ اربعہ سے احکام کا استنباط ممکن نہیں ہے اور ادلہ اربعہ سے ہماری مراد کتاب و سنت و اجماع اور دلیل عقل ہے۔

علم فقہ: وہ علم ہے جس میں احکام شرعی کی ادلہء تفصیلیہ سے بحث کی جائے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم فقہ وہ علم ہے جس میں واجبات، محرمات، مستحبات، مکروہات اور مباحات کی بحث کی جائے۔

علم کلام: وہ علم ہے جس میں عقائد کا اثبات دلیل و برہان سے کیا جائے اور اس

ذریعے سے شکوک و شبہات کو دور کیا جائے۔ عقائد دینی سے مبدا اور اس کی صفات، نبوت و امامت اور معاد کا علم مراد ہے۔

منطق: وہ علم ہے جس کے قواعد کی پاسداری کرنے سے انسان خطائے فکری سے محفوظ رہ سکے۔

اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ منطق تمام عقلی احکام کے صحیح و غلط جانچنے کا میزان ہے اور اس علم کو میزان بھی کہا جاتا ہے۔

معانی بیان: فصاحت کلمہ اور بلاغت کلام کی کیفیت کو جاننے کا نام ہے۔

حکمت: تمام موجودات کے مجردات، مادیات، جواہر اور اعراض کی تفصیلی اور ان کے احوال کو جاننے کا نام ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں حکمت نظر اور حکمت عملی۔

کیا حضرت امام حسینؑ کربلا میں محصور تھے؟

سوال ۶۸

مشہور ہے کہ ماہ محرم کی نو تاریخ کو حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی لشکر اعداء میں محصور ہوگئے تھے۔

سوال یہ ہے کہ اگر آپ محصور تھے تو حضرت حبیب بن مظاہر [illegible] مسلم بن عوسجہ سلام اللہ علیہما لشکر اعدا کے محاصرہ کو توڑ کر آپؑ کی خدمت [illegible] پہنچے تھے؟ ثانیاً حضرت سکینہ سلام اللہ علیہا سے منقول ہے کہ شب عاشور [illegible] علیہ السلام نے خطبہ دیا جس میں آپؑ نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی شہادت [illegible] کی اور آپؑ نے فرمایا کہ میں نے تمہاری گردنوں سے اپنی بیعت کا قلادہ اٹھا [illegible] جو جانا چاہتا ہو وہ چلا جائے۔ یہ سن کر کچھ لوگ آپؑ کو خدا حافظ کہہ کر [illegible] کچھ

وداع کے بغیر چلے گئے۔ اگر امام عالی مقامؑ محصور ہوتے تو یہ لوگ دشمنوں کے گھیرے سے کیسے نکلتے؟ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ حضرتؑ کے پاس آسکتے تھے اور حضرتؑ کے پاس سے اٹھ کر جا بھی سکتے تھے۔ تو اس صورت میں امامؑ نے اہل حرم کو واپس ان لوگوں کے ساتھ مدینہ کیوں نہ روانہ کیا؟ البتہ خود حضرت کا وہاں سے چلے جانا فرار سمجھا جاتا جو آپ کے شایاں نہیں تھا۔ لیکن اہلبیتؑ کو بھیج دینے میں کیا مانع تھا جبکہ قطعی طور پر آپ کو اپنے اصحاب کے قتل اور اہلبیتؑ کے حتمی قید ہونے کا علم تھا۔

جواب

کتب مقاتل کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حبیب بن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ علیہما السلام بڑی مشکل سے کوفہ سے روانہ ہوئے تھے کیونکہ کوفہ کی ہر طرف سے ناکہ بندی ہو چکی تھی اور یہ بزرگوار ون کو کھائیوں میں چھپتے اور رات کو سفر کرتے اور دشمنوں کی نظر سے اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے ماہ محرم کی ساتویں یا آٹھویں تاریخ کو کربلا پہنچے۔

جو لوگ حضرتؑ کو چھوڑ کر روانہ ہوئے تو اس سلسلے میں اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہئے کہ میدان کربلا وسیع و عریض میدان تھا جس میں ٹیلے اور نشیب و فراز موجود تھے اور متفرق افراد کا ان میں چھپنا اور آہستہ آہستہ نکل جانا ممکن تھا۔

علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان افراد نے پہلے پہل اپنے آپ کو دشمن کے لشکر میں شامل کیا ہو پھر علیحدہ ہوئے ہوں اور ویسے بھی دشمن کے لشکر کو ایسے لوگوں سے سروکار ہی نہیں تھا کیونکہ وہ تو چاہتے تھے کہ لوگ حضرتؑ کو چھوڑ کر چلے جائیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ حضرتؑ نے اپنے اہل حرم کو ان کے ساتھ روانہ کیوں نہ

کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرتؑ کے اہل حرم آپ سے جدا ہونے کے لئے تیار ہی نہیں تھے اور حضرت امام حسینؑ ان کے متعلق پہلے ہی یہ پیش گوئی کر چکے تھے کہ میرے اہل حرم اشقیاء کے ہاتھوں قید ہوں گے۔

اور پھر شب عاشور کے موقع کی سختی کو بھی نظر میں رکھنا چاہئے جہاں انفرادی طور پر نکلنا مشکل ہو وہاں کوئی شخص اہل حرم کو ساتھ لے کر کیسے نکل سکتا تھا۔ اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ ایسا کرنا ممکن تھا تو حضرت امام حسینؑ جو کہ غیرت الٰہیہ کے مالک تھے ان سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے اہل حرم کو ان لوگوں کے ساتھ روانہ کرتے جو عین موقع پر حضرت کا ساتھ چھوڑ کر اپنی جانوں کو بچانے کی فکر میں تھے۔

یقیناً جن لوگوں نے ہمارے آقا و مولا کو چھوڑا تھا وہ دنیا پرست، پست ذہن، ضعیف الایمان بلکہ بے دین و بے ایمان افراد تھے۔ اسی لئے حضرت سکینہ سلام اللہ علیہا نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ لوگ دس دس اور بیس بیس کی ٹولیوں میں میرے والد کو چھوڑ کر جانے لگے۔ کچھ دیر بعد صرف اکہتر افراد باقی بچ گئے تو اس وقت میں بہت روئی اور کہا "اَللّٰهُمَّ اِنَّهُمْ خَذَلُوْنَا فَاخْذُلْهُمْ وَلاَ تَجْعَلْ لَهُمْ دُعَاءً مَسْمُوْعًا وَ سَلِّطْ عَلَيْهِمُ الْفَقْرَ وَلاَ تَرْزُقْهُمْ شَفَاعَةَ جَدِّيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ." پروردگار! ان لوگوں نے ہمیں بے یارو مددگار چھوڑ دیا تو بھی انہیں بے یار و مددگار چھوڑ اور ان کی کسی دعا کو قبول نہ فرما اور ان پر فقر مسلط فرما اور انہیں قیامت کے دن میرے نانا کی شفاعت سے محروم فرما۔

جسم و روح کا تعلق

سوال ۶۹

روح کا بدن سے کتنے قسم کا تعلق ہوتا ہے اور اسکا تعلق کیسے سلب ہوتا ہے؟

جواب

روح کے بدن سے تعلقات کی اقسام میں سے ایک قسم تربیت کے تعلق کی ہے رب العالمین نے روح کو بدن کا مربی بنایا ہے اور تربیت کا معنی یہ ہے کہ حکمت کے مطابق کسی چیز کی آہستہ آہستہ پرورش کرنا۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح دو طرح سے بدن پر تصرف رکھتی ہے:

۱۔ تکوینی و طبیعی تصرفات۔ مثلاً نظام تنفس اور نظام انہضام اور تصرف کی یہ قسم غیر ارادی اور غیر اختیاری ہے۔

۲۔ ارادی و اختیاری تصرفات۔ جیسا کہ حواس خمسہ کے ادراکات اور جسم میں روح کے دیگر اختیاری تصرفات۔

نیند میں تصرفات کی پہلی قسم کار فرما ہوتی ہے اور موت کے وقت روح کے دونوں قسم کے تصرفات ختم ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے روح تمام اعضائے بدن کو درجہ کمال پر پہنچاتی ہے اور ہر عضو کو اس کے مقصد تخلیق کے قابل بناتی ہے۔

روح کا ایک تعلق "تعلق تدبیر" ہے۔ روح اللہ تعالیٰ کی اجازت سے بدن کے تمام نظام کو درست رکھتی ہے اور بدن کو تولید نسل کے قابل بناتی ہے اور ارادہ و ادراک کی تمام قوتوں کا سرچشمہ تدبیر روح سے ہوتا ہے۔

اگر جاندار کے پاؤں میں ایک کانٹا بھی چبھ جائے تو روح پورے جسم کو آمادہ

کرتی ہے کہ وہ اس کانٹے کو اقلیم بدن سے خارج کردے اور عجائبات روح میں سے عجیب ترین بات یہ ہے کہ روح بیک وقت تمام اعضاء و قویٰ کو اپنے اپنے کام میں مصروف رکھتی ہے اور ایک عضو کے کام کو دوسرے عضو کے کام کی رکاوٹ نہیں بننے دیتی۔ ایک ہی وقت میں آنکھ دیکھ رہی ہوتی ہے، کان سن رہے ہوتے ہیں، ہاتھ لمس کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور زبان بولنے اور چکھنے میں مصروف ہوتی ہے۔ ہاتھ، پاؤں حرکت کر رہے ہوتے ہیں، قوائے ہضم اور قوائے تنفس اور ان کے ذیلی قوا اپنے اپنے کام انجام دے رہے ہوتے ہیں۔

مذکورہ تعلقات کے علاوہ روح کو بدن پر تعلق حکومت بھی حاصل ہے۔

روح بدن کی حاکم ہے اور اعضائے بدن اس کے کارندے ہیں اور اس کے ہر فرمان کو ہر وقت بجالانے میں مصروف ہیں۔ روح جیسے ہی زبان کو حکم صادر کرتی ہے تو وہ بولنے لگ جاتی ہے اور روح جس چیز کو دیکھنے کی خواہش کرتی ہے آنکھ اسے دیکھنے لگ جاتی ہے اور اگر روح نہ دیکھنا چاہے تو آنکھ اسے توجہ سے نہیں دیکھتی۔ البتہ بیماری میں بعض اعضاء روح کی خدمت گزاری کے قابل نہیں رہتے۔ چنانچہ موت روح کے تعلق حکومت کو بھی ختم کر دیتی ہے۔

خوابوں کی دنیا

سوال ۷۰

خوابوں کے سچے یا جھوٹے ہونے کا کیا معیار ہے اور "اضغاث احلام" سے کیا مراد ہے؟

جواب

ہم خواب کو دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں: رحمانی۔ اضغاث احلام۔

رحمانی خواب میں اللہ کی طرف سے روح پر معانی و مفاہیم کا القا ہوتا ہے اور رحمانی خواب کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱۔ بعض رحمانی خواب ایسے ہوتے ہیں جو کہ اتنے صاف و شفاف ہوتے ہیں کہ محتاج تعبیر ہی نہیں ہوتے اور ایسے خواب دکھائی دینے کے وقت سے لے کر بیداری تک ذہن میں جزئیات سمیت محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ بعض رحمانی خواب محتاج تعبیر ہوتے ہیں اور اس میں معانی و مفاہیم کو اس کی مناسب صورت میں پیش کیا جاتا ہے (جیسا کہ حضرت یوسفؑ نے خواب میں سورج، چاند اور گیارہ ستاروں کو اپنے لئے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور حضرت یعقوبؑ نے اس کی تعبیر میں فرمایا تھا کہ میں سورج ہوں اور تیری والدہ چاند ہے اور تیرے گیارہ بھائی ستارے ہیں)۔

مثلاً علم کو عالم خواب میں دودھ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے کیونکہ دودھ کے بے شمار فوائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے علم کے بھی بے شمار فوائد ہوتے ہیں اور دودھ جسم کی نشوونما کا ذریعہ ہوتا ہے اور علم روحانی نشوونما کا ذریعہ ہوتا ہے۔

اضغاث احلام (خواب پریشاں) کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ کچھ خواب شیطانی وسوسوں کی پیداوار ہوتے ہیں اور ان کا مقصد دیکھنے والوں کو اذیت پہنچانا ہوتا ہے یا ان خوابوں میں اسے براہ راست کسی برائی کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ براہ راست برائی کا حکم تو موجود نہیں ہوتا اس کی بجائے اسے کسی ایسے کام کا حکم دیا جاتا ہے جو برائی پر منتج ہوتا ہے۔

۲۔ اور کبھی لاشعور میں چھپے ہوئے خیالات تصویر کی صورت میں نمودار ہوتے

ہیں اور ان خوابوں کا سرچشمہ انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ کینہ رکھتا ہو تو اسے خواب میں دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنے حریف سے جنگ و جدال میں مصروف ہے۔

۳۔ پریشان خوابوں کی اس قسم کا تعلق اخلاط کے غلبہ سے ہوتا ہے۔ ہر انسان میں صفرا، سودا، بلغم اور خون کے چار اخلاط ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں۔

لہذا اگر کسی شخص پر صفرا کا غلبہ ہو تو اسے خواب میں زرد قسم کے رنگ نظر آئیں گے اور اسے تلخ اور زہر آلود چیزیں زیادہ دکھائی دینے لگتی ہیں اور بجلی کی کڑک وغیرہ کے مناظر اسے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ صفرا گرم اور تلخ ہے۔

جس شخص پر سودا کا غلبہ ہو تو اسے خواب میں جلانے والی چیزیں اور سیاہ رنگ اور ترش ذائقہ والی اشیاء دکھائی دینے لگتی ہیں۔

جس شخص پر بلغم غالب آجائے اسے سفید رنگ اور پانی اور بارش و برف کے مناظر زیادہ دکھائی دیں گے۔

جس پر خون کا غلبہ ہو جائے تو خواب میں اسے سرخ رنگ اور میٹھی اشیاء اور طرب آور چیزیں زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔

تشخیص خواب

سب سے پہلے انسان کو اپنے مزاج کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور دیکھے کہ جب اس نے خواب دیکھا تو اس وقت و مزاج کے اعتبار سے کمال اعتدال میں تھا یا نہیں۔ اس کے بعد پھر دیکھے کہ اس نے جو کچھ خواب میں دیکھا ہے کیا وہ دن کے وقت اس امر کے متعلق سوچ بچار میں مصروف رہا تھا یا نہیں۔ اگر انسانی مزاج کمال اعتدال پر ہو اور دن میں اس چیز کے متعلق سوچ بچار بھی نہ کی ہو تو پھر انسان یہ دیکھے کہ اس خواب میں اسے کسی برائی کی ترغیب تو نہیں دی گئی یا اسے کسی نیکی کو

چھوڑنے کی رغبت تو نہیں دلائی گئی۔ اگر ان میں سے کوئی امر موجود نہ ہو تو انسان یہ سمجھ لے کہ اس کا خواب اضغاث احلام میں سے نہیں ہے اور اس کا خواب رحمانی خواب ہے۔

رحمانی خواب کی تعبیر کے لئے انسان کو معصومین کے فرامین کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

مرحوم حاجی نوری نے کتاب دارالسلام کے آخر میں اور علامہ مجلسی نے بحارالانوار کی چودھویں جلد میں اس مضمون کی تفصیلی روایات نقل کی ہیں۔

تعبیر کے لئے انسان کو قرآنی آیات کے استعارات کو مدنظر رکھنا چاہئے۔

مثلاً اگر کوئی باکردار شخص خواب میں اپنے آپ کو اذان دیتے ہوئے پائے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اسے حج کی سعادت نصیب ہوگی۔ اس تعبیر کا تعلق "وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ" کی آیت سے ہے۔ (سورۂ حج آیت ۲۷)

(اگر کوئی عام کردار رکھنے والا شخص اذان سنے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس پر چوری کا الزام عائد ہوگا اور اس تعبیر کا تعلق قرآن مجید کی آیت "فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ" (سورۂ یوسف آیت ۷۰) سے ہے)۔

اسی طرح سے اگر کوئی نیک شخص خواب میں رسی کو دیکھے تو اس سے مراد عہد ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید کی آیت ہے "وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا." (سورۂ آل عمران آیت ۱۰۳)

اگر خواب میں خشک لکڑی دکھائی دے تو وہ علامت نفاق ہے "كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ." (سورۂ منافقون آیت ۴)

اور پتھر دیکھنا قساوت کی نشانی ہے۔ سورۂ بقرہ کی ۸۴ویں آیت ہے: "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً."

اگر خواب میں مردہ کا گوشت کھائے تو اس سے مراد غیبت ہے: "اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا." (سورۂ حجرات آیت ۱۲)

اگر خواب میں لباس یا انڈہ دیکھے تو عورت کا وصال میسر آئے گا: "هُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ." (سورۂ بقرہ آیت ۱۸۷) اور "کَاَنَّهُنَّ بَیْضٌ مَّکْنُوْنٌ." (سورۂ صافات آیت ۴۹)

اسی طرح سے خواب میں دکھائی دینے والے نام کی مناسبت سے بھی تعبیر کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کی ملاقات ایسے شخص سے ہوتی ہے جس کا نام راشد ہے تو یہ رشد و ہدایت کا استعارہ ہے۔

اور اگر خواب میں کسی ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہے جس کا نام سالم یا عبدالسلام ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے کو سلامتی نصیب ہوگی۔

خواب کی تعبیر کیلئے عالم ملکوت اور عوالم غیب کے اسرار و رموز کی مناسبات کی طرف بھی رجوع کرنا چاہئے۔ مثلاً ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ مر گیا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اسے لمبی عمر نصیب ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے مقابلے میں موجودہ زندگی کی حیثیت موت سے زیادہ نہیں ہے۔

اگر اس کے برعکس کوئی شخص یہ دیکھے کہ اس کی شادی ہو رہی ہے تو اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کی موت قریب ہے کیونکہ مومن کے لئے موت اس کی شادی کی طرح سے ہے۔ روایات میں یہ الفاظ وارد ہیں کہ جب نکیرین قبر میں مومن سے سوال و جواب مکمل کرلیں گے تو اس سے کہیں گے: "نَمْ نَوْمَةَ الْعَرُوْسِ" اب تم سو جاؤ جیسا کہ دولہا حجلہ عروسی میں آرام کرتا ہے۔

واضح رہے کہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے یہ چند کلیات ہیں اور خواب کی تعبیر ایک خدائی عطیہ ہے۔ لہذا اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ ہر شخص کو اپنا خواب نہ

سنائیں۔ اپنے خواب کے لئے کسی اہل علم شخص کا انتخاب کریں اور تعبیر دینے والے شخص کو چاہئے کہ وہ خواب کے جملہ پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر اچھی تعبیر دے۔

چھینک اور فال لینا

سوال ۷۱

عوام میں مشہور ہے کہ جب کسی کو چھینک آجائے تو وہ کام روک لینا چاہئے اور یوں عوام الناس چھینک کو صبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیا روایات میں بھی اس کا کچھ ذکر موجود ہے۔ علاوہ ازیں فال نیک اور بد لینا کہاں تک درست ہے؟ وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

جواب

عوام الناس میں مشہور ہے کہ جب کسی کام سرانجام دینے یا نہ دینے کے لئے چند افراد آپس میں مشورہ کر رہے ہوں اور اسی دوران کسی کو چھینک آجائے تو یہ اس کام کے روک دینے کا غیبی اشارہ ہوتا ہے۔[1]

احادیث میں اس مفہوم کا کہیں اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ یہ صرف توہم پرستی ہے۔ البتہ روایات میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی بات سنا رہا ہو اور کسی دوسرے کو چھینک آجائے تو یہ اس کی سچائی کی دلیل ہے۔ اگر دو مرتبہ چھینک آئے تو وہ دو گواہوں کے برابر ہے۔

علاوہ ازیں احادیث میں وارد ہے کہ بیمار شخص کی چھینک اس کی صحت و عافیت کی علامت ہے اور تین دن سے لے کر سات دنوں تک موت سے محفوظ رہنے

۱۔ یہ صرف ایران میں مروج ہے جبکہ برصغیر میں چھینک کا یہ تصور موجود نہیں ہے۔

کی نشانی ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ چھینک تمام جسم کے لئے نفع بخش ہے بشرطیکہ تین بار سے زیادہ نہ ہو اور اگر تین بار سے زیادہ چھینک آئے تو یہ زکام اور درد کی علامت ہے۔

فال نیک لینا صحیح ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کا نام سالم یا فتح اللہ یا نصر اللہ سن کر اپنے دل میں سلامتی اور کامیابی کی امید رکھ لے تو اس میں کوئی قباحت نہیں جبکہ فال بد لینا صحیح نہیں ہے۔ مثلاً مکان کی چھت پر الو کو دیکھ کر مکان ویران ہونے کا تصور پیدا کر لینا یا کسی جانور کو دیکھ کر اپنے سفر کو ملتوی کر دینا یا اسے ناکام سفر قرار دینا یہ سب کچھ فال بد کے ضمن میں شامل ہے۔

روایات سے استفادہ ہوتا ہے کہ فال نیک لینا بہتر ہے اور فال بد لینا مکروہ ہے اور اس میں یہ راز مضمر ہے کہ نیک فال لینے والا شخص اللہ کے فضل و کرم کی امید رکھتا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے کشائش و بھلائی کا منتظر ہوتا ہے۔ اسی لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَفْضَلُ اَعْمَالِ اُمَّتِیْ اِنْتِظَارُ فَرْجِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ. (بحارالانوار ج۵۲۔ ص۱۲۲) "میری امت کا افضل ترین عمل اللہ کی کشائش کا انتظار کرنا ہے۔"

اس کے برعکس فال بد لینا درست نہیں ہے کیونکہ فال بد کی وجہ سے انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے اور وہ خدا کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اپنے لئے برائی کا انتظار کرنے لگ جاتا ہے۔

نیک فال اللہ پر بھروسہ پر قائم ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ موثر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندہ کو مایوس نہیں کرتا جو اس سے حسن ظن رکھتا ہو۔ چنانچہ حدیث قدسی میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنَا عِنْدَ حُسْنِ ظَنِّ عَبْدِیَ الْمُؤْمِنِ.

(بحارالانوار ج۷۰۔ ص۳۸۵) "میں اپنے بندۂ مومن کے نیک گمان کے قریب ہوتا ہوں۔"

فال بد اس وقت موثر ثابت ہوتی ہے جب اسے اہمیت دی جائے۔ اگر انسان اس کو کوئی اہمیت نہ دے اور اپنے خدا پر بھروسہ رکھے تو فال بد کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: کَفَّارَةُ الطِّیَرَةِ التَّوَکُّلُ. (روضہ کافی ج۸۔ ص۱۹۸) "فال بد کا کفارہ خدا پر توکل ہے۔"

الکافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: اَلطِّیَرَةُ عَلٰی مَا تَجْعَلُهَا وَ اِنْ هَوَّنْتَهَا تَهَوَّنَتْ وَ اِنْ شَدَّدْتَّهَا تَشَدَّدَتْ وَ اِنْ لَمْ تَجْعَلْهَا شَیْئًا لَمْ تَکُنْ شَیْئًا. (بحارالانوار ج۵۸۔ ص۳۱۰) "فال بد کا اثر انسان کی اپنی سوچ کے مطابق ہوتا ہے اگر فال بد کا اثر تم کم سمجھو گے تو اس کا اثر کم ہوگا اور اگر فال بد کا اثر زیادہ سمجھو گے تو اس کا اثر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا اور اگر تم نے اسے کچھ بھی اہمیت نہیں دی تو اس کا اثر بھی کچھ نہیں ہوگا۔"

کیا لفظ "اَعْهَدْ" خلاف فصاحت ہے؟

سوال ۲۷

سورۂ مبارکہ یٰسٓ میں لفظ "اَعْهَدْ" وارد ہے۔ اس لفظ میں بیک وقت تین حروف حلق پائے جاتے ہیں جو کہ فصاحت کے خلاف ہے۔ برائے مہربانی اس کے متعلق رہنمائی فرمائیں۔

جواب

فصاحت کلمہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس میں "تنافر حروف" نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ زبان پر ثقیل نہ ہو اور اس کی ادائیگی مشکل نہ ہو بلکہ آسان ہو اور اس کی تشخیص ذوق سلیم پر مبنی ہے اور اس میں مخارج حروف کے قرب و بعد کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور جو بھی کلمہ اگرچہ کتنے ہی قریب المخرج حروف پر مبنی کیوں نہ ہو اگر اس کا تلفظ آسان ہو تو وہ فصیح کلمہ شمار ہوتا ہے اور جس کلمہ کے حروف کے مخارج مختلف ہوں لیکن اس کا تلفظ مشکل ہو وہ غیر فصیح شمار ہوتا ہے اور لفظ "اَعْهَدْ" کو ذوق سلیم ثقیل قرار نہیں دیتا اور اس کا تلفظ بھی چنداں مشکل نہیں ہے۔ اسی لئے یہ کلمہ ہر لحاظ سے فصیح ہے اور لفظ "اَعْهَدْ" کا ہم معنی کوئی بھی عربی زبان کا لفظ اس سے زیادہ آسان تلفظ نہیں رکھتا۔

چھوٹے عمل کی بڑی جزا

سوال ۳۷

بعض روایات میں ہے کہ فلاں دعا یا فلاں نماز ادا کرنے کا ثواب ایک شہید کے برابر ہے یا غلام آزاد کرنے کے برابر ہے یا جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے۔

عقل انسانی اس بات کو باور کرنے پر آمادہ نہیں کہ محض ایک دعا پڑھنے سے کوئی آدمی ایک شہید کا رتبہ حاصل کرلے۔ اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام سے ایسی بہت سی روایات منقول ہیں جن میں آپؐ نے کسی دعا یا عمل کا درجہ شہید کے برابر

بیان کیا اور مذکورہ مفہوم کی روایات اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہیں ہے اور ان روایات کا مقصد امت اسلامیہ میں اعمال صالحہ کی تشویق و ترغیب ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص موعودہ اجر کے شوق میں مذکورہ عمل بجالاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ اجر ضرور عطا کرتا ہے، خواہ پیغمبرؐ یا امامؑ نے ایسا نہ فرمایا ہو اور یہ گروہ مومنین اہل نجات و سعادت ہے لیکن دوسرا گروہ چھوٹے اعمال کے ثواب اور اجر کو سننے سے دور بھاگتا ہے بلکہ بعض ان میں سے اتنی جرأت کرتے ہیں کہ اس طرح کی روایات کا ہی انکار کردیتے ہیں حالانکہ ہزاروں معتبر اور صحیح احادیث اس موضوع پر شیعوں اور سنیوں کی کتابوں میں موجود ہیں اور بعض دوسرے جہالت کی وجہ اور ان روایات کے معانی سے بے خبری کی بنا پر نعوذباللہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لہذا دوری اختیار کرنے والوں، انکار کرنے والوں اور مذاق اڑانے والوں کی روک تھام کے لئے چند جواب یہاں دیئے جاتے ہیں اور خداوند منان سے امید ہے کہ جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ موجب ثواب اور معرفت اور بصیرت کے زیادہ ہونے کا سبب بنے۔

جواب اول

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجر و ثواب کی دو قسمیں ہیں: (۱) استحقاقی۔ (۲) تفضلی۔

ثواب استحقاقی سے وہ جزا اور ثواب مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ کے تحت کسی عمل کی مقرر کی ہے اور جس کے لئے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ جو شخص فلاں نیک کام سرانجام دے گا اسے اتنا ثواب عطا کروں گا۔

ثواب تفضلی ایسا ثواب جو استحقاق سے زیادہ مقدار میں عطا کیا جائے اسے ثواب تفضلی کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شان فضل سے یہ چیز بعید نہیں ہے کیونکہ اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔

اس تمہید کے بعد اب یہ دیکھیں کہ کسی روایت میں مذکور ہے کہ فلاں دعا پڑھنے والے کو شہید کا ثواب ملے گا۔ اس روایت کا مقصد یہ ہے کہ اگرچہ مذکورہ دعا کا استحقاقی ثواب کم ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے استحقاق کے علاوہ اسے تفضّلی ثواب کے طور پر شہید کا ثوابِ استحقاق عطا کرے گا۔

یہاں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ شہید کے ثواب بھی دو طرح کے ہیں۔ پہلا ثواب استحقاقی نوعیت کا ہے اور دوسرا ثواب تفضّلی نوعیت کا ہے۔ جو خدا ایک دعا پڑھنے والے کو تفضّلی طور پر شہید کا ثواب عطا کرتا ہے وہی خدا شہید کو بھی صرف استحقاقی ثواب تک ہی محدود نہیں رکھے گا وہ شہید کو تفضّلی ثواب سے بھی بہرہ مند فرمائے گا۔ اسی لئے شہید کا ثواب اور رتبہ مذکورہ دعا پڑھنے والے سے پھر بھی ارفع و اعلیٰ ہی رہے گا کیونکہ دعا پڑھنے والا تفضّلی طور پر شہید کے استحقاقی ثواب کو حاصل کرتا ہے مگر وہ شہید کے تفضّلی ثواب کو تو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لئے اس سے مقام شہادت میں کوئی پستی نہیں آئے گی۔

اسی طرح سے بعض روایات میں وارد ہے کہ فلاں نماز یا فلاں دعا پڑھنے والے شخص کو سو نبی اور سو وصی اور ملائکہ جتنا ثواب دیا جائے گا۔ اس روایت کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مذکورہ نماز یا دعا پڑھے اور اس نماز اور دعا کو سو پیغمبر یا وصی پڑھیں تو اللہ تعالیٰ اس شخص کے ثوابِ تفضّلی کو سو انبیاء و اوصیاء کے ثواب استحقاق کے برابر قرار دے گا نہ یہ کہ سو انبیاءؑ کہ جنہوں نے ایک طویل عمر عبادت اور تبلیغِ رسالت میں گزاری ان کا ثواب اس شخص کو مل جائے گا۔

جواب دوم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی عمل اور عبادتِ واجب و مستحب کا اجر و ثواب اس کی قبولیت پر موقوف ہے اور قبولیت اخلاص پر موقوف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ

کا فرمان ہے: وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ.... (البینہ آیت ۵) "انہیں بس یہی حکم دیا گیا کہ مخلص ہو کر اللہ کی عبادت کریں۔"

اخلاص کے بھی کئی مراتب ہیں اور اخلاص کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ عمل ہر طرح کی خواہشِ مدح سے بلند و برتر ہو اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے بجالایا جائے اور اس میں کسی طرح کی ریا شامل نہ ہو اور خود پسندی اور شرکِ خفی سے پاک ہو۔ ریا عمل باطل ہے اور علاوہ اس کے کہ اس کا عامل ثواب کا مستحق نہیں رہتا بلکہ یہ اس کے گناہوں میں شمار کیا جاتا ہے اور وہ مستحق عذاب قرار پاتا ہے کیونکہ ریا گناہان کبیرہ میں سے ہے اور شرک کی اقسام میں شمار کیا جاتا ہے۔

اخلاص کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ عمل صرف خدا کی رضا کے لئے ہو اور ثواب و اجر کے لالچ میں نہ ہو۔

اسی لئے حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا تھا: "جو عبادت دوزخ کے خوف سے بجالائی جائے وہ غلاموں کی عبادت ہے اور جو عبادت جنت اور نعمات جنت کی لالچ میں ادا کی جائے وہ تاجروں کی عبادت ہے اور جو عبادت صرف اللہ کا حق سمجھ کر بجالائی جائے وہ آزاد مردوں کی عبادت ہے۔"

(حضرت علی علیہ السلام نے اپنی مناجات میں یہ جملے کہے تھے: "پروردگار! میں نے دوزخ کے خوف سے تیری عبادت نہیں کی اور میں نے جنت کی لالچ میں بھی تیری عبادت نہیں کی۔ میں نے تجھے عبادت کے لائق پایا اسی لئے میں نے تیری عبادت کی۔")

اخلاص کے کچھ اور مراتب بھی ہیں جن کا ذکر طول کلام کا موجب ہے۔ اسی لئے ہم ان پر بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

اس مقدمہ کے بعد ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جن روایات میں اس

طرح کے الفاظ وارد ہیں کہ فلاں دعا اور فلاں نماز کا اتنا اتنا اجر ہے تو ان روایات کا مقصد بھی یہی ہے کہ اخلاص سے سرانجام پانے والی عبادت اگرچہ کمیت میں کم ہی کیوں نہ ہو مگر قدر و منزلت کے اعتبار سے اس کا بڑا مقام ہے۔

ایک صاحبِ بصیرت شخص پر واضح ہے کہ اخلاص کے درجات کا حاصل کرنا بہت محنت، نفس سے جہاد اور خداوند عالم کی عنایات پر مبنی ہے اور ان درجات میں سے ہر درجہ اس قادر الوجود کی عنایات کے سبب ہے بلکہ بعض درجات تو حاصل ہی نہیں کر پاتے مگر گنتی کے چند افراد۔

اگر ہمارے عباداتی اعمال اللہ تعالیٰ کی مدد سے اخلاص کے درجہ اول میں ہوں اور شرکِ خفی کے بغیر ہوں تو خداوند منّان سے امید ہے کہ اپنے فضل سے ثواب کے بعض مراتب ہمیں عنایت فرمائے گا۔ گو کہ اخلاص کے یہ مراتب حاصل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ جب تک دل میں اپنی تعریف کی خواہش اور اپنی برائی کیلئے بغض رہے گا تو ہم ریا سے محفوظ نہیں رہیں گے اور اگر یہ ہو کہ ہمارے عباداتی اعمال ہمارے گناہوں کی تلافی کر سکیں تو یہی بات بہت زیادہ شکر ادا کرنے کا موجب ہو گی۔

جناب سید بن طاؤسؒ روایت میں ذکر کئے گئے اعمال کے صلے میں کثیر ثواب ملنے کو اخلاص کے مرتبہء دوم میں شمار کرتے ہیں جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی یہ ثواب کثیر اس کے لئے ہے جس کا عمل ثواب کے لالچ کے بغیر ہو اور اگر حدیث میں یہ پایا جائے کہ جب کوئی فلاں عمل انجام دے تو اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا تو تعجب کا مقام نہیں ہے کیونکہ یقیناً اس سے مراد درجات اخلاص میں سے ایک درجہ ہے اور جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا ہے کہ درجات اخلاص کا حاصل کرنا اپنے نفس سے جہاد کئے بغیر ناممکن ہے۔ (پیش نظر رہے کہ) اگر شہید ایک بار میدان جنگ میں جا کر قتل ہو جاتا ہے تو اخلاص کا طالب روز و شب اپنے نفس اور شیطان کے ساتھ

مصروفِ پیکار رہتا ہے۔

کافی میں مروی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ ایک جنگ سے واپس تشریف لائے تو آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے ارشاد فرمایا: مَرْحَبًا بِقَوْمٍ قَضَوُا الْجِهَادَ الْاَصْغَرَ وَ بَقِيَ عَلَيْهِمُ الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ. (فروع کافی ج۱۔ ص۳۳۰) "میں ان لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہوں جنہوں نے چھوٹا جہاد کیا اور ابھی انہوں نے بڑا جہاد کرنا ہے۔"

صحابہ نے پوچھا کہ بڑے جہاد سے کیا مراد ہے؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: "اپنے نفس سے جہاد کرنا بڑا جہاد ہے۔"

جواب سوم

مذکورہ روایات کے متعلق اکثر اذہان میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک دعا یا چند رکعت نماز پڑھنا یا کسی مخصوص دن کا روزہ رکھنا یا روزہ افطار کرانا وغیرہ بڑا آسان کام ہے۔ مثلاً چند منٹ میں اس دعا یا نماز یا سورہ کو پڑھ لیا جائے گا جبکہ جہاد کرنا اور حج کرنا انتہائی دشوار ہے۔ لہذا کس طرح کوئی دعا اور راہِ خدا میں قتل ہو جانا برابر ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال اذہان میں اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ احادیث میں جس دعا کے پڑھنے کا حکم ہے اس سے مراد بس اس دعا کے الفاظ کو ادا کرنا ہے جو کہ انتہائی آسان ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ صرف الفاظ دہرانے پر اتنے بڑے ثواب کا وعدہ نہیں کیا گیا بلکہ روح عمل کو مد نظر رکھ کر ثواب عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے کیونکہ بے روح جسم کسی کام کا نہیں ہوتا اور تنہا صورت عبادت کوئی قیمت نہیں رکھتی۔

مثلاً اگر کوئی دو رکعت نماز پڑھ رہا ہو اور صرف اس کا بدن قیام و رکوع و سجود میں مخصوص حرکات میں مشغول ہو، اس کی زبان قرأت و ذکر میں مشغول ہو

لیکن نماز کے شروع سے آخر تک اس کے قلب کی توجہ کسی اور طرف ہو، مثلاً بجائے اس کے کہ نمازی قیام میں خود کو اللہ کے سامنے محسوس کرے اور رکوع میں مودب ہو اور اللہ کے سامنے خاضع ہو اور سجدہ میں وظیفہ عبودیت کو ادا کرے یعنی اللہ کے سامنے خاشع ہو اور تسبیح کرتے ہوئے اللہ کا منزہ اور پاک ہونا اس کے پیش نظر ہو اور تکبیر کہتے ہوئے نمازی اس کی عظمت کو سمجھے اور حمد کرتے ہوئے اس کی نعمتوں کو دھیان میں لائے اور تہلیل کرتے ہوئے اس کی وحدانیت کا تصور کرے، اس کی یہ نسبت ان تمام حالات میں اہل دنیا سے معاملہ کرتا رہے تو ایسی بے روح نماز اگر خدا سے دور کرنے کا سبب نہ بھی بنے تو قریب کرنے کا سبب ہرگز نہیں بنے گی اور کس طرح یہ عظیم ثواب ایسے نمازی کے لئے ہو سکتے ہیں؟

اسی طرح جو دعا پڑھنے میں مشغول ہو اس حال میں کہ اول سے آخر تک صرف اس کی زبان حرکت میں مشغول ہو تو اس کا زیادہ عمل کم نفع کا باعث ہوگا۔

اور اگر روایت میں دیکھیں کہ فلاں دعا پڑھنے کا ثواب شہید کے ثواب کے برابر ہے تو وہ یقیناً اس صورت میں ہے کہ وہ دارائے حقیقت اور روح دعا کا حامل ہو اور حقیقت دعا اس یقین سے عبارت ہے کہ تمام امور میں اپنے عجز و اضطرار کے ساتھ تمام ماسوئ اللہ اور تمام اسباب سے منہ موڑ لیا جائے اور یہ سمجھے کہ ان کا موثر ہونا حق تعالیٰ کے اذن پر موقوف ہے اور اللہ کے علاوہ ہر شے سے مکمل گلوخلاصی کرلے اور دل ہٹالے اور تمام توجہ اس ذات باری تعالیٰ کی طرف کردے اور اگر یہ حالت دعا کے پڑھنے کے موقع پر پیدا ہوجائے تو یقیناً اس کی مثل ہوگا جو میدان جنگ میں جائے اور راہ خدا میں قتل ہو جائے بلکہ ممکن ہے کہ اگر کسی کو مرتبہ کاملہ کی یہ حالت میسر ہو جائے تو شہداء کے جہاد کرنے کے موقع کی بہت سی حالتوں سے بہتر اور بالاتر ہو اور اسی طرح اگر دعا پڑھتے ہوئے کسی کی حالت اس شہید کی طرح ہو

جائے جو شہادت کے وقت ہوتی ہے، یعنی جس طرح اس کی توجہ اپنے پروردگار کی طرف ہوتی ہے اگر دعا پڑھنے والا بھی اس حال کو پالے تو یقیناً اس میں اور شہید میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

اگر کہا جائے کہ حسب حال و حقیقت دونوں مساوی ہیں پھر بھی شہید کا عمل، دعا پڑھنے کے عمل سے کہیں زیادہ سخت ہے، تو میں عرض کروں گا: جیسا کہ جواب دوم میں اشارہ کیا گیا ہے ایسی حالت آسانی سے میسر نہیں ہوتی اور مجاہدات نفسانیہ کے بغیر ہاتھ نہیں آتی اور یہ کہ جب تک ہزاروں مرتبہ نفس اور شیطان سے جہاد نہ کیا جائے کیونکر یہ حالت قادر الوجود اسے عطا فرمائے گا؟

اس مفہوم کی مزید وضاحت کے لئے ہم شیخ جعفر شوستری علیہ الرحمہ کی کتاب خصائص الحسینیہ کے باب دعا سے رسول خداؐ کی ایک حدیث کی تشریح نقل کرتے ہیں:

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "حسینؑ کی زیارت کا ثواب میرے ادا کئے ہوئے نوے حج اور عمرے کے برابر ہے۔"

اس عظیم ثواب کی وجہ غالباً یہ ہے کہ جب زائر حضرت کی محبت کے شوق سے سرشار ہو کر آپؑ کی زیارت کے لئے جاتا ہے تو وہ حقیقی خانہ خدا کی زیارت کا شرف حاصل کرتا ہے اور اس کے ساتھ زائر اپنے دل کو پیغمبر اکرمؐ کے دل کے مشابہ بنا کر اور اس دل میں محبت حسینؑ کی دنیا آباد کر کے قبر مطہر کے پاس حاضر ہوتا ہے یا دور سے اپنے قلب کو حضرت کی طرف متوجہ کر کے شکستہ دل کے ساتھ آپ پر درود و سلام پڑھتا ہے تو اس حالت میں اس کا دل محبت حسینؑ کی وجہ سے قلب پیغمبرؐ کے مشابہ ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ جب زائر اپنے دل میں یہ خیال کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے

فرزند کی بڑی دلداری کیا کرتے تھے اور ایک مرتبہ امام حسینؑ حالت سجدہ میں آنحضرتؐ کی پشت پر سوار ہوئے تو بھی رسول اکرمؐ نے ان کی نازبرداری کی اور آپؐ نے اپنے سجدہ کو طول دیا یہاں تک کہ حسینؑ پشتِ پیغمبرؐ سے خود بخود اترے اور اس منظر کے بعد جب زائر کے ذہن میں کربلا کا یہ منظر آتا ہے کہ جس حسینؑ کو آنحضرتؐ نے اپنی پشت سے اتارنا گوارا نہیں کیا تھا، میدان کربلا میں صالح بن وہب ملعون نے اسے نیزہ مار کر ذوالجناح کی پشت سے زمین پر گرادیا۔

پھر زائر اس منظر کا تصور کر کے مظلوم کربلا کو اپنے سلام سے تسلی دیتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے زخمی فرزند کی دلجوئی کے لئے آرہے ہوں اور چونکہ حضرت امام حسینؑ کا مرتبہ اس راز کی وجہ سے جو ہمیں معلوم نہیں بیت اللہ سے نوے گنا زیادہ ہے۔ اسی وجہ سے امام مظلوم کی زیارت کا ثواب پیغمبر گرامیؐ کے سو حج اور سو عمرے کے برابر بیان کیا گیا ہے۔

شیخ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی زائر کے دل میں امام حسینؑ کی اتنی محبت ہو جتنی کہ رسول اکرمؐ کو اپنے فرزند سے تھی تو اس کی زیارت کا ثواب بھی پیغمبرؐ کے نوے حج و عمرے کے برابر ہوگا۔ (تو شیخ جعفر شوستری کے بیان سے استفادہ کرتے ہوئے ہم بھی یہی کہیں گے کہ جب کسی دل میں مذکورہ دعاؤں کی حقیقت کا مکمل ادراک پیدا ہوجائے تو اسے بھی ان دعاؤں کے بدلے میں شہید کا ثواب ضرور ملے گا۔)

اس موضوع پر مزید بحث طول کلام کا موجب ثابت ہوگی۔ لہذا ہم اس موضوع کو انہی جوابات پر ختم کرتے ہیں۔

آنسو کہاں سے جنم لیتے ہیں؟

سوال ۴۷

کیا آنسو لعاب دہن اور ناک کے پانی کے ملاپ سے جنم لیتے ہیں یا جب دل میں سوزش پیدا ہوتی ہے اور دل سے بخارات اٹھ کر سر کی طرف منتقل ہوتے ہیں تو ان بخارات سے آنسو پیدا ہوتے ہیں؟

جواب

حاسہء چشم کے دیکھنے کے لئے جتنی رطوبت کی ضرورت ہوتی ہے اتنی رطوبت ہمیشہ آنکھوں میں موجود ہوتی ہے اور بعض اوقات داخلی اور خارجی اسباب کی وجہ سے آنکھ سے پانی بہتا ہے۔ مگر آنکھ سے نکلنے والا ہر پانی آنسو نہیں ہوتا۔

آنسو اس وقت جنم لیتے ہیں جب کسی ناملائم واقعہ کی وجہ سے دل میں ایک آگ سی لگے۔ اس آگ سے بخارات اٹھتے ہیں جو دماغ تک پہنچتے ہیں اور دماغ انہیں آنکھوں کی طرف منتقل کرتا ہے اور پھر وہی بخارات آنسو کی صورت میں آنکھ سے ٹپکنے لگتے ہیں۔ لہذا جب تک خون دل کی آمیزش نہ ہو وہ آنسو نہیں پانی ہے۔ جو شخص ہمیشہ ناملائم واقعات کو یاد کرتا رہے اس کی آنکھوں سے زیادہ سے زیادہ آنسو برآمد ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ ہمیں اپنے خوف یا اپنی ملاقات کے شوق یا خدا کے دوستوں سے بچھڑنے اور امام مظلوم علیہ السلام کے غم میں زیادہ سے زیادہ آنسو بہانے کی توفیق عطا فرمائے اور ان امور میں رونا بہترین وسیلہء سعادت ہے۔

سماع اور استماع میں فرق

سوال ۷۵

سماع اور استماع میں کیا فرق ہے؟

جواب

سماع کسی آواز کے کان سے ٹکرانے کو کہا جاتا ہے جس میں سننے والے کا کوئی ارادہ و التفات نہ ہو۔

استماع غور سے کسی چیز کو سننے اور سمجھنے کو کہتے ہیں۔ اسی لئے راگ کا سماع حرام نہیں ہے۔ استماع حرام ہے۔

لہذا انسان اگر موسیقی کو سننا پسند نہ کرتا ہو اور اتفاق سے اس کے کانوں میں موسیقی کی آواز ٹکراتی رہے تو یہ گناہ نہیں ہے۔ (البتہ جب کوئی توجہ سے موسیقی کو سنے اور اس سے لطف اندوز ہو تو پھر اس کا یہ فعل حرام قرار پائے گا۔)

جو شخص توجہ سے آیت سجدہ کو سنے تو اس پر سجدہ کرنا واجب ہو جائے گا اور اگر ویسے ہی آیت سجدہ کانوں میں پڑ جائے تو سجدہ کرنا واجب نہیں ہے البتہ احتیاط یہ ہے کہ سجدہ کرے۔

سیر و سلوک اور شیطانی ریاضت

سوال ۷۶

رحمانی ریاضت جائز ہے۔ رحمانی اور شیطانی ریاضت کا فرق واضح کریں؟

جواب

رحمانی ریاضت سے مراد یہ ہے کہ انسان کے تمام حرکات و افعال امر الٰہی کے تابع ہوں اور اس کا کوئی فعل خواہش نفس کے تحت نہ ہو۔

دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صفتِ تقویٰ کے حصول کی جدوجہد کرنے کو ریاضت رحمانی کہا جاتا ہے۔

تقویٰ کے کئی درجے ہیں اور حصول نجات تقویٰ پر موقوف ہے۔ تقویٰ کے بغیر انسان آخرت کے نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور تقویٰ کے بغیر بلند درجات کا حصول ناممکن ہے اور تقویٰ کے ہر مرتبے کے لئے علیحدہ علیحدہ محنت و ریاضت کرنی پڑتی ہے۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے عثمان بن حنیف کو ایک خط لکھا تھا جو نہج البلاغہ میں شامل ہے جس میں آپ نے اپنی ریاضت کا ان الفاظ سے تذکرہ کیا: وَاِنَّمَا هِيَ نَفْسِي اَرُوْضُهَا بِالتَّقْوٰى لِتَاْتِيَ اٰمِنَةً يَوْمَ الْخَوْفِ الْاَكْبَرِ وَ يَثْبُتَ عَلَى الْجَوَانِبِ الْمَزْلَقِ. (نہج البلاغہ مکتوب ۴۵) "اور میری توجہ تو صرف اس طرف ہے کہ میں تقویٰ الٰہی کے ذریعے اپنے نفس کو بے قابو نہ ہونے دوں تاکہ اس دن کو جب خوف حد سے بڑھ جائے گا، وہ مطمئن رہے اور پھسلنے کی جگہوں پر مضبوطی سے جما رہے اور یہی دین کا راستہ اور صراط مستقیم ہے۔"

ریاضت رحمانی جو کہ نفس کی تقویٰ کیلئے ریاضت ہے، کے کئی درجے ہیں:

تقویٰ کا پہلا مرحلہ

تمام واجبات کو ادا کرنا اور تمام محرمات کو چھوڑ دینا تقویٰ کا پہلا مرحلہ ہے۔
یعنی انسان کوشش کرے کہ وہ اللہ کے کسی مقرر کردہ فرض کو اس کے بتائے ہوئے طریقے پر سرانجام دے اور محرمات سے پرہیز کرے اور اس مرحلے پر انسان کو ہمیشہ

یہ فکر کرنی چاہئے کہ اس کے اعمال و افعال میں کسی طرح کی ریاکاری اور تعریف کے حصول کی خواہش کارفرما نہ ہو اور اس مرحلے پر انسان کو یہ حقیقت ہر وقت مدنظر رکھنی چاہئے کہ ریابذات خود حرام ہے اور ریا شرک کی ایک مخفی قسم ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ عبادات میں اخلاص پیدا کرنا کافی دشوار ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے شرح کافی میں تحریر فرمایا: جب تک انسان مدح کا خواہش مند اور مذمت سے خائف رہے اس وقت تک وہ ریا کے خطرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے جذبہ اخلاص کے ساتھ واجبات کو بجالانا ایک مشقت طلب امر ہے۔

اصول کافی میں رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا: قَالَ اللّٰهُ وَمَا تَحَبَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهٗ عَلَیْهِ. (بحارالانوار ج ۷۰۔ ص ۲۲)
"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فرض کی ادائیگی سے جس طرح کوئی میرا محبوب بن سکتا ہے ایسا کسی اور عمل کے بجالانے سے نہیں بن سکتا۔"

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے فرض کی ادائیگی کی طرح سے کوئی اور عمل پسند نہیں ہے۔ فرائض کی ادائیگی کی طرح محرمات سے پرہیز بھی نفس امارہ کے لئے بہت مشکل ہے۔ محرمات میں جھوٹ، غیبت، تہمت بھی شامل ہیں جو کہ آج کے معاشرے میں رچ بس چکے ہیں اور ان کے ترک کرنے کی مشکل ظاہر ہے۔ (لہذا جب تک انسان واجبات کی ادائیگی اور محرمات کے ترک کو یقینی نہ بنائے اس وقت تک تقویٰ کے پہلے زینہ پر نہیں چڑھ سکتا۔)

تقویٰ کا دوسرا مرحلہ

ریاضت نفس کے لئے تقویٰ کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان مستحبات کو ادا کرے اور مکروہات کو ترک کردے اور دن رات یہ کوشش کرے کہ اس سے کوئی مستحب نہ چھوٹنے پائے اور کوئی مکروہ سرانجام نہ ہونے پائے اور مستحبات کے ضمن

میں تاکیدی مستحبات پر زیادہ سختی سے عمل کرے کیونکہ ان کے ترک پر مذمت وارد ہوئی ہے اور اس مرحلے پر انسان کو نماز جماعت، سحر خیزی، نماز پنج گانہ کی سنتیں اور خاص طور پر نماز شب کی پابندی کرنی چاہئے نیز اوقات نماز کی پابندی کرنی چاہئے اور تمام عبادات خصوصاً نماز کو حضور قلب سے ادا کرنا چاہئے اور جو کوئی اس مرحلہ میں زیادہ کوشش کرے گا، پروردگار عالم کا قرب اسے زیادہ نصیب ہوگا۔ جیسا کہ سابقہ حدیث کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔

حدیث قدسی میں مذکور ہے: لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَ بَصَرَهُ الَّذِیْ یَبْصِرُ بِهٖ وَ لِسَانَهُ الَّذِیْ یَنْطِقُ بِهٖ وَ یَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا اِذَا دَعَانِیْ اَجَبْتُهٗ وَاِذَا سَاَلَنِیْ اَعْطَیْتُهٗ. (بحارالانوار ج ۷۰۔ ص ۲۲۔ محاسن برقی ج ۱۔ ص ۲۹۱) "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان نوافل کے ذریعے سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ پھر وہ منزل آتی ہے کہ جب میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں کسی انسان کو محبوب بناتا ہوں تو میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کی وہ زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے اور میں اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ چیزوں کو پکڑتا ہے اور میں اس کا وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ جب وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اسے جواب دیتا ہوں اور جب وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں۔"

ہمارے بزرگوں میں سے کچھ افراد کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تمام محرمات اور مکروہات کے تارک تھے اور ان کے اعمال واجب یا مستحب پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان میں سید ابن طاؤس، جناب مولیٰ عبداللہ شوستری، جناب شہید ثانی اور جناب مقدس اردبیلی نوراللہ مراقدہم سرفہرست تھے۔

حضرت مقدس اردبیلی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ چالیس سال تک پاؤں پھیلا کر کبھی نہیں سوئے تھے اور کہتے تھے کہ یہ خلاف ادب ہے۔

درج بالا بزرگوں اور دیگر بزرگواروں کے حالات سے آگاہی کے لئے کتاب منتخب التواریخ کا مطالعہ فرمائیں۔

تقویٰ کا تیسرا مرحلہ

تقویٰ کے اس مرحلے کے لئے سالک کو چاہئے کہ وہ غفلت کو زائل کرنے کے لئے ذکر خداوندی کا سہارا لے اور کسی بھی وقت حق تعالیٰ کے ہمیشہ قائم رہنے والے ساتھ کو فراموش نہ کرے اور اپنے دل کو تجلیات ربانیہ کا مرکز بنائے اور غفلت کے جتنے بھی اسباب ہوں ان سے اپنے آپ کو بچائے اور اس مرحلے پر اپنے آپ کو "اولوالالباب" کے مقام پر پہنچائے جن کے متعلق فرمان خداوندی ہے: اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ.... (آل عمران ۱۹۱) "جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل یاد کرتے ہیں۔"

کیونکہ مذکورہ مراتب اور تفصیل کلام کی طوالت کا موجب ہوگی اس لئے ہم اسی قدر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں لیکن وہ چیز جو طالبینِ درجات کے لئے قابل تذکر ہے وہ نفس کشی کی ایک قسم ہے کہ جو کوئی مراتب سیر کے کسی مرتبہ پر فائز ہوتا ہے لازمی طور پر اسی پر عامل ہوتا ہے، اس کے بغیر روحانی مقامات کو طے کرنا محال ہوتا ہے اور وہ کھانے پینے کی کثرت اور ذائقہ سے اپنے نفس کو روکنا ہے۔ اس نفس کشی کے مکمل ترین قائدے وہ ہیں جو عنوان بصری کی حدیث میں بحارالانوار کی جلد اول میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہیں۔

امام علیہ السلام نے ایک سالک کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: فَاِيَّاكَ اَنْ تَاْكُلَ مَالاَ تَشْتَهِيْهِ فَاِنَّهُ يُوْرِثُ الْحِمَاقَةَ وَالْبَلَهَ وَلاَ تَاْكُلْ اِلاَّ عِنْدَ الْجُوْعِ وَاِذَا

اَكَلْتَ فَكُلْ حَلاَلاً وَ سَمِّ اللّٰهَ وَاذْكُرْ حَدِيْثَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمْ مَا مَلَاَ آدَمِيٌّ وِعَاءً اَشَرًّا مِنْ بَطْنِهٖ فَاِنْ كَانَ وَلاَ بُدَّ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهٖ وَ ثُلُثٌ لِشَرَابِهٖ وَ ثُلُثٌ لِنَفَسِهٖ.

"تجھے اشتہاء کے بغیر کھانا نہیں کھانا چاہئے۔ بلا اشتہا کھانا حماقت اور پاگل پن پیدا کرتا ہے اور بھوک کے بغیر تجھے کھانا نہیں کھانا چاہئے اور جب کھائے تو حلال کھا اور اللہ کا نام لے کر کھانا کھا اور کھانے کے وقت پیغمبر خداؐ کی یہ حدیث یاد رکھنی چاہئے کہ آدمی نے اپنے پیٹ سے زیادہ بُرا برتن نہیں بھرا۔ اگر کھانا کھانا ضروری ہو تو پیٹ کی تہائی کو طعام سے بھرو اور تہائی کو پانی سے بھرو اور تہائی کو سانس کی آمد ورفت کے لئے خالی چھوڑ دو۔"

امیرالمومنین علیہ السلام نے عثمان بن حنیف کے نام اپنے ایک خط میں تحریر فرمایا: وَاَيْمُ اللّٰهِ يَمِيْنًا اَسْتَثْنِيْ فِيْهَا بِمَشِيْئَةِ اللّٰهِ لَاَرُوْضَنَّ نَفْسِيْ رِيَاضَةً تَهِشُّ مَعَهَا اِلَى الْقُرْصِ اِذَا قَدَرْتُ عَلَيْهِ مَطْعُوْمًا وَ تَقْنَعُ بِالْمِلْحِ مَاْدُوْمًا وَلاَ دَعَنَّ مُقْلَتِيْ كَعَيْنِ مَاءٍ نَضَبَ مَعِيْنُهَا مُسْتَفْرِغَةً دُمُوْعَهَا اَتَمْتَلِئُ السَّائِمَةُ

کھالے اور بس سو جائے۔ اسکی آنکھیں بے نور ہو جائیں اگر وہ زندگی کے طویل سال گزارنے کے بعد کھلے ہوئے چوپاؤں لور چرنے والے جانوروں کی پیروی کرنے لگے۔

شیطانی ریاضت

چند باطل مقاصد لور موہوم منافع کے حصول کے لئے جنات اور ہمزاد کی تسخیر لور جنات و شیاطین کا تقرب حاصل کرنے کی غرض سے ابلیسی کام سرانجام دینے کو شیطانی ریاضت کہا جاتا ہے اور اسی طرح تمام اقسام سحر جن پر اس سے پہلے سوال میں اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض بدبخت اس کے لئے چالیس دن تک کوئی نیک کام نہیں کرتے لور شرمناک افعال سرانجام دیتے ہیں۔ مثلاً مقدس آسمانی کتب کی ہتک کرتے ہیں ان کو اپنے پاخانوں میں لور گندگی کے ڈھیروں پر لٹکاتے ہیں لور اسی طرح تمام مقدسات دینی کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ خاص طور پر زنا کرتے ہیں لور زنا کے لئے بھی شوہردار عورتوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور یہ فعل شنیع ان کے دیوث شوہروں کے سامنے سرانجام دیا جاتا ہے۔

مذکورہ بدبخت لوگوں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ابلیسی "شکتی" کے حصول کے لئے کسی مظلوم کو قتل کرتے ہیں لور اس کے خون کو مخصوص برتنوں میں جمع کر کے کئی دنوں تک اس خون کو کھاتے ہیں لور جو ان کے گروہ سے متعلق ہوتا ہے اسے کھلاتے ہیں۔

بخیل، لئیم، سخی اور کریم

سوال ۷۷

بخیل، لئیم، سخی لور کریم کا فرق واضح فرمائیں۔

جواب

بخیل وہ ہے جو اپنی دولت کو صرف اپنی ذات پر خرچ کرے لور دوسروں کو نہ دے۔

لئیم وہ ہے جو اپنی دولت میں سے نہ تو کسی کو کچھ کھلائے لور نہ ہی خود کھائے لور لئیم کا پست ترین درجہ یہ ہے کہ انسان کسی کو دوسرے پر خرچ کرتے ہوئے بھی برداشت نہ کرے۔

بحارالانوار میں مرقوم ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے ایک شخص کو پانچ "وسق" (ایک مخصوص پیمانہ) کھجوریں عطا فرمائیں۔

پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا: اس کے لئے تو کھجوروں کا ایک "وسق" ہی کافی ہے۔

آپؑ نے فرمایا: خدا کرے کہ تجھ جیسے افراد زیادہ نہ ہوں۔ میں ایک چیز دے رہا ہوں لور بخل تو کر رہا ہے۔

سخی وہ ہے جو خود بھی کھائے لور دوسرے ضرورت مندوں کو بھی کھلائے۔

کریم وہ ہے جو خود نہ کھائے لور بدلے کی توقع کے بغیر دوسروں کو کھلائے۔

اقسام حدیث

سوال ۷۸

درایت، روایت، خبرواحد، خبر مستفیض، متواتر، سند حسن، سند صحیح، روایت معتبر لور اقسام روایت کی وضاحت فرمائیں۔

جواب

"روایت" نقل حدیث کو کہا جاتا ہے۔

"درایت" حدیث کے معنی و مفہوم کو سمجھنا ہے اور صحیح، سقیم لور مقبول و

مردود کو سند کے اعتبار سے الگ الگ کرنے کو درایت کہا جاتا ہے۔

"خبر متواتر" ایسی خبر جس کی نقل کرنے والے اتنے زیادہ ہوں کہ عادتاً انہیں جھوٹا سمجھنا محال ہو اور یہ خبر یقینی علم کی موجب ہوتی ہے۔

"خبرواحد" وہ خبر جو حد تواتر پر پہنچی ہوئی نہ ہو خواہ اس کا راوی ایک ہو یا ایک سے زیادہ ہوں خبرواحد کی بہت سی اقسام ہیں ان میں سے ایک خبر مستفیض ہے۔

"خبر مستفیض" اس خبر کو کہا جاتا ہے جس کے ہر طبقے میں راوی موجود رہے ہوں اور اکثر محدثین کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے کہ جس خبر کے ہر طبقے میں تین سے زیادہ راوی ہوں اسے خبر مستفیض کہا جاتا ہے۔

"خبرواحد" کی اقسام میں سے ایک قسم کا نام "خبر صحیح" ہے۔ "خبر صحیح" اس خبر کو کہا جاتا ہے جس کا سلسلہ سند معصوم تک متصل ہو اور اس کے تمام راوی عادل ہوں اور امامی المذہب ہوں۔

"خبر حسن" اس خبر کو کہا جاتا ہے جس کا سلسلہ سند معصوم تک متصل ہو اور اس کے تمام راوی امامی المذہب اور ممدوح ہوں لیکن ان کی عدالت ثابت نہ ہو۔

"خبر مؤثق" وہ خبر ہے جس کا سلسلہ سند معصوم تک متصل ہو اور علمائے رجال خاصہ نے اس کے رجال کی توثیق کی ہو لیکن سلسلہ سند میں کوئی ایسا راوی موجود ہو جو فاسد العقیدہ ہو یعنی امامی المذہب نہ ہو۔

"خبر ضعیف" وہ خبریں جس میں خبر صحیح، خبر حسن اور خبر مؤثق کی شرائط نہ پائی جائیں اسے خبر ضعیف کہتے ہیں۔ خبر ضعیف کی بھی بہت سی اقسام ہیں جن میں سے ایک قسم کا نام "موقوف" ہے۔

"موقوف" اس خبر کو کہا جاتاہے جس کا سلسلہ سند معصوم تک متصل نہ ہو بلکہ اس کا سلسلہ سند معصوم کی بجائے معصوم کے کسی صحابی پر ختم ہو۔ ان ہی میں

ایک "خبر مقطوع" ہے۔

"خبر مقطوع" اس خبر کو کہا جاتا ہے جس کا سلسلہ سند صحابی کی بجائے تابعی پر رک جائے۔ واضح رہے کہ جس نے معصوم کی زیارت کی ہو اسے صحابی کہا جاتا ہے اور جس نے معصوم کے صحابی کی زیارت کی ہو اسے تابعی کہا جاتا ہے۔

"خبر مضمر" اس خبر کو کہا جاتا ہے جس کے سلسلہ سند کے آخر میں معصوم کے نام کی تصریح موجود نہ ہو۔

"خبر معضل" وہ خبر جس کے سلسلہ سند میں دو یا دو سے زیادہ راویوں کا تذکرہ موجود نہ ہو۔

"خبر مرسل" وہ خبر جس میں تمام راویوں کا نام حذف ہو یا ان میں سے کچھ کا نام حذف ہو۔

ان کے علاوہ بھی حدیث کی کچھ اور اقسام ہیں۔ شائقین کو متعلقہ کتب کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

حسد اور رشک

سوال ۷۹

حسد اور رشک کا باہمی فرق واضح فرمائیں۔

جواب

جب کسی کو یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی پر تازہ نعمت عطا کی ہے تو اس کا دو میں سے ایک حال ہوگا۔

قسم اول: نعمت کی اطلاع پاکر اسے دکھ ہوا ہو اور اس کی آرزو ہو کہ اس

سے نعمت سلب ہو جائے۔ اس حال کو "حسد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس کسی دوسرے کی نعمت دیکھ کر چڑنا اور اس کی نعمت چھن جانے پر خوش ہونا حسد ہے۔

قسم دوم: نعمت کی اطلاع پاکر اسے دل میں کوئی جلن محسوس نہ ہو اور زوال نعمت کی خواہش بھی اس کے دل میں نہ ہو بلکہ اس کے دل میں یہ خواہش ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جیسے دوسرے کو نعمت عطا کی ہے ویسے اسے بھی نعمت سے مالامال کرے۔ چنانچہ اس حالت کو "غبطہ و منافسہ" یعنی رشک کہا جاتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے: اِنَّ الْمُؤْمِنَ يَغْبِطُ وَلاَ يَحْسُدُ وَالْمُنَافِقُ يَحْسُدُ وَلاَ يَغْبِطُ. (کافی ج۲۔ ص۳۰۷، بحارالانوار ج۷۳۔ ص۲۵۰)
"مومن رشک کرتا ہے۔ حسد نہیں کرتا اور منافق حسد کرتا ہے رشک نہیں کرتا۔"

حسد کے درجے

حسد کے چار درجے ہیں۔ ایک درجہ یہ ہے کہ انسان دوسرے شخص کی نعمت کے زائل ہونے کی آرزو کرے اگرچہ اسے زوال نعمت سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو اور یہ حسد کی بدترین قسم ہے۔

حسد کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کی نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرے اور مذکورہ نعمت کو اپنے لئے طلب کرے۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کے اچھے مکان یا خوبصورت بیوی کی وجہ سے اس سے حسد کرے اور یہ خواہش کرے کہ وہ مکان اور اس کی بیوی اس کی جائے میرے تصرف میں آجائے۔
یہ قسم بھی حسد کی خبیث ترین اقسام میں سے ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلاَ تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ. (النساء ۳۲) "اور تم اس کی تمنا نہ کرو جس کے ذریعے سے خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔"

حسد کی تیسری قسم یہ ہے کہ انسان کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھے اور اس کی خواہش ہو کہ اس جیسی نعمت اسے بھی مل جائے لیکن جب اسے اس جیسی نعمت نصیب نہ ہو تو پھر صاحب نعمت سے اس کے زوال کی تمنا کرنے لگ جائے تاکہ محرومی کے لحاظ سے دونوں یکساں نظر آئیں اور اگر وہ اس نعمت کو زائل کرنے پر قادر ہو تو وہ ایسا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کرے۔

حسد کی چوتھی قسم بھی تیسری قسم جیسی ہے لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر حاسد محسود کے زوال نعمت پر قادر ہو تو دین و عقل کی وجہ سے ایسا نہ کرے۔ ایسے حاسد کے لئے نجات کی امید کی جاسکتی ہے اور ایسا حاسد عفو خداوندی کا مستحق بن سکتا ہے۔

حسد کی اقسام اور ان کے علاج کے طریقہ کے لئے کتب اخلاق کی طرف رجوع فرمائیں۔

رشک کے متعلق یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہئے جس پر عموماً توجہ نہیں دی جاتی کہ مباح اور مستحب رشک اس وقت تک مباح اور مستحب رہتا ہے جب وہ حسد کی حدود میں داخل نہ ہو اور غالباً رشک میں یہ خطرہ پوشیدہ ہے کیونکہ رشک کی صورت میں بعض اوقات جب انسان کو مذکورہ نعمت میسر نہیں آتی تو اس کا رشک، حسد سے بدل جاتا ہے اور وہ محسود سے زوال نعمت کی تمنا کرنے لگ جاتا ہے کیونکہ اکثر افراد کی نفسیاتی افتاد کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ انسان اپنی محرومی کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتا اور اس کی منفی سوچ اسے اس بات پر مجبور کردیتی ہے کہ وہ محسود سے زوال نعمت کی تمنا کرے اور یوں رشک کا جذبہ حسد کی تیسری یا چوتھی قسم میں بدل جاتا ہے۔ کم ہی کوئی شخص اس ہلاکت آفریں صورت سے امان میں ہوتا ہے اور جب تک کوئی شخص اللہ کی عطا کردہ توفیق سے مالامال نہ ہو اور اسے مقام رضا و

تسلیم حاصل نہ ہو اس وقت تک حسد سے محفوظ رہنا بڑا مشکل ہے۔

عوذ اور لوذ کا فرق

سوال ۸۰

"اَعُوذُ" اور "اَلُوذُ" میں کیا فرق ہے؟

جواب

"عَوذُ" اور "لَوذُ" کا مفہوم ازروئے لغت برابر ہے۔ یعنی کسی فریاد رس اور حاجت روا کی پناہ لینا۔ البتہ دونوں الفاظ میں تھوڑا سا فرق ہے۔

استعاذہ کے پانچ ارکان ہیں اور جب تک وہ پورے نہ ہوں استعاذہ کا عمل وقوع پذیر نہیں ہوتا: (۱)حقیقت استعاذہ۔ (۲)استعاذہ کرنے والا۔ (۳)جس کے وسیلے سے استعاذہ کیا جائے۔ (۴)جس سے استعاذہ کیا جائے (یعنی پناہ دینے والا)۔ (۵)وہ چیز جس سے پناہ کی درخواست مطلوب ہو۔

۱۔ "استعاذہ" کی حقیقت یہ ہے کہ انسان دنیاوی اور اخروی آفات اور دنیاوی اور اخروی نعمات سے اپنی محرومی کو مدنظر رکھے اور اسے یہ یقین حاصل ہو کہ وہ دنیا و آخرت کے نقصانات سے بچنے پر ازخود قدرت نہیں رکھتا اور نہ ہی دنیا و آخرت کی نعمات کے حصول پر ذاتی طور پر قدرت رکھتا ہے بلکہ وہ ان چیزوں کے لئے قادر اور رحیم و کریم خدا کا محتاج ہے اور اسی سے خیرات و نعمات کا حصول ممکن ہے۔ اس تصور کے بعد انسان "اَعُوذُ بِاللّٰہِ" کہے۔

جب تک بندہ اپنی ذلت اور احتیاج اور خدا کی عزت اور بے نیازی کا یقین نہ حاصل کرلے اس وقت تک استعاذہ کی حقیقت کو سمجھ نہیں سکتا۔

۲۔ استعاذہ کا دوسرا رکن "مستعیذ" ہے۔ یعنی وہ پناہ طلب کرنے والا فرد جس پر استعاذہ کی حقیقت واضح ہو چکی ہو اور جو زبانِ حال اور لسانِ قال سے پناہ طلب کرتا ہو۔

۳۔ "مستعاذبہ" اور وہ پروردگار عالم ہے یا وہ واسطے اور وسائل جو خود اس نے بندوں کی فریاد رسی کے لئے اپنے لئے قرار دیئے ہیں یعنی محمدؐ و آل محمدؐ اور اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور کلمات تامہ۔

۴۔ "مستعاذ منہ" جس چیز کے شر سے پناہ لی جائے وہ ابلیس اور نفس امارہ ہے۔ یا پھر وہ شریر شخص جس کے شر سے مستفید تنگ اور عاجز ہو اور ناچار اپنے پالنے والے کی پناہ چاہے۔

۵۔ "مستعاذ لاجلہ" وہ چیز جس کی وجہ سے استعاذہ کی ضرورت پیش آتی ہے یعنی شر شیطان و انسان سے بچنے کی ضرورت۔

لفظ "الوذ" کے استعمال کے لئے چار ارکان کا ہونا ضروری ہے: (۱)التجا۔ (۲)التجا کرنے والا۔ (۳)جس نے التجا کی جائے۔ (۴)جس کی وجہ سے التجا کی جائے۔

حقیقت استعاذہ اور حقیقت التجا میں کوئی فرق نہیں ہے۔

"ملتجی" وہ شخص ہوتا ہے جو گرفتار بلا ہو اور پروردگار عالم "ملتجی الیہ" ہے اور "ملتجی لاجلہ" وہ چیز جس کی وجہ سے پناہ مانگی جارہی ہو۔ مثلاً انسان اپنے کسی گناہ کو یاد کر کے اس کے عذاب کو اپنے سامنے رکھے اور اس کے عذاب سے پناہ طلب کرے تو وہ عذاب "ملتجی لاجلہ" قرار پائے گا۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی نقصان دینے والی چیز کی پناہ حاصل کرنے کی غرض سے انسان "اَعُوذُ" کہتا ہے اور شر نفس سے پناہ حاصل کرنے کے لئے "اَلُوذُ بِكَ وَلَا اَلُوذُ بِسِوَاكَ" کہتا ہے یعنی تجھ سے التجا کرتا ہوں تیرے سوا کسی اور سے التجا نہیں کرتا۔

عمل سامری

سوال ۸۱

اس کے بعد کہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام کے معجزات کے وسیلہ سے بنی اسرائیل پر حجت تمام کروی تھی اور انہیں راہ ہدایت دکھا دی تھی، عمل سامری کے ذریعے گوسالہ کے ذریعے جس میں سے آواز آتی تھی قوم کا امتحان لیا گیا اور معجزہ وہ ہوتا ہے جو صالح شخص اور سچے مدعی کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ نے عصا کے ذریعے معجزہ دکھایا۔ سامری نے بھی گوسالہ کے ذریعے معجزہ ظاہر کیا جبکہ کسی اور کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اور اس بات کی تشخیص کہ سامری صادق تھا یا کاذب دشوار ہے اور کیوں خداوند عالم نے حضرت جبرئیلؑ کے گھوڑے کے سموں کی خاک کو یہ تاثیر دے دی تھی جو توحید سے منہ موڑنے کا سبب بنی اور کہاں سے سامری نے خاک کی اس تاثیر کا کھوج لگایا؟

جواب

سامری کا عمل خارق عادت ہرگز نہیں تھا بلکہ خالص صنعت گری پر مبنی تھا اور سونے وغیرہ سے بچھڑا بنانا کوئی مشکل امر نہیں ہے اور اس کے سوراخوں سے ہوا کی آمد و رفت سے گوسالہ کی آواز کا نکلنا ممکن ہے اور اس کی مثالیں تو اس وقت بھی موجود ہیں۔ آج ایسی گھڑیاں موجود ہیں جن میں سے مرغ کی آواز بلند ہوتی ہے۔ بعض گھڑیوں سے چڑیوں کی آواز آتی ہے اور بعض گھڑیوں میں سے "یا کریم" کی آواز بلند ہوتی ہے۔ (یہ سب کچھ انسانی صنعت ہے معجزہ نہیں ہے) جبکہ حضرت موسیٰؑ کے عصا کا اژدہا میں تبدیل ہونا پروردگار کا معجزہ تھا اور اس جیسا فعل کسی دوسرے انسان سے صادر ہونا محال تھا۔

سامری کے سچ اور جھوٹ کو علیحدہ کرنا کوئی مشکل نہیں تھا کیونکہ جب اس نے اپنا بچھڑا بنا کر یہ کہا تھا کہ یہ موسیٰؑ و ہارون کا رب ہے تو اس کا جھوٹ تو واضح ہو چکا تھا کہ اس نے ایسے مصنوعی جسم کیلئے یہ دعویٰ کیا جو کوئی تمیز و عقل نہیں رکھتا تھا۔ (اسکے بعد اسکے دام تزویر میں کسی کے پھنسنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔) "ولا یملك لهم نفعاً ولا ضراً۔" اور وہ ان کے کسی فائدہ یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔

حضرت جبرئیلؑ فرعون کے غرق ہونے کے روز گھوڑے پر صورت بشر سوار تھے۔ ان کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی خاک کا حیات پا جانا ممکنات میں سے ہے اور روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اس بات کی اطلاع پہلے ہی دیدی تھی۔ جب فرعون کے غرق ہونے والے دن سامری نے دیکھا کہ حضرت جبرئیلؑ کے گھوڑے کے سموں کے نیچے خاک متحرک ہے تو اس نے اس میں سے کچھ خاک کو اٹھا لیا اور ایک ڈبیا میں بند کر لیا۔ وہ اس لئے بنی اسرائیل پر فخر کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے گوسالہ بنایا، وہ خاک اسکے اندر رکھی اور گائے کی آواز اسکے اندر سے آنے لگی۔

البتہ سامری کا حضرت جبرئیلؑ کو اور ان کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی خاک کا دیکھنا اور اس کا اٹھا لینا اور اسے گوسالہ بنانے سے نہ روکنا اور خاک سے وہ تاثیر سلب نہ کرنا اور اس میں سے آواز کا نکالنا، خداوند متعال کی جانب سے بنی اسرائیل کو چھوڑ دینے کے سبب تھا کہ جب حضرت موسیٰؑ نے ان سے کہا: "خدا نے واجب کیا ہے کہ ہم اس کی پرستش کریں" تو کیوں انہوں نے بت پرستی تروع کی جس کی وجہ سے انہیں امتحان کی سختی پیش آئی جبکہ وہ عظیم آیات الٰہی کا مشاہدہ کر چکے تھے جو حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے تھے اور انہی میں سے بنی اسرائیل کا دریا سے نجات پانا اور فرعونیوں کا اس میں غرق ہونا بھی تھا تو اس سب کے باوجود انہوں نے جھوٹے سامری کی پیروی کیوں کی؟

کیا ختنہ خلاف فطرت ہے؟

سوال ۸۲

خدا کی صنعت میں کمی کرنا درست نہیں ہے۔ تو کیا بچے کا ختنہ خدا کی صنعت میں کمی کرنے کے مترادف نہیں ہے؟

جواب

(ہر چیز کا موقع و محل ہے اور ہر چیز اپنے موقع و محل کے مطابق مفید ہوتی ہے۔) انسان شکم مادر میں منہ سے غذا لینے کے قابل نہیں ہوتا اسی لئے اسے ناف کے ذریعے سے غذا پہنچائی جاتی ہے اور جب انسان اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس ناف کی ضرورت نہیں رہتی اور وہ عضو زائد بن جاتی ہے۔ اسی لئے اسے علیحدہ کردیا جاتا ہے۔ اور مرد بچے کے عضو تناسل میں قوت جاذبہ موجود ہوتی ہے۔ اگر شکم مادر میں اس پر زائد چمڑے کا خول نہ ہوتا تو ماں کے شکم کا خون اور دیگر کثافتیں اس ذریعے سے بچے کے شکم میں منتقل ہو جاتیں۔ اسی حکمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے زائد چمڑے کا ایک خول ساتھ رکھ دیا تاکہ بچہ کثافتوں سے ملوث نہ ہو اور جب بچہ زمین پر آتا ہے تو وہ چمڑا زائد شمار ہوتا ہے اور اگر اسے ساتھ رہنے دیا جائے تو اس میں جراثیم کی پرورش کا امکان ہوتا ہے۔ اسی لئے شریعت طاہرہ نے اس زائد چمڑے کو ختنہ کے ذریعے سے جدا کرنے کا حکم دیا تاکہ بچہ جراثیمی حملے سے محفوظ رہ سکے۔ البتہ عورت کا ختنہ مستحب ہے کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ جب لڑکی بلوغت کو پہنچتی ہے تو وہ گوشت خودبخود زائل ہو جاتا ہے۔

ملحقات

ولایت فقیہ اور اس کا ماخذ

سوال

حکومت اسلامی جمہوری ایران کی بنیاد مسئلہ ولایت فقیہ پر قائم ہے اور ایرانی آئین کی پانچویں شق میں اس کا تذکرہ کیا گیا۔ اس کی حقیقت کیا ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟

جواب

اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء ۵۹) "ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں۔ پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو۔ یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔"

لفظ "اَطِيعُوا" کی تکرار دلالت کرتی ہے کہ اہل ایمان پر دو قسم کی اطاعت فرض ہے:

۱۔ اہل ایمان پر اللہ کی اطاعت واجب ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو عباداتی احکامات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر سیاسی و اجتماعی احکامات جیسے جہاد و حدود و قصاص و قضاوت جن کے کلیے قرآن مجید میں بیان کردیئے گئے ہیں اور ان کی تفصیل رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومین کے فرامین میں موجود ہے، پر عمل کرنا فرض ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ.... (نحل ۴۴) "اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس چیز کی وضاحت کریں جو ان کی طرف بھیجی گئی ہے۔"

اس سے پہلے آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ. (نحل ۴۳) "اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھو۔"

قبولِ ولایت شرطِ ایمان ہے

مسلمانوں پر دوسری اطاعت جو کہ اللہ نے واجب کی ہے وہ رسول کی اطاعت ہے کہ مسلمان رسول اکرمؐ کو اپنا دین کا پیشوا تسلیم کریں اور تمام دینی اور اجتماعی و سیاسی احکام میں رسول کو اپنا مرجع وماوا تسلیم کریں اور ولایت و حکومت اگرچہ خدا کا حق ہے مگر خدا نے اپنی نیابت میں رسول اکرمؐ کو حاکم علی الاطلاق مقرر کیا ہے کیونکہ رسول معصوم ہیں اور معصوم اپنے تمام اقوال و افعال میں حکم خداوندی کا پابند ہوتا ہے۔

اس مقام عصمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلاَ وَ رَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (النساء ۶۵) "پس آپ کے پروردگار کی قسم! یہ ہرگز صاحب ایمان نہ بن سکیں گے جب تک آپ کو اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں، پھر جب آپ فیصلہ کردیں تو اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی کا احساس نہ کریں اور آپ کے فیصلے کے

سامنے سراپا تسلیم ہو جائیں۔"

حکومت اور فیصلہ کرنا خالص رسول کا حق ہے اور انسان اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک کہ آپ کے فیصلے کو دل و جان سے تسلیم نہ کرے اور آپ کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم نہ کرے (اور اسے اللہ کا فیصلہ نہ قرار دے۔) کیونکہ آنجنابؐ نے کسی ایک کے نفع اور دوسرے کے نقصان کے لئے کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ الٰہی دستور اور قوانین خداوندی کے تحت فیصلے صادر فرمائے ہیں۔

حضرت پیغمبرؐ بیک وقت رسول تھے اور اللہ کا پیغام مسلمانوں تک پہنچاتے تھے اور احکام اسلام کو ان کے سامنے بیان فرماتے تھے۔ اس کے ساتھ آپ مسلمانوں کے امام بھی تھے ان کی رہنمائی فرماتے اور ان کے اجتماعی امور کی سرپرستی کرتے تھے۔

اطاعت امام کی اہمیت

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے دو قسم کی اطاعت روز قیامت تک واجب ہے۔ یعنی جس طرح کہ ہر دور اور زمان میں تمام قوانین اور احکام اسلام کی اطاعت واجب ہے اسی طرح واجب الاطاعت امام کی اطاعت ہر زمانے میں قیامت تک واجب ہے۔

علمائے عامہ و خاصہ نے پیغمبر اکرمؐ سے یہ حدیث متواتر نقل کی ہے: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (الکافی ج ۲۔ ص ۲۰۸) "جو اپنے دور کے امام کو پہچانے بغیر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔"

یعنی ایسا شخص مسلمان ہو کر نہیں مرا کیونکہ اس نے رہبر الٰہی کو نہیں پہچانا اور اس کی پیروی نہیں کی اور جب کوئی شخص امام حق کی پیروی نہ کرے تو کسی نہ کسی امام باطل کا پیروکار ہوگا اور واضح ہے کہ جو امام کا حشر ہوگا مقتدی پر اس کا اثر ہوگا اور جہاں امام کا کاشانہ ہوگا وہیں مقتدی کا ٹھکانہ ہوگا۔

حق ناشناس اور خود پرست امام اپنے مقتدی کو بھی حق ناشناسی اور خود پرستی کی تعلیم دے گا اور اسے ہر قسم کے فتنہ و فساد میں داخل کرے گا۔ امام کی اسی اہمیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ۔ (بنی اسرائیل ۷۱)
"قیامت کے دن ہم تمام انسانوں کو ان کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔"

(انسان کی عظمت و شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ قیامت کے دن بہترین امام اور پاکیزہ ترین نامہ اعمال کے ساتھ آئے۔ ورنہ وہاں کسی طرح کی رعایت اور طرفداری کا امکان نہیں ہے۔)

ہر دور کے مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے امام زمانہ کو پہچان کر اس کی اطاعت کرے تاکہ امام حق کی پیروی کی وجہ سے انسان حقیقت کو پہچان سکے اور معاشرے میں عدل اجتماعی کو قائم رکھنے کے لئے اپنا کردار ادا کرسکے اور ہر قسم کے انحراف و فساد سے خود بھی محفوظ رہے اور مقدور بھر دوسروں کو بھی انحرافی عمل سے بچائے۔

اگر لوگ الٰہی رہبر کی رہبری سے انحراف کرتے ہوئے اپنے رہبر بنانے لگیں تو معاشرے میں اجتماع کی جگہ افتراق اور اتحاد کی بجائے انتشار پیدا ہوگا اور انسانی معاشرہ جہالت و ضلالت کی لپیٹ میں آجائے گا جس سے بد امنی پیدا ہوگی اور اس کے نتیجے میں طاغوتی حکومت قائم ہوجائے گی۔

اسی حقیقت کو حضرت صدیقہ کبریٰ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے اپنے خطبے فدک میں ان الفاظ سے بیان کیا تھا: وَ اِمَامَتَنَا نِظَامًا لِلْمِلَّةِ۔ "اللہ نے ہماری امامت کو اس لئے فرض کیا تاکہ ملت اسلامیہ میں نظم قائم رہے اور ہماری امامت میں یہ اثر موجود ہے کہ ہماری پیروی سے لوگ افراط و تفریط کی راہوں سے بچ سکتے ہیں اور شیاطین اور ستم گروں کے پھیلائے ہوئے شر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔"[1]

[1] مؤلف نے اس خطبے کی شرح "زندگی راز آفرینش" کے عنوان سے شائع کی ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہر دور میں ایک ہی امام ہونا چاہئے

ایک وقت میں ایک ہی امام ہونا چاہئے۔ اگر اتفاق سے ایک ہی وقت میں دو شخص ہر لحاظ سے رہبری کے قابل ہوں تو بھی ان میں سے ایک کو امام اور دوسرے کو ماموم ہونا چاہئے۔ (جیسا کہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام دونوں ہی مقام عصمت کے حامل تھے اور دونوں انسانی رہبری کے لائق تھے مگر) جب تک امام حسنؑ زندہ رہے اس وقت تک امام حسینؑ ان کے ماموم بن کر رہے۔

امام علی رضا علیہ السلام نے ایک وقت میں ایک ہی امام کا اثبات اس دلیل سے کیا اور فرمایا: "ایک ہی وقت میں دو واجب الاطاعت امام نہیں ہوسکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دو افراد اپنے تمام ارادوں اور افعال میں کبھی بھی یکساں اور مساوی نہیں ہوسکتے۔ اگر امت اسلامیہ کے بیک وقت دو امام ہوں تو ممکن ہے کہ ایک امام ایک چیز کا حکم دے اور دوسرا امام کسی اور چیز کا حکم دے تو امت اسلامیہ کے لئے مشکل پیدا ہو جائے گی کیونکہ اگر وہ ایک کی اطاعت کریں گے تو اس سے دوسرے کی نافرمانی لازم آئے گی اور دونوں اماموں کے اختلاف نظر کی وجہ سے مخلوق اختلاف اور فساد کا نشانہ بنے گی نیز ان میں سے کسی ایک کی مخالفت معصیت کا باعث ہوگی جس کا لازمہ یہ ہوگا کہ دونوں کو مقام امامت سے ہٹا دیا جائے گا۔" (عیون الاخبار الرضا باب ۳۴۔ ص ۱۰۱)

تعیین امام

اس مقام پر ذہنوں میں اس سوال کا ابھرنا لازمی ہے کہ آخر امام کون ہوتا

(گزشتہ سے پیوستہ)
علاوہ ازیں آقای محمد وشتی کی کتاب مصائب زہرا میں اس خطبے پر مناسب بحث کی گئی ہے۔ شائقین مذکورہ کتابوں کی طرف رجوع کریں۔

ہے اور اس کا تقرر کون کرتا ہے؟

قرآن مجید نے امام کو لفظ "اولی الامر" سے تعبیر کیا ہے اور اطاعت رسول کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ولی امر سوائے مقام رسالت کے تمام فضائل اور کمالات میں مانند رسول ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی اطاعت مانند اطاعت رسول واجب ہوتی ہے۔[1]

امام کو اللہ متعین کرتا ہے اور اپنے رسول کے ذریعے سے اس کی امامت کا اعلان کرتا ہے اور اس کے برعکس اگر ہم یہ کہیں کہ مسلمانوں کو اختیار ہے وہ جسے چاہیں اپنا امام مقرر کرلیں تو اس سے چند قباحتیں لازم آئیں گی جن میں سے چند قباحتوں کی طرف ہم اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ اگر مسلمانوں کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ جسے چاہیں اپنا امام مقرر کریں

۱۔ اس مقام پر ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ سورۂ نساء کی آیت ۵۹ میں لفظ "أَطِيعُوا" دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اللہ کی اطاعت کے لئے لفظ "أَطِيعُوا" موجود ہے پھر رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے لئے لفظ "أَطِيعُوا" دوبارہ استعمال ہوا ہے۔

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لئے "أَطِيعُوا" فرمایا مگر اس میں رسول کو شامل نہ کیا اور رسول کے لئے علیحدہ "أَطِيعُوا" فرمایا۔ تو اس میں غالباً حکمت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت میں فرق ہے کیونکہ اللہ کی اطاعت میں سجدہ شامل ہے جبکہ رسول کی اطاعت میں سجدہ شامل نہیں ہے۔ اسی لئے اللہ اور رسول کی اطاعت میں فرق ہے۔ مگر جب اللہ نے رسول کے لئے "أَطِيعُوا" کے لفظ فرمائے تو اس کے ساتھ ہی "أُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ" کے الفاظ ارشاد فرمائے۔ اولی الامر کے لئے لفظ "أَطِيعُوا" کا تکرار نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت ہر لحاظ سے رسول کی اطاعت کی مانند ہے اور اولی الامر وہی ہوسکتا ہے جو رسول کے تمام فضائل و کمالات سے آراستہ ہو اور اس کی اطاعت رسول کی اطاعت کی طرح سے فرض ہے۔ بس اتنا فرق ضرور ہے کہ اولی الامر کو رسول اور نبی نہیں کہا جاسکتا۔

رسول کی اطاعت غیر مشروط طور پر واجب ہے اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ایک کام میں رسول کی اطاعت جائز ہو اور دوسرے کام میں رسول کی اطاعت ناجائز ہو اور ایسا بھی نہیں ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تو سب افراد کا ایک فرد پر اجماع ناممکن ہے۔ اسی لئے مختلف افراد مختلف اشخاص کو اپنا اپنا امام بنالیں گے جس سے معاشرہ تہ وبالا ہو جائے گا۔

۲۔ اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ تمام افراد ایک فرد کو ہی منتخب کریں گے تو ہم یہ کیسے مان لیں کہ ان کا چنا ہوا شخص ہر لحاظ سے امامت و رہبری کے قابل بھی ہے۔ یعنی وہ معاشرے کو بھلائی، راستی اور عدل پر متحرک رکھتا ہے اور خطرات اور دشمنوں سے بچاتا ہے۔ اس کی نسبت وہ معاشرہ جہالت اور ہلاکت کا شکار ہو جاتا ہے جہاں کوئی اندھا اندھوں کی رہنمائی کرے یا کوئی بیمار بیماروں کا طبیب بن جائے۔

۳۔ لوگوں کا منتخب کیا ہوا شرعاً واجب الاطاعت نہیں ہے کیونکہ صرف خداوند عالم انسانوں پر حاکمیت رکھتا ہے کیونکہ وہ ان کا پیدا کرنے والا ہے اور اس نے اپنا یہ حق اپنے رسول اور اولی الامر کو عطا کیا ہے اور ان کی اطاعت کو بغیر کسی شرط مکمل طور پر واجب فرمایا ہے۔ اس لئے اولی الامر مانند رسول ہر گناہ و خطا سے معصوم ہوتا ہے۔ اس کی نسبت جو شخص غیر معصوم ہے اگر اس کی اطاعت مکمل طور پر بغیر کسی قید

(گزشتہ سے پیوستہ)

کہ رسول نماز، روزہ کا حکم دیں تو اطاعت واجب ہو اور اگر اجتماعی معاملات میں حکم دیں تو اطاعت غیر ضروری ہو۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اور اولی الامر کی اطاعت کے لئے ایک ہی مرتبہ لفظ "أَطِيعُوا" ارشاد فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سے رسول کی اطاعت غیر مشروط طور پر واجب ہے اسی طرح سے امام کی اطاعت بھی غیر مشروط طور پر واجب ہے۔

اس آیت مجیدہ کے ضمن میں ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ غیر مشروط اطاعت صرف معصوم کی ممکن ہے غیر معصوم کی غیر مشروط اطاعت حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ. "خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔"

رسول معصوم تھے اسی لئے اللہ نے ان کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا اگر اولی الامر غیر معصوم ہوتے تو اللہ ان کی غیر مشروط اطاعت کا حکم کبھی نہ دیتا۔ (از مترجم)

کے واجب ہوتی تو اس کے گناہ اور خطا کی بھی اطاعت کرنی پڑتی اور خداوند عالم اس سے منزہ ہے کہ ایسا قانون بنائے۔

اسی لئے امام کو ہر زمانے میں تمام لوگوں سے زیادہ عالم ہونا چاہئے اور تمام افراد سے افضل و اکمل ہونا چاہئے اور اسے مقام عصمت پر فائز ہونا چاہئے اور چونکہ ایسی شخصیت کی تشخیص لوگوں کی طاقت سے ماورا ہے اور اس طرح کا دعویٰ کرنے والے بہت سے ہوتے ہیں۔ اگر خداوند عالم کی جانب سے اس کے رسول کے ذریعے (امام کا) تعین نہ ہو تو اس کا فساد آشکار ہو جاتا ہے کیونکہ ہر گروہ خود کو رہبری کا مستحق سمجھتا ہے اور اپنی خواہشات نفسانی کے تحت اپنے مخالفوں اور رقیبوں سے آمادہ بہ جنگ رہتا ہے اور دینی احکام اور قوانین الٰہی جو تمام مسلمانوں کی اصلاح کے لئے بنائے گئے ہیں مکمل طور پر متروک ہو جاتے ہیں اس کے نتیجے میں ظلم و فساد تمام معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔[1]

---

[1] عہدۂ عصمت ایک ایسا عہدہ ہے جس کی لوگوں کو خبر نہیں ہو سکتی۔ کسی کی عصمت کے متعلق بس خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لئے امام کا تقرر از روئے لطف خدا پر واجب ہے اور خدا ہی امام کا تعین کرتا ہے اور اس کا تعارف اپنے رسول کی وساطت سے کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امام اور خلیفہ بنانے کی نسبت اپنی طرف کی ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا. (بقرہ ۱۲۴) "بے شک میں تجھے لوگوں کا امام بنا رہا ہوں۔"

وَ جَعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا. (فرقان ۷۴) "پروردگار! ہمیں متقین کا امام بنا۔"

وَ جَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَا اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عَابِدِیْنَ. (الانبیاء ۷۳) "اور ہم نے انہیں امام بنایا جو ہمارے حکم کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں اور ہم نے ان کی طرف تمام نیکیوں اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ صرف ہمارے ہی عبادت گزار تھے۔"

وَ جَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ. (السجدہ ۲۴) "اور ہم نے ان میں سے امام مقرر کئے جو ہمارے حکم کے ساتھ ہدایت کرتے ہیں جب انہوں نے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اولی الامر بزبان رسول

مدارک قطعی کے مطابق روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ خداوند عالم کی جانب سے پیغمبر اسلامؐ نے "اولی الامر" کا تعارف اپنی زبان سے کرایا تھا اور مسلمان جو اس مسئلہ میں متحیر تھے ان کی مشکل حل کی تھی۔ مذکورہ دسیوں روایات میں سے ہم ایک روایت بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری نے آنحضرتؐ سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بعد ہم پر اولی الامر کی اطاعت واجب کی ہے۔ اولی الامر کون ہیں؟

آنحضرتؐ نے فرمایا: اولی الامر میرے جانشین اور مسلمانوں کے امام ہیں۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

صبر کیا اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔"

وَ نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِیْنَ. (القصص ۵) "اور ہم ارادہ رکھتے ہیں کہ ہم ان لوگوں پر احسان فرمائیں جنہیں زمین پر کمزور بنا دیا گیا اور انہیں امام مقرر کریں اور انہیں وارث بنائیں۔"

جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے امامت کی نسبت اپنی طرف کی اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے خلافت کی نسبت بھی اپنی طرف فرمائی۔ اس مسئلے کیلئے جامع ترین آیت، آیتِ استخلاف ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: وَعَدَاللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ وَلَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. (النور ۵۵) "اللہ نے تم میں سے صاحبان ایمان و عمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائیگا جس طرح پہلے والوں کو بنایا ہے اور ان کیلئے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کیلئے پسندیدہ قرار دیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دیگا وہ سب صرف میری ہی عبادت کرینگے اور کسی طرح کا شرک نہ کریں گے اور جو اس کے بعد کافر ہو جائے تو در حقیقت وہی لوگ فاسق اور بد کردار ہیں۔"

درج بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ: (۱) خلیفہ بنانا اللہ کا کام ہے۔ (۲) خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جو مومن اور صالح ہو۔ (۳) خلیفہ کا تقرر اسی انداز سے ہوگا جیسے کہ پہلے خلفاء (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جن میں سے پہلا علیؑ بن ابی طالبؑ ہے۔ پھر حسنؑ پھر حسینؑ پھر علیؑ بن الحسینؑ پھر محمدؑ بن علیؑ جو باقرؑ کے لقب سے مشہور ہوگا اور تو اس سے ملاقات کرے گا اور جب تیری اس سے ملاقات ہو تو اسے میری طرف سے سلام پہنچانا۔ پھر جعفرؑ بن محمدؑ پھر موسیٰؑ بن جعفرؑ پھر علیؑ بن موسیٰؑ پھر محمدؑ بن علیؑ پھر علیؑ بن محمدؑ پھر حسنؑ بن علیؑ پھر وہ میرا جانشین ہوگا جس کا نام اور کنیت میرے نام اور کنیت کے مطابق ہوگا۔ حسنؑ بن علیؑ کا بیٹا زمین پر خدا کی حجت ہوگا۔ اللہ اس کے ہاتھ پر مشارق و مغارب کو فتح کرے گا اور میرا وہی جانشین ایک طویل غیبت میں چلا جائے گا اور اس کے زمانہ غیبت میں اس کی امامت پر وہی قائم رہیں گے جن کے دل کا اللہ نے ایمان کے لئے امتحان لیا ہوگا۔ (غایۃ المرام بحرانی باب ۱۴۲۔ ص ۷۰۶)

(گزشتہ سے پیوستہ)

کا تقرر ہوا۔ (۴) خلفاء سے دین کو استحکام اور تمکین نصیب ہوگی۔ (واضح رہے کہ اللہ نے دین کو مضبوط کرنے کا اعلان کیا ہے حکومت کو مضبوط کرنے کا اعلان نہیں کیا۔) (۵) خوف کے بعد اللہ انہیں امن دے گا۔ (۶) خلافت کے حقدار صرف وہی افراد ہوں گے جنہوں نے صرف خدا کے سامنے سر جھکایا ہوگا اور شرک کی آلائشوں سے پاک ہوں گے۔ (۷) ایسے خلفاء کا منکر فاسق ہوگا (معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ خلافت دین کا اہم مسئلہ ہے ورنہ اس کے منکر کو فاسق نہ کہا جاتا ہے۔)

اور جب ہم سابقہ خلافتوں پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ امت اسلامیہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تین خلافتوں کا تذکرہ کیا ہے:

۱۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً. (البقرہ ۳۰) "میں ہی زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

۲۔ یَادَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ. (ص ۲۶) "اے داؤدؑ! ہم نے تجھے زمین پر خلیفہ مقرر کیا۔"

۳۔ قَالَ مُوْسٰی لِاَخِیْہِ ھَارُوْنَ اخْلُفْنِیْ .... (الاعراف ۱۴۲) "موسیٰؑ نے اپنے بھائی ہارونؑ سے کہا کہ تو میرا خلیفہ ہو جا۔"

مذکورہ تینوں آیات کے بغور جائزہ لینے سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ خلافت کے اعلان کے دو ہی طریقے ہیں:

۱۔ اللہ تعالیٰ خلیفہ کا خود اعلان کرے جیسا کہ حضرت آدمؑ اور حضرت داؤدؑ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

غیبت امام میں شرعی تکلیف

سوال

امام زمان کے زمانہ غیبت میں ولی امر اور رہبر کی اطاعت باقی ہے اور اگر باقی ہے تو کس کی؟

جواب

ولی امر اور رہبر مسلمین کی اطاعت قیامت تک واجب ہے جس طرح سے اسلام کے احکام قیامت تک واجب ہیں اور غیبت امام زمان میں کوئی بھی حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اسی طرح سے امام مسلمین کی اطاعت بھی قیامت تک منسوخ نہیں ہوگی جو اہم واجبات اسلام میں ہے اور دین کی بقا کا سبب اور کفار و طاغوت کے خطرے سے تمام مسلمانوں کی حفاظت کا باعث ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

کی خلافت کا براہ راست خود اعلان کیا۔

۲۔ اپنے نبی کے ذریعے سے اس کے جانشین کا اعلان کرائے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی زبانی حضرت ہارونؑ کی خلافت کا اعلان کرایا گیا۔

مذکورہ دو طریقوں کے علاوہ تیسرا کوئی طریقہ نہیں ہے اور حضرت علی علیہ السلام کی امامت و ولایت و خلافت کے لئے دونوں طریقوں سے کام لیا گیا:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ. (المائدہ ۵۵) "اے ایمان والو! بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔"

۲۔ حضرت رسول خدا نے تو دعوت ذوالعشیرہ میں ہی فرما دیا تھا: اِنَّ ھٰذَا اَخِیْ وَ وَصِیِّیْ وَ خَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَ اَطِیْعُوْہُ. "یقیناً یہ علی میرا بھائی اور میرا وصی اور تمہارے اندر میرا خلیفہ ہے۔ تم اس کا فرمان سنو اور اس کی اطاعت کرو۔" (از مترجم)

رسول خداؐ پر واجب تھا کہ وہ اپنے جانشین کا اعلان کریں تاکہ مسلمان آپ کے بعد گمراہی سے محفوظ رہیں۔ چنانچہ آنحضرتؐ نے اپنے الٰہی فریضہ پر عمل کیا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کچھ لوگوں نے آپ کے فرمان کو تسلیم کیا کچھ نے نہیں کیا۔

رسول خداؐ کی طرح سے بارہویں امام پر بھی اللہ کی طرف سے یہ شرعی ذمہ واری تھی کہ وہ بھی اپنی غیبت کے زمانہ کے لئے اپنے جانشینوں کا اعلان کریں اور امام زمانہؑ نے اپنے جانشینوں کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: وَ اَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوْا فِيْهَا اِلٰى رُوَاةِ حَدِيْثِنَا. (بحارالانوار ج۸۷۔ ص۳۸۰) "آنے والے حوادث میں ہمارے حدیث کے روایت کرنے والوں کی طرف رجوع کرنا۔"

"حوادث" سے اسلامی معاشرہ کی سیاسی واجتماعی مشکلات اور مسلمانوں پر طاغوتوں کے تسلط کا مقابلہ مراد ہیں ورنہ نماز روزے اور حج و زکوۃ کے مسائل تو بہت پہلے بیان کردیئے گئے تھے اور ان میں کوئی جدت پیدا نہیں ہونی تھی اور مذکورہ مسائل کوئی نئی چیز نہ تھے کہ جنہیں لفظ حوادث سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مستضعفین کی نجات امام زمانہ کے منشور میں شامل ہے

محقق طوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وَجُوْدُهٗ لُطْفٌ وَ تَصَرُّفُهٗ لُطْفٌ اٰخَرُ وَعَدَمُهٗ مِنَّا. "امام زمانہ کا وجود لطف ہے اور ان کا تصرف دوسرا لطف ہے اور ان کی غیبت ہماری طرف سے ہے۔"

مقصد یہ ہے کہ امام زمانہ علیہ السلام کی غیبت کا سبب اور ان کا امور مسلمین میں تصرف نہ فرمانا، یہ سب اس لئے ہے کہ ابھی تمام مسلمان حضرت کی اطاعت پر آمادہ نہیں ہیں اور مستضعفین کو متکبرین اور طاغوت کے شر سے نجات دلانا اور سارے جہان میں عدل عمومی کو قائم کرنا امامؑ کے پروگرام کا اہم حصہ ہے اور اس کے لئے لوگوں کی آمادگی شرط اول ہے اور ابھی تک اس تصرف کی شرائط فراہم نہیں ہوئیں۔

امامؑ کا ایک شرعی فرض ہے کہ وہ زمانہ غیبت کے لئے اپنے جانشینوں کا تعیین فرمائیں خواہ لوگ انہیں تسلیم کریں یا نہ کریں۔ اس سے آپ کا شرعی فریضہ پورا ہو جائے گا۔

امام زمانہؑ نے ۲۶۰ ہجری میں غیبت صغریٰ اختیار کی تھی اور آپ نے ۳۳۴ ہجری تک کے عرصے کے لئے اپنے چار جانشینوں کا تقرر فرمایا تھا جن کے نام یہ ہیں: (۱) عثمان بن سعید۔ (۲) محمد بن عثمان۔ (۳) حسین بن روح۔ (۴) علی بن محمد السمری۔

آپ کی غیبت صغریٰ چوہتر ۷۴ برس تک قائم رہی۔ اس عرصے میں آپ کے نامزد جانشینوں میں سے کوئی نہ کوئی آپ کی نیابت کرتا رہا اور جب آپؑ کی غیبت کبریٰ شروع ہوئی تو آپ نے اپنی نیابت ان علماء کے سپرد فرمائی جن میں مرجعیت کی شرائط موجود ہوں۔ اور اس کے ساتھ فرمایا: وہ ہماری طرف سے تم پر حجت ہیں اور میں اللہ کی طرف سے ان پر حجت ہوں۔

آپ نے مزید فرمایا: ان کی بات کو رد کرنے والا، ہماری بات کو رد کرنے والا ہے اور جس نے ہماری بات کو رد کیا اس نے خدا کے فرمان کو رد کیا اور خدا کے فرمان کو رد کرنے والا حد شرک میں داخل ہو جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں امام زمانہؑ سے یہ الفاظ مروی ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: مَجَارِی الْاُمُوْرِ وَالْاَحْكَامِ عَلٰى اَيْدِى الْعُلَمَآءِ بِاللّٰهِ، اَلْاُمَنَآءِ عَلٰى حَلَالِهٖ وَ حَرَامِهٖ. (بحارالانوار ج۱۰۰۔ ص۸۰) "امور و احکام ان علمائے الٰہی کے ہاتھوں جاری ہوں گے جو حلال و حرام کے لئے اللہ کے امین ہوں گے۔"

مقام رہبریت کے شرائط۔ فقاہت۔ شرط اول

کسی بھی مرجع کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ فقیہ ہو۔ صدر اسلام میں فقیہ

اسے کہا جاتا تھا جو معارف اور عقائد اسلامی کو اچھی طرح سے جانتا ہو اور دل کی گہرائیوں سے اس پر ایمان رکھتا ہو اور اسلامی احکام سے واقف ہو اور ان پر عمل کرتا ہو۔

اسی لئے ولی مسلمین اور مقام رہبریت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس وقت کے دیگر تمام فقہاء سے بڑا فقیہ ہو اور لوگوں سے علم و عمل کے لحاظ سے افضل ہو تاکہ مفضول کی فاضل پر تقدیم لازم نہ آئے۔

مقام رہبریت کے حامل فرد کو معارف و مراتب توحید پر ایسا یقین ہونا چاہیے کہ ہر طرح کے شک اور گمان سے آزاد ہو، روز آخرت پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتا ہو، خدا کے سامنے جوابدہی سے اسے شدید خوف لاحق رہتا ہو اور احکام کی پہچان کے لئے مقام اجتہاد پر فائز ہو اور قوت استنباط سے مالا مال ہو۔

عدالت اور ہوائے نفس کی مخالفت۔ رہبریت کی دوسری شرط

مقام رہبریت کے حامل شخص کو "عادل" ہونا چاہئے اور عادل سے مراد یہ ہے کہ وہ گناہ کبیرہ سے پرہیز کرتا ہو اور گناہ صغیرہ پر اصرار نہ کرتا ہو۔

بعض روایات میں مرجع وقت کے لئے کچھ مخصوص قسم کے گناہوں سے پاک ہونے کو ضروری بتایا گیا ہے۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ روایات میں معصومؑ کی زبانی مرجع وقت کی جو علامات بیان کی گئی ہیں ان میں لفظ "مُخَالِفًا لِهَوَاهُ" کو خصوصی اور جامع حیثیت حاصل ہے۔

"مُخَالِفًا لِهَوَاهُ" مرجع وقت اور رہبر مسلمین کے لئے ضروری ہے کہ وہ خواہشات نفسانی کا مخالف ہو اور اپنی خواہشات کا غلام نہ ہو۔

لہذا مرجع وقت وہی ہو سکتا ہے جو دولت و ثروت اور جاہ و شہرت کا طلبگار نہ ہو۔ اور دوسروں پر تفوق و برتری کا خواہش مند نہ ہو اور اپنے سے وابستہ افراد کو دوسروں پر ترجیح نہ دیتا ہو۔

شیخ انصاری علیہ الرحمہ نے کتاب رسائل کے باب حجیت خبر واحد میں امام حسن عسکریؑ کی یہ حدیث نقل کی آپ نے فرمایا: "ایسے فقیہ جو اپنے سے وابستہ افراد کو اگرچہ وہ اہل تقویٰ بھی کیوں نہ ہوں، دوسروں پر جو کہ اگرچہ اہل تقویٰ نہ بھی ہوں، ترجیح دیتے ہوں تو وہ خواہشات کے پجاری ہیں اور ان کی زبان مسلم معاشرہ کے لئے اتنی ہی نقصاندہ ہے جتنا کہ لشکر یزید حضرت سید الشہداء کے لئے تھا بلکہ ان کا نقصان لشکر یزید سے بھی زیادہ ہے۔"

ایک مسلمان مرجع کو ہمیشہ رضائے الٰہی کا طالب ہونا چاہئے اسے صرف حق کا پیروکار ہونا چاہئے اور خواہشات نفس کی غلامی سے آزاد ہونا چاہئے کیونکہ اگر مرجع تزکیہ نفس سے آراستہ ہوگا تو وہ معاشرہ کی صحیح رہنمائی کرے گا۔ ورنہ معاشرہ کی تباہی کا موجب ثابت ہوگا۔

شرائط رہبریت بزبان علیؑ

مرجع مسلمین کو اخلاق رذیلہ سے پاک اور اخلاق جمیلہ سے آراستہ ہونا چاہئے

امیر المومنین علیہ السلام نے رہبر کی شرائط بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنَّهُ لاَ یَنْبَغِیْ اَنْ یَکُوْنَ الْوَالِیْ عَلَی الْفُرُوْجِ وَ الدِّمَاءِ وَ الْمَغَانِمِ وَ الْاَحْکَامِ وَ اِمَامَةِ الْمُسْلِمِیْنَ الْبَخِیْلُ فَتَکُوْنَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ نَهْمَتُهُ وَلاَ الْجَاهِلُ فَیُضِلَّهُمْ بِجَهْلِهِ وَلاَ الْجَافِیْ فَیَقْطَعَهُمْ بِجَفَائِهِ وَلاَ الْخَائِفُ لِلدُّوَلِ فَیَتَّخِذَ قَوْمًا دُوْنَ قَوْمٍ وَلاَ الْمُرْتَشِیْ فِی الْحُکْمِ فَیَذْهَبَ بِالْحُقُوْقِ وَیَقِفَ بِهَا دُوْنَ الْمَقَاطِعِ وَلاَ الْمُعَطِّلُ لِلسُّنَّةِ فَیُهْلِکَ الْاُمَّةَ. (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۹)

"اے لوگو! تمہیں یہ معلوم ہے کہ ناموس، خون، مال غنیمت، (نفاذ) احکام اور مسلمانوں کی پیشوائی کے لئے کسی طرح مناسب نہیں کہ کوئی بخیل حاکم ہو کیونکہ اس کا دانت مسلمانوں کے مال پر لگا رہے گا اور نہ کوئی جاہل کہ وہ انہیں اپنی جہالت کی

وجہ سے گمراہ کرے گا اور نہ کوئی کج خلق کہ وہ اپنی تند مزاجی سے چرکے لگاتا رہے گا اور نہ کوئی مال و دولت میں بے راہ روی کرنے والا کہ وہ کچھ لوگوں کو دے گا اور کچھ کو محروم کردے گا اور نہ فیصلہ میں رشوت لینے والا کہ وہ دوسروں کے حقوق کو رائیگاں کردے گا اور انہیں انجام تک نہ پہنچائے گا اور نہ کوئی سنت کو بیکار کر دینے والا کہ وہ امت کو تباہ و برباد کردے گا۔"

حضرت نے اپنے ایک خطبہ میں علماء کی یہ ذمہ داری بھی بیان فرمائی کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک پر سکون و قرار سے نہ بیٹھے رہیں۔

چنانچہ نہج البلاغہ کے خطبہ شقشقیہ کے آخری جملے یہی ہیں آپؑ نے فرمایا:

اَمَا وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَاَ النَّسَمَةَ لَوْلاَ حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَقِیَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُوْدِ النَّاصِرِ وَمَا اَخَذَاللّٰهُ عَلَی الْعُلَمَآءِ اَنْ لاَّ یُقَارُّوْا عَلٰی کِظَّةِ ظَالِمٍ وَلاَ سَغَبِ مَظْلُوْمٍ لَاَلْقَیْتُ حَبْلَهَا عَلٰی غَارِبِهَا وَلَسَقَیْتُ اٰخِرَهَا بِکَاْسِ اَوَّلِهَا وَلَاَلْفَیْتُمْ دُنْیَاکُمْ هٰذِهٖ اَزْهَدَ عِنْدِیْ مِنْ عِفْطَةِ عَنْزٍ۔

"اس ذات کی قسم! جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوگئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم سیری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھے رہیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اول کو سیر لب کیا تھا اور تم اپنی دنیا کو میری نظروں میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ ناقابل اعتنا پاتے۔" (نہج البلاغہ خطبہ ۳۔ خطبہ شقشقیہ) ان فقرات سے واضح ہوتا ہے کہ مرجع و رہبر مسلمین کا فریضہ ہے کہ وہ ظالموں کا مقابلہ کرے اور محروموں، مظلوموں اور کمزوروں کی داد رسی کرے۔

تمام علماء کو رہبر کی اتباع کرنی چاہئے

ہماری سابقہ بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ ولایت فقیہ سے مراد امام زمانہ علیہ السلام کے دور غیبت میں جامع الشرائط عالم کو امور مسلمین کا والی اور سرپرست ہونا چاہئے اور علماء و مجتہدین سمیت تمام مسلمانوں پر اس کی اطاعت واجب ہے۔

اگر کوئی مجتہد اپنے آپ کو رہبر سے بڑا عالم سمجھتا ہو اور عبادات میں اپنے فتوٰی پر عمل کرتا ہو تو بھی سیاسی احکام اور رہبر سے متعلقہ امور میں اسے رہبر کی پیروی کرنی چاہئے۔

رہبر کی اطاعت مسلمانوں پر فرض ہے کیونکہ اس سے نظام اسلام کی بقا وابستہ ہے اور مسلمانوں کے اجتماعی امور اور ان کی صلاح و فلاح کا انحصار اسی پر ہے کہ وہ ایک مرکز سے مربوط ہوں اور مضبوط مرکز کی وجہ سے طاغوت کے تسلط سے محفوظ رہیں گے۔

امام علی رضا علیہ السلام نے رہبر کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّ الْخَلْقَ لَمَّا وُقِفُوْا عَلٰی حَدٍّ مَحْدُوْدٍ وَ اُمِرُوْا اَنْ لاَّ یَتَعَدَّوْا ذٰلِكَ الْحَدَّ لِمَا فِیْهِ مِنْ فَسَادِهِمْ لَمْ یَكُنْ یَثْبُتُ ذٰلِكَ وَلاَ یَقُوْمُ اِلاَّ بِاَنْ یُّجْعَلَ عَلَیْهِمْ فِیْهِ اَمِیْنًا یَمْنَعُهُمْ مِنَ التَّعَدِّیْ وَالدُّخُوْلِ فِیْمَا حَظَرَ عَلَیْهِمْ لِاَنَّهٗ لَوْ لَمْ یَكُنْ ذٰلِكَ لَكَانَ اَحَدٌ لاَ یَتْرُكُ لَذَّتَهٗ وَ مَنْفَعَتَهٗ لِفَسَادِ غَیْرِهٖ فَجَعَلَ عَلَیْهِمْ قَیِّمًا یَمْنَعُهُمْ مِنَ الْفَسَادِ وَ یُقِیْمُ فِیْهِمُ الْحُدُوْدَ وَالْاَحْكَامَ۔

وَ مِنْهَا: اِنَّا لاَ نَجِدُ فِرْقَةً مِنَ الْفِرَقِ وَلاَ مِلَّةً مِنَ الْمِلَلِ بَقَوْا وَعَاشُوْا اِلاَّ بِقَیِّمٍ وَرَئِیْسٍ وَ لِمَا لاَ بُدَّ لَهُمْ مِنْهُ فِیْ اَمْرِ الدِّیْنِ وَالدُّنْیَا فَلَمْ یَجُزْ فِیْ حِكْمَةِ الْحَكِیْمِ اَنْ یَّتْرُكَ الْخَلْقَ مِمَّا یَعْلَمُ اَنَّهٗ لاَ بُدَّ لَهٗ مِنْهُ وَلاَ قِوَامَ لَهُمْ اِلاَّ بِهٖ فَیُقَاتِلُوْنَ بِهٖ عَدُوَّهُمْ وَ یَقْسِمُوْنَ فَیْئَهُمْ وَ یُقِیْمُ لَهُمْ جُمُعَتَهُمْ وَ جَمَاعَتَهُمْ وَ یَمْنَعُ ظَالِمَهُمْ مِنْ مَظْلُوْمِهِمْ

وَ مِنْهَا: اِنَّهٗ لَوْلَمْ يُجْعَلْ لَهُمْ اِمَامًا قَيِّمًا اَمِيْنًا حَافِظًا مُسْتَوْدَعًا لَدَرَسَتِ الْمِلَّةُ وَ ذَهَبَ الدِّيْنُ وَغُيِّرَتِ السُّنَنُ وَالْاَحْكَامُ وَلَزَادَ فِيْهِ الْمُبْتَدِعُوْنَ وَ نَقَصَ مِنْهُ الْمُلْحِدُوْنَ وَ شَبَّهُوْا ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ لِاَنَّا وَ جَدْنَا الْخَلْقَ مَنْقُوْصِيْنَ مُحْتَاجِيْنَ غَيْرَ كَامِلِيْنَ مَعَ اخْتِلَافِهِمْ وَ اخْتِلَافِ اَهْوَآئِهِمْ وَ تَشَتُّتِ اَنْحَاءِ هِمْ فَلَوْلَمْ يُجْعَلْ لَهُمْ قَيِّمًا حَافِظًا لِمَا جَآءَ بِهِ الرَّسُوْلُ لَفَسَدُوْا عَلٰى نَحْوِمَا بَيَّنَّا وَغُيِّرَتِ الشَّرَائِعُ وَالسُّنَنُ وَالْاَحْكَامُ وَالْاِيْمَانُ وَكَانَ فِيْ ذٰلِكَ فَسَادُ الْخَلْقِ اَجْمَعِيْنَ. (عیون الاخبار الرضا ج ۲۔ ص ۱۰۰)

(اگر یہ کہا جائے کہ اولی الامر مقرر کرنے اور اس کی اطاعت کا حکم دینے میں کیا مصلحت ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند وجوہات یہ ہیں):

۱۔ اللہ تعالی نے افراد بشر کے حقوق کے تحفظ کے لئے حدود و قوانین مقرر کئے ہیں اور فطری طور پر انسان اپنے مادی حقوق کے لئے ان قوانین پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور اپنی نفسانی لذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ قوانین کے اجراء کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو قانون کی مکمل پاسداری کرے اور قانون شکن افراد پر حد جاری کرے تاکہ قوانین کا نفاذ و اجراء یقینی ہو سکے۔

۲۔ مسلمانوں کے ملک کی بقا اور استحکام ولی مسلمین پر منحصر ہے اگر سربراہ مملکت کا وجود نہ ہو تو دشمن سرزمین اسلام پر قبضہ کرلیں گے اور انہیں اپنا غلام بنالیں گے۔ طاغوتی تسلط سے بچنے کے لئے ولی امر مسلمین کی اشد ضرورت ہے۔

۳۔ نظریہ اسلام کی بقا کیلئے بھی رہبر کا وجود انتہائی ضروری ہے مسلمانوں کو صحیح اسلامی نظریات سے روشناس کرانے کیلئے رہبر کا ہونا ضروری ہے ورنہ بے دین اور ملحد افراد دین کی بنیادی تعلیمات کو مسخ کردیں گے اور مسلمانوں کو گمراہ کریں گے۔

ولی فقیہ سے انحراف کا نتیجہ

واقعی اگر مسلمان رسول اللہ کے بعد حق کے ساتھ ولی امر کی ہر زمانے میں اطاعت کرتے تو کبھی مسلمانوں میں ظلم اور حد سے آگے بڑھنا رواج نہ پاتے اور جب کبھی ایسا ہوتا تو انہیں سزائیں ملتیں اور مظلوم کا حق ظالم سے دلوایا جاتا اور مظلوموں اور محروموں کو ان کا حق مل جاتا اور کبھی طاغوت اور ظالم افراد مسلمانوں پر چیرہ دستی نہ کر پاتے اور ملحدین اور اہل بدعت کی جانب سے ہزاروں انحرافات اسلام میں واقع نہ ہوتے نہ ہی یہ سب اختلافات اور مذہبی جنگیں رونما ہوتیں۔

ولایت فقیہ کے سبب استقلال و آزادی

چودہ صدیوں کے بعد کہ ایران کی مسلمان ملت طاغوتوں کی سلطنت، جنگوں، اختلافات اور انحرافی مکاتب کے ہاتھوں گرفتار تھی اس نے آج کے دور میں ولی فقیہ زمان مرجع تقلید شیعان جہاں، رہبر کبیر انقلاب اور بانیٔ جمہوری اسلامی آیت اللہ العظمٰی حضرت سید روح اللہ الموسوی الخمینی دامت برکاتہ کی پیروی قبول کی اور ان کی خرد مندانہ رہبری، استقامت، پامردی اور مسلمان ملت کی موصوف کی اطاعت کی برکت سے تجاوز کرنے والوں خصوصاً امریکہ کے ہاتھوں کو قطع کردیا اور ڈھائی ہزار سالہ منحوس بادشاہت کا خاتمہ کردیا اور بحمد للہ آج ہمارا ملک مستحکم اور آزاد ہے اور کوئی طاغوتی قوت ہماری ملت پر تسلط نہیں رکھتی۔

صبح ہوگئی اور تم کامیاب ہوگئے

حکومت اسلامی کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں مخالف اسلام قوانین کا درست کرنا کہ پچھلی حکومت اور طاغوتی دور سے باقی ہیں اور غیر صالح افراد جو حکومتی اداروں میں موجود ہیں اور وہ مظالم جو مظلوموں پر ہوئے اور وہ محرومین جن

وَ مِنْهَا: اِنَّهٗ لَوْلَمْ يُجْعَلْ لَهُمْ اِمَامًا قَيِّمًا اَمِيْنًا حَافِظًا مُسْتَوْدَعًا لَدَرَسَتِ الْمِلَّةُ وَ ذَهَبَ الدِّيْنُ وَغُيِّرَتِ السُّنَنُ وَالْاَحْكَامُ وَلَزَادَ فِيْهِ الْمُبْتَدِعُوْنَ وَ نَقَصَ مِنْهُ الْمُلْحِدُوْنَ وَ شَبَّهُوْا ذٰلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ لِاَنَّا وَ جَدْنَا الْخَلْقَ مَنْقُوْصِيْنَ مُحْتَاجِيْنَ غَيْرَ كَامِلِيْنَ مَعَ اخْتِلَافِهِمْ وَ اخْتِلَافِ اَهْوَآئِهِمْ وَ تَشَتُّتِ اَنْحَاءِ هِمْ فَلَوْلَمْ يُجْعَلْ لَهُمْ قَيِّمًا حَافِظًا لِمَا جَآءَ بِهِ الرَّسُوْلُ لَفَسَدُوْا عَلٰى نَحْوِمَا بَيَّنَّا وَغُيِّرَتِ الشَّرَآئِعُ وَالسُّنَنُ وَالْاَحْكَامُ وَالْاِيْمَانُ وَكَانَ فِيْ ذٰلِكَ فَسَادُ الْخَلْقِ اَجْمَعِيْنَ. (عیون الاخبار الرضاج ۲۔ ص ۱۰۰)

(اگر یہ کہا جائے کہ اولی الامر مقرر کرنے اور اس کی اطاعت کا حکم دینے میں کیا مصلحت ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند وجوہات یہ ہیں):

۱۔ اللہ تعالیٰ نے افراد بشر کے حقوق کے تحفظ کے لئے حدود و قوانین مقرر کئے ہیں اور فطری طور پر انسان اپنے مادی حقوق کے لئے ان قوانین پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور اپنی نفسانی لذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ قوانین کے اجراء کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو قانون کی مکمل پاسداری کرے اور قانون شکن افراد پر حد جاری کرے تاکہ قوانین کا نفاذ و اجراء یقینی ہو سکے۔

۲۔ مسلمانوں کے ملک کی بقا اور استحکام ولی مسلمین پر منحصر ہے اگر سربراہ مملکت کا وجود نہ ہو تو دشمن سرزمین اسلام پر قبضہ کرلیں گے اور انہیں اپنا غلام بنالیں گے۔ طاغوتی تسلط سے بچنے کے لئے ولی امر مسلمین کی اشد ضرورت ہے۔

۳۔ نظریہ اسلام کی بقا کیلئے بھی رہبر کا وجود انتہائی ضروری ہے مسلمانوں کو صحیح اسلامی نظریات سے روشناس کرانے کیلئے رہبر کا ہونا ضروری ہے ورنہ بے دین اور ملحد افراد دین کی بنیادی تعلیمات کو مسخ کردیں گے اور مسلمانوں کو گمراہ کریں گے۔

ولی فقیہ سے انحراف کا نتیجہ

واقعی اگر مسلمان رسول اللہ کے بعد حق کے ساتھ ولی امر کی ہر زمانے میں اطاعت کرتے تو کبھی مسلمانوں میں ظلم اور حد سے آگے بڑھنا رواج نہ پاتے اور جب کبھی ایسا ہوتا تو انہیں سزائیں ملتیں اور مظلوم کا حق ظالم سے دلوایا جاتا اور مظلوموں اور محروموں کو ان کا حق مل جاتا اور کبھی طاغوت اور ظالم افراد مسلمانوں پر چیرہ دستی نہ کرپاتے اور ملحدین اور اہل بدعت کی جانب سے ہزاروں انحرافات اسلام میں واقع نہ ہوتے نہ ہی یہ سب اختلافات اور مذہبی جنگیں رونما ہوتیں۔

ولایت فقیہ کے سبب استقلال و آزادی

چودہ صدیوں کے بعد کہ ایران کی مسلمان ملت طاغوتوں کی سلطنت، جنگوں، اختلافات اور انحرافی مکاتب کے ہاتھوں گرفتار تھی اس نے آج کے دور میں ولی فقیہ زمان مرجع تقلید شیعانِ جہاں، رہبر کبیر انقلاب اور بانیٔ جمہوری اسلامی آیت اللہ العظمیٰ حضرت سید روح اللہ الموسوی الخمینی دامت برکاتہ کی پیروی قبول کی اور ان کی خردمندانہ رہبری، استقامت، پامردی اور مسلمان ملت کی موصوف کی اطاعت کی برکت سے تجاوز کرنے والوں خصوصاً امریکہ کے ہاتھوں کو قطع کردیا اور ڈھائی ہزار سالہ منحوس بادشاہت کا خاتمہ کردیا اور بحمد للہ آج ہمارا ملک مستحکم اور آزاد ہے اور کوئی طاغوتی قوت ہماری ملت پر تسلط نہیں رکھتی۔

صبح ہوگئی اور تم کامیاب ہوگئے

حکومت اسلامی کو جو مسائل درپیش ہیں ان میں مخالف اسلام قوانین کا درست کرنا کہ پچھلی حکومت اور طاغوتی دور سے باقی ہیں اور غیر صالح افراد جو حکومتی اداروں میں موجود ہیں اور وہ مظالم جو مظلوموں پر ہوئے اور وہ محرومین جن

کے حقوق ضائع کردیئے گئے۔ البتہ کچھ وقت گزرنے کے بعد ان کی ضرورتیں اور آسائشیں ان کے ملک میں ہی پوری ہوں گی اور سب جانتے ہیں کہ انقلاب کی کامیابی کے روز اول سے امریکہ نے ہمارے ملک میں سازشوں کے جال بچھا رکھے ہیں اور اب ٹھیک ایک سال ہوگیا ہے کہ عراق کی بعثی فوج نے ہمارے ملک پر حملہ کردیا ہے۔[1] اگر خداوند عالم ہمارا مددگار نہ ہوتا اور مسلح مومنین بہادرانہ مقابلہ نہ کرتے تو بعثیوں کے فساد کی بدولت جنگ کے پہلے ہی ہفتے میں انقلاب کو شکست ہو جاتی۔

خلاصہ یہ کہ سلطنت طاغوت جو ظلم کی جڑ تھی نابود ہوچکی ہے دیگر اصلاحات رفتہ رفتہ ہوں گے۔ سب جانتے ہیں کہ ضد اسلامی گروہ (کہ ستر ہزار شہداء اور ایک لاکھ افراد کو اپاہج بنانے کا سبب بنے) چاہتے ہیں کہ امریکی اسلام کا بول بالا کریں اور روحانیت کو کمزور کردیں تاکہ ولایت فقیہ اور ولی امر کی اطاعت سے ملت ہاتھ اٹھالے اور امریکہ کے دوبارہ آنے کی راہ آسان ہو جائے۔ اگر امام امت کی ہوشیاری اور اپنے عہد پر قائم رہنے والی مسلمان ملت نہ ہوتی تو دشمن یہ نتیجہ حاصل کرلیتا۔ خداوند عالم سے دعا ہے کہ امام امت کو طول عمر وعافیت اور توفیق عطافرمائے۔

کیفیت ظہور امام زمان (عج)

سوال

ظہور حضرت مہدی علیہ السلام کی کیفیت بیان کریں اور اس ضمن میں یہ وضاحت کریں کہ امامؑ احکام اسلام میں کوئی تبدیلی لائیں گے یا نہیں؟ روایات میں وارد ہے کہ آپ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ عدل جہانی

[1] یہ تحریر خلیجی جنگ شروع ہونے کے ایک سال بعد لکھی گئی تھی۔

کا نفاذ اختیار بشر سے ہوگا یا اس کی اعجازی کیفیت ہوگی اور انسانوں سے اختیارات سلب کرلئے جائیں؟

عدل جہانی یکدم قائم ہوگا یا تدریجاً قائم ہوگا۔ نیز عدل جہانی سربراہان حکومت کے ذریعے سے قائم ہوگا یا عام انسان بھی اس میں اپنا کردار ادا کریں گے؟

جواب

دین اسلام کی ضروریات میں یہ عقیدہ شامل ہے کہ دین اسلام ہمیشہ رہنے والا دین ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور قرآن مجید کے بعد کوئی کتاب نازل نہ ہوگی۔ پیغمبر اکرمؐ اور ان کے جانشین ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے دین کے تمام احکام بیان کردیئے ہیں اور کوئی موضوع نہیں ہے کہ تاقیام قیامت لوگوں کو پیش آئے مگر یہ کہ اس کا حکم بیان نہ کردیا گیا ہو۔ دین اسلام کے تکامل کے لئے حسب ذیل آیات پر خصوصی توجہ کریں۔

۱۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ. (آل عمران ۸۵) "اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کریگا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور وہ قیامت کے دن خسارہ والوں میں سے ہوگا۔"

۲۔ مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا. (الاحزاب ۴۰) "محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی ایک کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور سلسلہ انبیاء کے خاتم ہیں اور اللہ ہر شے کا خوب جاننے والا ہے۔"

۳۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (المائدہ ۳) "آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کردیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنالیا ہے۔"

سورۃ المائدہ کی یہ آیت پیغمبر خداؐ کی رحلت کے کچھ ہی قبل نازل ہوئی اور بہت سی روایات کے مطابق اس آیت کا نزول غدیر خم میں ہوا۔

احکام اسلامی کی تبدیلی مہدویت کے دعوے کو غلط ثابت کریگی

اگر خدانخواستہ کوئی شخص یہ کہہ کر خروج کرے کہ میں ہی امام زمانہ ہوں اور وہ فتوحات بھی کرے اور اسکے علاوہ بہت سے حیران کن امور بھی بجالائے لیکن اگر وہ اسلامی احکام میں سے کسی حکم کو منسوخ کرنے کا اعلان کرے تو وہ شخص ہرگز مہدیؑ موعود نہیں ہوگا اور اسکا یہ عمل اسکے دعویٰ کے باطل ہونے کی دلیل قرار پائے گا۔

درج بالا آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ دین اسلام آفاقی اور ابدی دین ہے اس کے احکام میں کسی طرح کی ترمیم و تبدیلی جائز نہیں ہے۔ لہذا جب حضرت امام مہدی علیہ السلام ظہور فرمائیں گے تو وہ بھی اسی شریعت اسلامیہ کی پاسداری کریں گے اور احکام اسلام میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں لائیں گے۔ ویسے بھی امام علیہ السلام دین کے مروج ہیں دین کے منسوخ کرنے والے نہیں ہیں۔ آپ موجودہ قرآن مجید کے جملہ احکام پر عمل پیرا ہوں گے اور جو عبادات صدر اسلام سے آج تک جاری ہیں آپ انہی عبادات کو بجالائیں گے اور عہد اور جنگوں کے احکام اس وقت بھی وہی ہوں گے جو آج ہیں۔ آپ قرآنی احکام کے مطابق قصاص اور دیگر معاملات کا اجرا کریں گے اور اسلام کا عظیم فریضہ جہاد جو کہ مدت ہوئی متروک ہوچکا ہے اور ترک جہاد کی وجہ سے مسلمان کافروں، ظالموں اور طاغوتیوں کے ہاتھوں اسیر و ذلیل ہو رہے ہیں۔ بحمد اللہ اس دور میں ملت اسلام ایران نے اس اہم واجب کو انجام دیا ہے۔ طاغوتیوں کی سلطنت کو ختم کردیا ہے اور ستمگر کافروں کے ہاتھوں خصوصاً امریکہ کے ہاتھوں کو کاٹ دیا ہے اور ان کے نمائندہ اور غلام صدام اور بعث پارٹی کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ انقلاب اسلامی ظہور حضرت

مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کے ساتھ متصل ہو جائے گا اور آنجنابؑ کے دور میں جہاد جو عظیم فریضہ اسلامی ہے بطور خاص عمل پذیر ہوگا۔

فروغ عدل اختیاری و تدریجی ہے

امام زمانہ علیہ السلام کے زمانے میں عدل و انصاف کو خوب فروغ ہوگا مگر مذکورہ فروغ اختیاری و تدریجی ہوگا۔ اس مسئلہ کی وضاحت ہم یوں کرسکتے ہیں:

تمام موجودات کی کمال کی طرف حرکت تکوینی و طبیعی ہے۔ یعنی اللہ نے ان کے لئے راہ متعین کردی ہے کہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں بہ طور جبر اپنے کمال کی طرف بڑھیں گے۔ زمین پر پڑا ہوا بیج اُگتا ہے پھر وہ آہستہ آہستہ اپنے کمال کی طرف سفر کرتا ہوا اپنی حد آخر پر پہنچ کر پھل دیتا ہے۔

(حیوانی اور انسانی) نطفہ مختلف مراحل طے کرنے کے بعد زمین پر وارد ہوتا ہے۔ پھر وہ بچپن، لڑکپن، جوانی اور پیری کا سفر طے کرتا ہے۔ اس میں اس کے ارادے و مشیت کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ انسان اپنے جسم کے اعتبار سے جتنے بھی مراحل طے کرتا ہے وہ تکوینی و طبیعی مراحل ہیں اور ان میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں اور اس لحاظ سے تمام موجودات یکساں ہیں۔ لیکن انسان اپنی روحانیت کے اعتبار سے جو سفر کرتا ہے وہ خالص اختیاری ہوتا ہے یعنی انسان کمال و سعادت اور پاکیزہ زندگی حاصل کرنے کے لئے تمام اعتقادی اور عملی طور طریقوں میں عدل سے کام لیتا ہے اور اپنی راہ و روش اور کردار و گفتار میں ان انصاف اور عدل کے قوانین پر عمل کرتا ہے جو اسلام میں تفصیل سے بیان کردیئے گئے ہیں اور وہ کسی طور پر مجبور نہیں ہے کہ چاہے تو عدل کی راہ کو اپنائے اور چاہے تو ظلم و ستم کا رہرو بن جائے۔

خداوند عالم نے یہ ارادہ فرمایا ہے کہ انسان کمال حاصل کرنے کیلئے راہ عدل اپنی مرضی سے اختیار کرے اور آفرینش سے یہ الٰہی سنت جاری ہے جو قیامت تک

تمام ادوار اور زمانوں میں جاری رہے گی جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ولن تجد لسنة الله تبديلا. (احزاب ۶۲) "اور تم ہرگز خدا کی سنت میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔"

مادر پدر آزاد دنیا کس طرح عدل سے پُر ہو سکتی ہے؟

اس مقام پر یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت ستم پیشہ افراد پر مبنی ہے اور اگر کسی ستم رسیدہ کو بھی موقع مل جائے تو وہ بھی ستم پیشہ بن جاتا ہے اور انسانوں کی اکثریت کے اسی کردار کی وجہ سے زمین ظلم سے بھر چکی ہے۔ پھر انسان اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی روش کو رضاکارانہ طور پر کیسے خیرباد کہیں گے؟ اور بالخصوص ممالک کے سربراہ جو کہ تمام مظالم کا سرچشمہ ہیں اور چار پانچ ارب مظلوم انسانوں پر مسلط ہیں، کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے ظلم و ستم سے رضاکارانہ طور پر دستبردار ہو جائیں گے؟

اس کے جواب میں ہم گزارش کریں گے کہ بظاہر اسبابِ مادی اور جنگی سازوسامان کے ساتھ اس زمانے میں ظالم حکومتوں کا مقابلہ کرنا محال نظر آتا ہے لیکن اگر اقوام عالم متفق و متحد ہو جائیں اور ان حکومتوں کے خلاف شورش برپا کر دیں تو ان حکومتوں کے پاؤں اکھڑ جائیں گے جیسا کہ ملت مسلمانان ایران نے پہلوی حکومت کا خاتمہ کیا اور امریکہ کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اس ملک سے کاٹ دیا۔ خلاصہ یہ کہ جب تک اقوام متکبروں اور ظالموں کا خاتمہ نہیں چاہیں گی اور ان پر غلبہ نہیں پائیں گی تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ ظہور حضرت مہدی عجل اللہ فرجہ کیلئے آمادہ نہیں ہیں۔ مگر یہ کہ خداوند تبارک و تعالیٰ کسی اور طرح اپنے ارادے کو پورا کریگا۔

ظہورِ مہدیؑ میں عقلوں کا کامل ہونا

نوعِ بشر میں عدل کا پھیلاؤ ایک دوسرے کی نسبت سے ہے۔ جب ظالم ملت

سے ختم کر دیئے جائیں گے اور ان کی جگہ دانا اور عادل افراد آجائیں گے تو چاروناچار دوسرے افراد بھی عدل پر کاربند ہو جائیں گے اور عدل پھیلانے پر مائل ہوں گے۔ خصوصاً قصاص کے جاری کرنے کے وقت اور حد سے بڑھ جانے والوں کو سزا دیتے وقت اور مظلوم کا حق ظالم سے دلواتے وقت، عدالتِ اجتماعی کے نیک آثار نظر آنے لگیں گے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا فرمان ہے: اِذَا قَامَ قَائِمُنَا وَضَعَ اللّٰهُ يَدَهُ عَلٰى رُؤُوسِ الْعِبَادِ فَجَمَعَ بِهَا عُقُولَهُمْ وَكَمُلَتْ بِهِ اَحْلَامُهُمْ. (اصول کافی ج ا۔ ص ۲۹، کتاب العقل و الجہل حدیث ۲۱) "جب ہمارے قائم کا ظہور ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنے دست شفقت بندوں کے سروں پر رکھے گا جس کی وجہ سے ان کی عقلیں کامل ہو جائیں گی اور ان کی آرزوؤں کی تکمیل ہو جائے گی۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی روحانیت کی برکت کی وجہ سے انسانی معاشرے میں رشد عقلی پیدا ہو جائے گا اور اس عقلی رشد کی وجہ سے شیطانی اور نفسانی راستے، مثلاً دولت کی زیادتی اور اقتدار حاصل کرنا کہ جو دوسروں کے حقوق سلب کرنے کا لازمہ ہوتے ہیں، پہچان لئے جائیں گے اور ان کو چھوڑ دینے کی خواہش پیدا ہوگی اور فساد پر صرف اور صرف اصلاح کو ترجیح دی جائے گی اور نتیجہ میں آنجنابؑ کے ہاتھوں حکومت اسلامی تمام زمین کو اپنی گرفت میں لے لے گی۔

بحث کا خلاصہ

اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ ولایت مسلمانوں کے اجتماعی امور میں امامت و رہبری و حکومت کے معنی میں ہے اور قبول ولایت سے اطاعت مراد ہے۔ یعنی مسلمان اپنے آپ کو امام کے اوامر و نواہی کا پابند بنائیں اور اپنے ذاتی خیالات سے پرہیز کریں۔

جب پیغمبر اسلامؐ نے غدیرِ خم میں امیرالمومنینؑ اور اہلبیت طاہرینؑ کی ولایت کو واجب قرار دیا تھا تو ایک شخص نے یہ دریافت کیا تھا کہ اس ولایت سے کیا مراد ہے؟ تو آنحضرتؐ نے فرمایا تھا: اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيمَا تُحِبُّوْنَ وَتَكْرَهُوْنَ. "ان کے ہر فرمان کو سننا اور اطاعت کرنا واجب ہے خواہ تمہیں پسند ہو یا ناپسند ہو۔"

۲۔ واجب الاطاعت ائمہ بارہ ہیں اور بارہویں امام کی غیبت میں فقیہ جامع الشرائط کی اتباع ضروری ہے اور اس کی اتباع بھی اتباع امام کی طرح سے واجب ہے۔ لیکن یہ وجوب امور مسلمین کی حد تک یکساں ہے۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ جامع الشرائط فقیہ اور امام معصوم ہر لحاظ سے مساوی ہیں۔

امام معصوم امور تکوین میں ولایت کلی الٰہی کا مالک ہوتا ہے اور ائمہ معصومین کا مقام و مرتبہ عام افراد کی سرحد اور اُفق سے بہت بلند و برتر ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق ائمہ معصومین کا مقام انبیائے سابقین سے بھی بلند ہے۔

امام فخرالدین رازی نے آیہ مباہلہ کے ضمن میں لفظ "انفسنا" کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علیؑ نفسِ رسولؐ ہیں اور اس سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح سے رسول خداؐ تمام انبیاء سے افضل ہیں اسی طرح علیؑ بھی نفس رسول ہونے کی وجہ سے تمام انبیاء سے افضل ہیں۔

۳۔ امام عالی مقام کے منشور میں عدل جہانی کا قیام شامل ہے اور ستمگرین کے خاتمہ سے عدل جہانی تدریجی طور پر وجود میں آئے گا اور اس کے مقدمات حضرت کے ظہور سے قبل مکمل ہو جائیں گے اور جب آپ ظہور کریں گے تو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اور ایک ایسا وقت آئے گا کہ تمام اقوام ستمگروں کی اطاعت سے روگردانی اختیار کریں گی جس طرح کہ ایران سے یہ نظریہ بہت سی حکومتوں میں سرائیت کرچکا ہے اور امید ہے کہ انقلاب اسلامی ایران آنجنابؑ کے ظہور کے لئے

ہر اول ثابت ہو گا۔

۴۔ عدل کا پھیلاؤ اس طرح تدریجی ہو گا کہ امام مہدیؑ کے ظہور سے پہلے اس کے مقدمات کے طور پر عوام الناس میں روشن فکری اور بیداری شروع ہو جائے گی اور ظہور کے بعد خدا جس مدت تک چاہے گا اس کا دور دورہ رہے گا۔

۵۔ عدل اجتماعی یعنی تمام امور اجتماعی مثلاً اقتصاد و تعلیم و قضاوت غرض کہ تمام نظام عدل و انصاف پر مبنی ہوں گے۔

عدل شخصی یعنی وہ امور جو افراد کی ذاتی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں جیسے کھانا، پینا، ستر پوشی، رہائش، ازدواج اور انہی کی طرح کے امور جو افراط و تفریط کے بجائے حد اعتدال میں انجام دیئے جائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ہر شخص اپنے ذاتی معاملات میں عدل کی پاسداری کرے گا جو انسانوں کو رشد عقلی اور نور ایمان و ولایت سے بتدریج حاصل ہو گا۔

قطبین میں عبادت کے متعلق سوال نمبر ستاون میں کافی بحث کی جاچکی ہے اور ہم بحث کی تکمیل کیلئے یہاں استاد مکارم شیرازی کا ایک مقالہ نقل کرتے ہیں:

آدھی رات کے سورج سے اسلام کو خطرہ ہے

سوال

اسلام کو تمام جہان کا دین کیسے مان لیا جائے جبکہ اس کے نماز و روزہ جیسے بنیادی احکام ہی پورے جہان کے لئے قابل عمل نہیں ہیں کیونکہ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ قطب شمالی و جنوبی میں چھ ماہ کی رات ہوتی ہے اور چھ ماہ کا دن ہوتا ہے ایسے مقام پر نہ تو روزہ رکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی نماز پنجگانہ ادا کی جاسکتی ہے۔ تو پھر اس

کے باوجود اسلام کو دین جہانی کہنے پر اصرار کیوں کیا جاتا ہے؟

جواب

ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ سوال صرف اسلام کی آفاقیت کو محدود کرنے کی غرض سے اچھالا جاتا ہے اور چند روز قبل ایک معروف رسالے میں اسی سوال کو عجیب آب و تاب کے ساتھ نقل کیا گیا اور اس کی سرخی یہ قائم کی گئی:

"آدھی رات کے سورج نے اسلام کے لئے خطرات پیدا کر دیئے۔"

مذکورہ سرخی کے بعد کالم نگار نے یوں "گوہر فشانی" کی:

"اگر آپ پاک اعتقاد مسلمان ہیں اور آپ اسلام کے فرائض و اعمال کو اہمیت دیتے ہیں تو پھر دعا کریں کہ آپ کو کبھی ماہ رمضان میں فن لینڈ یا قطب کے کسی قریبی ملک میں نہ جانا پڑے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ماہ اگست میں وہاں سورج غروب ہی نہیں ہوتا اور اسی سوال نے ازہر یونیورسٹی کے مذہبی اسکالروں کو پریشان کیا ہوا ہے۔

کچھ مسلمان مختلف وجوہات سے فن لینڈ گئے اور وہاں کی آب و ہوا سے متاثر ہوئے تو بس وہیں کے ہو رہے جبکہ اس ملک میں ماہ اگست میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا اور اگر غروب ہوتا بھی ہے تو صرف اتنی دیر کے لئے ہوتا ہے جس میں ایک شخص اچھی طرح سے کھانا بھی نہیں کھا سکتا۔ اب وہاں کے مسلمانوں کے لئے دو مسئلوں نے پریشانی پیدا کر دی ہے کہ آیا وہ پورا مہینہ روزہ رکھیں اور پورے مہینے تک کچھ نہ کھائیں پیئیں (جو کہ ناممکن ہے) اور اگر وہ روزہ نہ رکھیں تو اپنے ایک مقدس ترین اسلامی فریضہ سے محروم رہتے ہیں۔

چنانچہ فن لینڈ کے مسلمانوں نے (سنی المذہب ہونے کے ناطے) الازہر یونیورسٹی کے علماء سے رابطہ کیا لیکن تاحال وہ جواب سے محروم ہیں۔"

ہماری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ رسالے نے چند سال پہلے بھی انتشار پھیلایا تھا اور اب بھی کبھی کبھی ہم سے یہ سوال کرتا رہتا ہے۔

جواب

ہمارے اس مقالے کی معروضات پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ فن لینڈ کے آدھی رات کے سورج نے اسلام کیلئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کیا اور یہ کہ فن لینڈ میں مقیم مسلمانوں کیلئے لازم نہیں ہے کہ پورے مہینے کا روزہ رکھیں اور اس کے نتیجے میں خودکشی کے مرتکب ہوں اور نہ ہی کوئی ایسی ضرورت ہے کہ وہ روزہ سے محروم رہیں اور ہم یہ تسلیم کرنے پر بھی ہرگز آمادہ نہیں ہیں کہ علمائے اسلام بشمول سنی و شیعہ اس مسئلے کے حل سے عاجز ہیں اور ہم اس مسئلے کو "دشوار اور لاینحل" مسئلہ ماننے پر بھی آمادہ نہیں ہیں بلکہ فقہائے کرام نے آج سے ایک مدت قبل اس مسئلے کا جواب دے دیا تھا لیکن کالم نگار نے کبھی ان کی کتابیں پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور یوں ایک حل شدہ مسئلہ کو "دشوار اور لاینحل" مسئلے کے طور پر اچھالنا شروع کر دیا۔

ہمیں فاضل کالم نگار پر تعجب ہے کہ انہوں نے اس مسئلے کو صرف روزہ کیلئے ہی کیوں مخصوص کر لیا جبکہ اس مسئلے کی زد تو نماز پر بھی پڑتی ہے اور وہ یہ لکھنا کیوں بھول گئے کہ فن لینڈ کے مسلمان پورے مہینے میں صرف پانچ نمازیں پڑھیں اور ہم ڈیڑھ سو نمازیں کیوں پڑھیں؟ نیز فاضل کالم نگار نے نہ جانے قطب شمالی کو کیوں فراموش کر دیا اور یہ کیوں نہ لکھا کہ قطب شمالی میں جہاں چھ ماہ کا دن اور چھ ماہ کی طویل رات ہوتی ہے کیا اس طویل شب و روز میں صرف سترہ رکعت نماز ہی پڑھی جائے؟

البتہ ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس وجہ سے کالم نگار کے پیش نظر فن لینڈ یا دیگر قطبی مناطق کے نصف شب کے آفتاب سے صرف اسلام کو خطرہ لاحق ہوا ہے بلکہ اس نے تو عیسائیوں کے لئے اتوار کی عبادت اور یہودیوں کے لئے ہفتے کی

عبادت کو بھی تو خطرے سے دوچار کردیا ہے۔ (مگر نجانے کالم نگار کو عیسائی اور یہودی یاد کیوں نہ رہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ مضمون نگار صرف اسلام کو ہی تختہء مشق بنانے پر تلے ہوئے ہیں؟)

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ فقہ اسلامی میں بہت مدت قبل اس مسئلے کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا تھا مگر کالم نگار اور ان کے ہم مزاج افراد کتب فقہ کے قریب آنے سے کتراتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ مسئلہ دشوار اور لاینحل ہے جبکہ مرحوم محقق یزدی نے عروۃ الوثقیٰ کے باب سوم مسئلہ ۱۰ میں اس کی مکمل وضاحت کردی ہے۔ ہم اس کے تین نکات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

یہ مسئلہ پورے قطبی ممالک کا ہے

(۱) دن اور رات کا چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہونے کا مسئلہ صرف فن لینڈ اور سکینڈے نیوین ممالک تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ تمام ممالک جو مدار سے ۵/۶۶ درجہ پر واقع ہیں وہاں کم و بیش یہی صورت ہے۔

سادہ الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ۵/۶۶ اور قطب کے ۹۰ درجے کے درمیان کچھ ممالک میں ہمیشہ اور کچھ میں ایک مخصوص مدت کے لئے طویل شب و روز کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور ہم ۵/۶۶ درجے سے جتنا آگے چلتے جائیں تو روز و شب کی طوالت مزید بڑھتی جائے گی۔ مثلاً جب ہم فن لینڈ کے شمالی حصے میں جائیں گے جو کہ ۷۰ درجے عرض شمال پر واقع ہے تو وہاں ایک دن ساٹھ سے بھی کچھ زیادہ دنوں کا ہو جائے گا اور پھر دو ماہ کی طویل رات شروع ہوگی اور جب ہم مدار کے ۷۳ درجے پر پہنچیں گے تو وہاں ایک دن تین ماہ کا ہوگا اور رات بھی تین ماہ کی ہوگی۔

اسی طرح سے ہم جتنا مزید آگے بڑھتے جائیں گے دن رات کی طوالت میں اضافہ ہوتا جائے گا اور جب ہم قطب شمالی پہنچیں گے جو کہ مدار سے پورے ۹۰

درجے پر ہے تو وہاں سال کے ۳۶۵ دنوں کی بجائے ایک دن اور ایک رات نمودار ہونگے۔ یعنی ہمارا مکمل سال وہاں کے ایک دن کے مساوی ہے۔ مگر قطب شمالی کیلئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہاں کا دن اور وہاں کی رات پورے چھ ماہ کی ہوتی ہے۔

قطب شمالی کا دن چھ ماہ اور کئی دنوں کا ہوتا ہے جبکہ وہاں کی رات چھ ماہ سے کچھ دن کم کی ہوتی ہے اور جس وقت قطب شمالی میں دن ہوتا ہے تو اس وقت قطب جنوبی میں رات ہوتی ہے اور جب قطب شمالی میں رات ہوتی ہے تو قطب جنوبی میں دن ہوتا ہے۔

کرۂ ارض کے وہ تمام نقاط جو مدار سے ۵/۶۶ درجہ سے لے کر ۹۰ درجے تک واقع ہیں انہیں قطبی ممالک کہا جاتا ہے۔ قطب جنوبی اور قطب شمالی کے قریب انسانی آبادی انتہائی کم ہے۔ فن لینڈ، سویڈن، ناروے اور روس کے بعض علاقے قطبی حلقے میں واقع ہیں۔

چند سال سے سائنسدانوں کی کچھ جماعتیں سائنسی مطالعہ کے لئے شمالی اور جنوبی قطب پر جانے لگی ہیں اور وہ وہاں چند دن قیام کرتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر اس علاقے میں ایک بھی شخص کیوں نہ رہتا ہو یا مختصر قیام کے لئے وہاں جاتا ہو تو بھی اسلامی قوانین اس پر لاگو ہوتے ہیں کیونکہ اسلام ایک مخصوص خطے کا دین نہیں ہے۔ (اسلامُ خدا کا آفاقی دین ہے اس میں صرف مناطق معتدلہ ہی نہیں بلکہ قطبی ممالک کے افراد کے لئے بھی عبادت کے قوانین موجود ہیں۔)

کرۂ ارض کے وہ نقاط جو مدار سے ۵/۶۶ درجے کی پر واقع ہیں ان میں دن رات کا دورانیہ چوبیس گھنٹے میں مکمل ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ سردیوں میں راتیں طویل اور دن چھوٹے ہوتے ہیں اور گرمیوں میں دن بڑے اور راتیں

چھوٹی ہوتی ہیں اور (ملائیشیا کی طرح سے) استوائی ممالک میں دن رات ہمیشہ بارہ بارہ گھنٹوں کے ہوتے ہیں اور وہاں موسم گرما اور موسم سرما کا کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔

مناطق قطبی میں دوپہر اور نصف شب کی پہچان

(۲) اس مسئلے کے جواب کے لئے جس نکتہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ قطبی مناطق جہاں سورج غروب نہیں کرتا اور اصطلاحی طور پر جسے آدھی رات کے سورج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہاں سورج افق میں ہر وقت گردش کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹوں میں وہ افق کا ایک دورہ مکمل کرلیتا ہے وہاں زمین کی گردش بظاہر محسوس نہیں ہوتی بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سورج چکر لگا رہا ہے۔ اگر آپ فن لینڈ کے اس خطے میں چلے جائیں جہاں ایک ماہ تک سورج غروب نہیں کرتا تو آپ وہاں یہ محسوس کریں گے کہ قرص آفتاب گھڑی کی سوئی کی طرح حرکت کررہا ہے اور چوبیس گھنٹے میں اس کا ایک دورہ مکمل ہو جاتا ہے۔ آپ وہاں دیکھیں گے کہ سورج افق مشرق سے جنوب کی طرف، پھر جنوب سے مغرب کی طرف اور مغرب سے شمال کی طرف پھر شمال سے مشرق کی طرف سفر کررہا ہے۔ مذکورہ خطہ میں مسلسل سورج اگرچہ نگاہوں کے سامنے موجود رہتا ہے مگر ۲۴ گھنٹوں میں اس کا فاصلہ افق سے برابر نہیں رہتا۔ یعنی کبھی زیادہ بلندی پر اور کبھی کم بلندی پر دکھائی دیتا ہے۔ سورج کی حالت کی یہ تبدیلی ۵/ ۲۳ درجہ محور زمینی کے مدار سے انحراف کی وجہ سے دکھائی دیتی ہے اور اس حساب کے لحاظ سے جب سورج اپنے اوج کے آخری نقطہ پر ہوتا ہے تو اسے دوپہر کہا جاتا ہے کیونکہ اس وقت نصف النہار کے دائرے پر دکھائی دیتا ہے۔

اس لحاظ سے جب سورج ارتفاع کے کامل ترین درجے پر دکھائی دے تو وہ دوپہر کا وقت ہوتا ہے اور جب انتہائی دور چلا جائے تو آدھی رات کا وقت متصور ہوتا

ہے اور آدھی رات کے وقت سورج بہت زیادہ دور محسوس ہوتا ہے۔

اس مقام پر ہم یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ چوبیس گھنٹوں میں سورج کی روشنی بھی وہاں برابر اور یکساں نہیں ہوتی بلکہ جب سورج افق مشرق سے سفر کرتا ہے اور روشنی پوری طرح سے پھیل جاتی ہے تو وہاں کی اصطلاح کے مطابق وہ دن ہوتا ہے اور جب سورج افق مغرب کے قریب ہوتا ہے تو وہاں جھٹ پٹے کا سا منظر پیدا ہو جاتا ہے روشنی کم ہو جاتی ہے تو اس وقت کو وہاں کے لوگ رات سے تعبیر کرتے ہیں اس طرح اس منطقہ میں دن رات کی تقسیم ہماری طرح سے نہیں ہوتی مگر ہوتی ضرور ہے۔

ہماری ان معروضات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں دوپہر اور نصف شب کی پہچان انتہائی آسان ہے اور اس کی پہچان کا بالکل سادہ طریقہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی سیدھی لکڑی کو زمین پر نصب کردیا جائے اور اس کے سائے کی کمی بیشی کو دیکھ کر دوپہر اور نصف شب کا تعین کیا جائے۔ یعنی جس وقت اس لکڑی کا سایہ کم سے کم دکھائی دے تو وہ نصف شب ہے۔

ہمارے قارئین اس سوال کا یقیناً حق رکھتے ہیں کہ دوپہر اور نصف شب کی تشخیص وہاں کے دن میں تو ممکن ہے لیکن جب اس منطقہ میں طولانی رات چھائی ہوئی ہو تو اس وقت مذکورہ تشخیص کیسے کی جائے گی؟

ہم اپنے قارئین کو یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں کہ ان مناطق میں ستاروں کی حرکت بھی سورج کی حرکت کی طرح ہے۔ (حالانکہ درحقیقت زمین حرکت کرتی ہے نہ کہ سورج یا ستارے[۱]) وہ بھی گھڑی کی سوئی کی طرح سے چاروں آفاق میں گردش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور سورج کی طرح سے ان کی حرکت

۱۔ البتہ سورج اور ستارے بھی اپنے مدار میں گردش کررہے ہیں۔

بھی یکساں نہیں ہوتی کسی وقت وہ زیادہ قریب محسوس ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ بہت دور محسوس ہوتے ہیں۔ ایسے علاقے میں کسی ایک ستارے کو دیکھ کر فیصلہ کرنا بڑا آسان ہے۔ جب وہ ستارہ زیادہ قریب محسوس ہو تو وہ نصف النہار کا وقت ہوتا ہے اور جب مذکورہ ستارہ بہت زیادہ دور دکھائی دے تو وہ نصف شب کا وقت متصور ہوتا ہے۔

اس مقام پر ہم اپنے قارئین کو یہ بھی بتانا پسند کریں گے کہ جب سورج دکھائی نہیں دیتا تو اس وقت بھی یکساں تاریکی نہیں ہوتی۔ وہاں بعض اوقات جھٹ پٹے کا سا وقت ہوتا ہے اور کبھی مکمل تاریکی چھا جاتی ہے اور جھٹ پٹے کے سے وقت کو وہاں کے رہنے والے دن اور تاریکی کو شب سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مناطق قطبی میں دوپہر اور نصف شب کا وقت قدرت کی طرف سے طے شدہ ہے اور اس کے لئے کسی گھڑی اور ریڈیو کی ضرورت نہیں ہے۔

حد وسط ہی معیار ہے

(۳) مذکورہ سوال کے جواب کے لئے جس آخری نکتہ کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی میں ہر مسئلہ کا حل پہلے سے موجود ہے اور دنیا کا کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا اسلامی فقہ میں حکم مقرر نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی قوانین اتنے جامع ہیں کہ کوئی بھی قضیہ ناقابل حل نہیں ہے اور یہ ایک دعویٰ ہی نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے اور جو شخص بھی فقہ اسلامی سے تھوڑی بہت آشنائی رکھتا ہے اسے بخوبی معلوم ہے کہ فقہ میں موضوعات کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایسے موضوعات جن کیلئے کوئی خاص حکم موجود ہے اور اسلامی مدارک میں اس کا صریحی حکم موجود ہے۔ (علمی اصطلاح کے مطابق جن کیلئے نص موجود ہے)۔

۲۔ ایسے موضوعات جن کے لئے کوئی خاص حکم متعین نہیں کیا گیا اور ان کے

لئے قواعد اور اصول کلی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے حکم کے استنباط کے لئے بنیادی قواعد کا ملاحظہ کرنا ضروری ہے۔

اس کی مزید توضیح یہ ہے کہ اسلام میں قواعد کلی اور اصول اساسی کا ایک سلسلہ موجود ہے اور جو مسائل پہلے سے طے شدہ نہ ہوں تو ایسے مسائل کا حکم معلوم کرنے کے لئے اصول اساسی کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ قواعد و اصول اتنے وسیع ہیں کہ دنیا میں پیش آنے والا ہر مسئلہ کسی نہ کسی طرح سے ان کے ذریعے سے حل ہو سکتا ہے۔

(علمی اصطلاح کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ ان میں حصر کی نوعیت حصر عقلی کی ہے)۔

مناطق قطبی میں رہائش پذیر افراد کی عبادت کا مسئلہ بھی اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے اور ان کے حکم شرعی کو اصول کلی سے مستنبط کرنا بڑا آسان ہے اور ہم اپنے قارئین گرامی پر اصول فقہ کی بھاری بھرکم اصطلاحات کا بوجھ نہیں لادنا چاہتے اور اس کی بجائے سادہ مثال کے ذریعے سے قاعدہ کلیہ کی وضاحت کرنا پسند کرتے ہیں۔

اسلام میں احکام کے تعین کے لئے عمومی وضع قطع کو معیار مانا جاتا ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیں کہ وضو میں چہرہ دھونے کے متعلق یہ حکم ہے کہ چہرے کو طول میں سر کے بال اگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی تک دھویا جائے۔ اب اگر کسی شخص کے سر کے بال عام افراد کے بالوں کے برعکس سر کے پچھلے حصے پر ہی ہوں تو کیا وہ شخص اس حکم کے ذریعے سے پورے چہرے اور سر کے اگلے حصے کو دھوئے گا؟

ایسے شخص کے لئے عام افراد کو معیار تسلیم کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے سر میں سے صرف پیشانی کا اتنا حصہ ہی دھوئے جتنا کہ عام افراد

دھوتے ہیں کیونکہ احکام کے لئے مستثنیٰ افراد کو معیار نہیں بنایا جاتا بلکہ انسانوں کی عمومی اکثریت کو معیار تسلیم کیا جاتا ہے اور اسی طرح جس شخص کے سر کے بال عام انسانوں کی بہ نسبت مختلف ہوں اور اس کی ساری پیشانی پر بال اگے ہوئے ہوں تو ایسے شخص کے لئے چہرہ دھونے کیلئے عمومی افراد کو اپنے لئے معیار تسلیم کرنا ہوگا۔

مزید توضیح کے لئے ہم ایک اور مثال دینا چاہتے ہیں: "کر" کی مقدار یہ ہے کہ اس کی لمبائی ساڑھے تین بالشت، چوڑائی ساڑھے تین بالشت اور گہرائی ساڑھے تین بالشت ہو۔ ایسے گڑھے کو "کر" کہا جاتا ہے۔

اب فرض کریں کہ ایک شخص کا قد و کاٹھ عام افراد کی بہ نسبت زیادہ ہو اور اس کی بالشت عام افراد کی بہ نسبت ڈیڑھ یا دوگنا ہو تو "کر" کی مقدار کے تعین کے لئے اس کی بالشت معتبر نہ ہوگی بلکہ عام افراد کی بالشت معتبر ہوگی۔

(درج بالا مثالوں سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مستثنیٰ افراد حکم اکثریت میں ہوتے ہیں اور ان کے لئے عمومی اکثریت کو ہی میزان و معیار تسلیم کیا جاتا ہے۔)

یہ ایک کلی اور عمومی قانون ہے اور یہ ایک موضوع کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

ہمارے فقہاء نے اسی عمومی قانون سے مناطق قطبی میں رہائش پذیر افراد کیلئے استفادہ کیا ہے اور انہوں نے اپنا فتویٰ دیتے ہوئے فرمایا: مناطق قطبی میں رہائش پذیر افراد اپنی شرعی تکلیف کی ادائیگی کیلئے "مناطق معتدلہ" کو معیار مقرر کریں۔

یعنی ایسے تمام علاقوں میں رہائش پذیر افراد، جہاں دن رات کا تعین عام علاقوں سے مختلف ہے، کو چاہئے کہ اپنے روزہ و نماز کی ادائیگی کے لئے ایسے ممالک کے نظام الاوقات سے استفادہ کریں جہاں دن رات عمومی نوعیت کے ہوں۔

مثلاً ماہ رمضان موسم گرما میں ہو اور عمومی ممالک میں پندرہ گھنٹے کا روزہ ہو

تو قطبی ممالک کے افراد کو بھی پندرہ گھنٹوں کا روزہ رکھنا چاہئے اور اگر ماہ رمضان موسم سرما میں ہو اور عمومی ممالک میں روزہ کا دورانیہ بارہ گھنٹے کا ہو تو ان لوگوں کو بھی بارہ گھنٹوں کا روزہ رکھنا چاہئے اور نماز بھی اسی طریقے سے ادا کرنی چاہئے۔

آپ نے خود ملاحظہ کرلیا ہوگا کہ کالم نگار نے جس مسئلے کو "دشوار اور لاینحل" مسئلہ قرار دیا تھا وہ فقہ کے ایک قاعدے کلیہ سے کس آسانی کے ساتھ حل ہوگیا اور کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔

نتیجہ بحث

ہماری سابقہ بحث سے یہ نکتہ بالکل واضح ہوگیا ہے کہ مناطق قطبی کے رہائشی افراد کو ایک ماہ کے برابر دن کا روزہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس طویل دن میں صرف چند رکعت نماز بھی ان کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ انہیں مناطق معتدلہ کے نظام الاوقات کی پیروی کرنی چاہئے اور اتوار اور پیر اور ماہ و سال کا حساب کرنا چاہئے اور اسی طرح طویل روز و شب کو مناطق معتدلہ کے مطابق مختلف موسموں میں تقسیم کر لینا چاہئے۔

البتہ مذکورہ ممالک میں دوپہر کا تعین انتہائی آسان ہے اور ایک لکڑی نصب کر کے ہی انسان بخوبی دوپہر کی تشخیص کر سکتا ہے اور پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ہے: اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ دَخَلَ وَقْتُ الصَّلَاتَيْنِ. "جب سورج نصف النہار کے دائرہ سے ڈھل جائے تو نماز ظہر و عصر کا وقت داخل ہو جاتا ہے۔"

اسی طرح جب ان ممالک میں سورج بہت زیادہ دور محسوس ہو تو اسے نصف شب سمجھنا چاہئے کہ اس سے آخر وقت مغرب و عشاء کا تعین ہو جاتا ہے[1]

۱۔ البتہ نصف شب کا اس طرح تعین غروب و طلوعِ آفتاب کے اوقات کے درمیان سے ہوتا ہے جبکہ شرعی نصف شب اس سے کچھ قبل شروع ہو جاتی ہے۔

(جب سورج افق شمال کا دورہ مکمل کر کے افق مشرق میں پہنچنے کے قریب ہو تو اس وقت انھیں نماز فجر ادا کرنی چاہیئے) اس بناء پر نماز پنجگانہ کی دو نمازوں کا وقت آغاز اور دوسری نمازوں کا انتہائے وقت بغیر کسی دوسرے ذریعے کے صرف آفتاب کی حرکت سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا روز و شب کا تعین بھی روشنی کی کمی اور زیادتی سے جو سورج کے دور ہونے اور قریب ہونے سے ہوتی ہے، کیا جاسکتا ہے اور اسی طرح طولانی راتوں میں تاریکی کی کمی اور زیادتی روز و شب کی نشاندہی کرتی ہے۔

اسلام اور غلامی

(کتاب ہذا کے مسئلہ ۵۸ کے زیر عنوان اسلام اور غلامی کی مختصر بحث موجود ہے۔ اس موضوع کی تکمیل کے لئے ہم سنی عالم محمد قطب مصری کا مشہور مقالہ نقل کرتے ہیں۔ اس مقالے کو ہم نے ان کی ایک کتاب کے فارسی ترجمہ "کتاب اسلام و نابسامانیهای روشنفکران" سے نقل کیا ہے۔ مقالہ میں ان کا تسنن عیاں ہے۔)

غلامی کا مسئلہ کیمونسٹوں کا بہترین ہتھیار ہے اور اس ہتھیار سے وہ مسلمانوں کی نوجوان نسل کو گمراہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام تمام زمانوں کی ضروریات کے مطابق ہوتا جیسا کہ علمائے اسلام کا دعویٰ ہے تو وہ غلامی کو جائز قرار نہ دیتا اور اسلام کا غلامی کو جائز قرار دینا بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ایک محدود مدت کے لئے نازل ہوا تھا اور اپنا کردار ادا کرنے کے بعد اب وہ تاریخ کے شعبہ آثار قدیمہ کا حصہ بن چکا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جب مسلمان نوجوان ان کیمونسٹوں کی اس طرح کی باتیں سنتے ہیں تو ان کے ذہن میں ایک ہلچل سی پیدا ہوتی ہے کہ آخر اسلام نے غلامی کو سند جواز کیوں عطا کی جبکہ یہ دین اللہ کا نازل کردہ ہے اور اس کی صداقت و صحت میں بھی کوئی شک نہیں اور اسلام انسانیت کی صلاح و فلاح کے لئے نازل ہوا اور زندگی کے تمام ادوار کے لئے بھی سازگار ہے۔ آخر ایسے دین سے تو غلامی کو جائز قرار دینے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعے سے لوگوں کو یہ باور بھی کرایا ہے کہ تمام انسان ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور سب کا باپ ایک ہے اور قوم و قبیلہ رنگ و نسب صرف ذریعہ تعارف ہے اور ذریعہ تعریف نہیں ہے۔ اس کے باوجود اسلام نے غلامی کو اپنے نظام کا ایک حصہ کیوں بنایا اور کیا خدا یہی چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ آقا و غلام اور مالک و مملوک کے دو گروہوں میں بٹے رہیں اور کیا عادل خدا کا ارادہ یہی ہے اور جس خدا نے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ" کہہ کر تکریم آدمیت کا اعلان کیا ہے کیا وہ اس بات پر راضی ہے کہ انسانوں کو پاجولان کر کے بازاروں میں اس کی خرید و فروخت عمل میں لائی جائے اور آخر خدا نے غلامی کو شراب اور زنا کی طرح سے حرام کیوں نہ قرار دیا؟

ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہر مسلمان نوجوان اسلام کی حقانیت پر پورا ایمان رکھتا ہے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح سے اطمینان قلب کا بھی خواہش مند ہے اور اس مسئلہ کی وجہ سے پریشان ہونے والے جوان سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ کیا تم اسلام کی حقانیت پر ایمان نہیں رکھتے؟

تو وہ جواب میں کہتا ہے: کیوں نہیں! میں اول و آخر مسلمان ہوں مگر اپنے دل کی تسکین چاہتا ہوں اور اطمینان قلب کا خواہش مند ہوں۔

عالم اسلام میں جہاں ایسے صالح نوجوان موجود ہیں وہاں ایسے جوان بھی ہیں

(جب سورج افق شمال کا دورہ مکمل کر کے افق مشرق میں پہنچنے کے قریب ہو تو اس وقت انہیں نماز فجر ادا کرنی چاہئے) اس بناء پر نماز پنجگانہ کی دو نمازوں کا وقت آغاز اور دوسری نمازوں کا انتہائے وقت بغیر کسی دوسرے ذریعے کے صرف آفتاب کی حرکت سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا روز و شب کا تعین بھی روشنی کی کمی اور زیادتی سے جو سورج کے دور ہونے اور قریب ہونے سے ہوتی ہے، کیا جاسکتا ہے اور اسی طرح طولانی راتوں میں تاریکی کی کمی اور زیادتی روز و شب کی نشاندہی کرتی ہے۔

اسلام اور غلامی

(کتاب ہذا کے مسئلہ ۵۸ کے زیر عنوان اسلام اور غلامی کی مختصر بحث موجود ہے۔ اس موضوع کی تکمیل کے لئے ہم سنی عالم محمد قطب مصری کا مشہور مقالہ نقل کرتے ہیں۔ اس مقالے کو ہم نے ان کی ایک کتاب کے فارسی ترجمہ "کتاب اسلام و نابسامانیهای روشنفکران" سے نقل کیا ہے۔ مقالہ میں ان کا تسنن عیاں ہے۔)

غلامی کا مسئلہ کیمونسٹوں کا بہترین ہتھیار ہے اور اس ہتھیار سے وہ مسلمانوں کی نوجوان نسل کو گمراہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام تمام زمانوں کی ضروریات کے مطابق ہوتا جیسا کہ علمائے اسلام کا دعویٰ ہے تو وہ غلامی کو جائز قرار نہ دیتا اور اسلام کا غلامی کو جائز قرار دینا بذات خود اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام ایک محدود مدت کے لئے نازل ہوا تھا اور اپنا کردار ادا کرنے کے بعد اب وہ تاریخ کے شعبہ آثار قدیمہ کا حصہ بن چکا ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جب مسلمان نوجوان ان کیمونسٹوں کی اس طرح کی باتیں سنتے ہیں تو ان کے ذہن میں ایک ہلچل سی پیدا ہوتی ہے کہ آخر اسلام نے غلامی کو سند جواز کیوں عطا کی جبکہ یہ دین اللہ کا نازل کردہ ہے اور اس کی صداقت و صحت میں بھی کوئی شک نہیں اور اسلام انسانیت کی صلاح و فلاح کے لئے نازل ہوا اور زندگی کے تمام ادوار کے لئے بھی سازگار ہے۔ آخر ایسے دین سے تو غلامی کو جائز قرار دینے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ اسلام نے اپنی تعلیمات کے ذریعے سے لوگوں کو یہ باور بھی کرایا ہے کہ تمام انسان ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور سب کا باپ ایک ہے اور قوم و قبیلہ رنگ و نسب صرف ذریعہ تعارف ہے اور ذریعہ تعریف نہیں ہے۔ اس کے باوجود اسلام نے غلامی کو اپنے نظام کا ایک حصہ کیوں بنایا اور کیا خدا یہی چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ آقا و غلام اور مالک و مملوک کے دو گروہوں میں بٹے رہیں اور کیا عادل خدا کا ارادہ یہی ہے اور جس خدا نے "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" کہہ کر تکریم آدمیت کا اعلان کیا ہے کیا وہ اس بات پر راضی ہے کہ انسانوں کو پابجولان کر کے بازاروں میں اس کی خرید و فروخت عمل میں لائی جائے اور آخر خدا نے غلامی کو شراب اور زنا کی طرح سے حرام کیوں نہ قرار دیا؟

ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ ہر مسلمان نوجوان اسلام کی حقانیت پر پورا ایمان رکھتا ہے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح سے اطمینان قلب کا بھی خواہش مند ہے اور اس مسئلہ کی وجہ سے پریشان ہونے والے جوان سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ کیا تم اسلام کی حقانیت پر ایمان نہیں رکھتے؟

تو وہ جواب میں کہتا ہے: کیوں نہیں! میں اول و آخر مسلمان ہوں مگر اپنے دل کی تسکین چاہتا ہوں اور اطمینان قلب کا خواہش مند ہوں۔

عالم اسلام میں جہاں ایسے صالح نوجوان موجود ہیں وہاں ایسے جوان بھی ہیں

جن کے عقل اور عقائد کو استعمار نے اپنے مسلسل پروپیگنڈے سے تباہ کردیا ہے۔ تو ایسے افراد کیونکہ ہوا و ہوس کے اسیر ہوتے ہیں اس لئے حقائق آشکار ہوئے بغیر یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ اسلام واقعی فرسودہ نظام ہے جو اپنی طبعی زندگی پوری کرچکا ہے۔ اب اس نظام کی جہان نو میں کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ کیمونسٹ اور بالخصوص کوئی علمی اساس نہ رکھنے والے دن رات لوگوں کو یہ باور کرانے میں مصروف ہیں کہ انہوں نے ایک ایسی حقیقت کا ادراک کرلیا ہے جو کہ تمام حقائق کی بنیاد فراہم کرتی ہے لور یوں وہ تاریخ کو مادیت پرستی کے تحت پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں جن کی ترتیب کچھ یوں ہے:

۱۔ ابتدائی اشتراکیت کا دور
۲۔ غلامی کا دور
۳۔ غلامی و آزادی کا درمیانی دور
۴۔ سرمایہ داری دور
۵۔ اشتراکیت کا دوسرا دور جس کی واضح ترین شکل کیمونزم ہے۔

اس نظام کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ انسانی عقائد و افکار جن سے اب تک انسان آشنا ہوا ہے ہمیشہ اقتصادی حالات کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں لور ہر عقیدہ اور نظام ایک خاص مدت کے لئے ہوتا ہے جب وہ اپنی طبعی زندگی پوری کرلیتا ہے تو دوسرا نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے اور سابقہ نظام تاریخ کے عجائب گھر میں چلا جاتا ہے۔

کیمونسٹ ہمارے نوجوان کے اذہان کو مسموم کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ جس دور میں اسلام طلوع ہوا وہ دور غلامی اور آزادی کا درمیانی دور تھا۔ اسی لئے اسلامی تعلیمات بھی اپنے دور کے عین مطابق تھیں اور اس دور میں اسلام نے بھی

غلامی کو سند جواز دے دی تھی کیونکہ اسلام اپنے اقتصادی حالات سے جنگ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لہذا آج جبکہ دور غلامی دنیا سے حرف غلط کی طرح سے مٹ چکا ہے تو ضرورت ہے کہ اسے سند جواز دینے والے مذہب کو بھی دنیا سے رخصت ہونا چاہئے کیونکہ دور جدید کی انگشتری میں اسلام کا نگینہ فٹ نہیں آتا اور دور جدید کی رہنمائی کے لئے کارل مارکس کی تعلیمات ہی مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

ہم کیمونسٹوں لور ان کے پیروکاروں کے ساتھ فکری جہاد کرنے سے قبل غلامی کے موضوع پر چند معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں لور اس ضمن میں ہم غلامی کی حقیقت لور اس کی تاریخ لور جغرافیائی حدود کا تعین کریں گے لور ہم حقائق کی ترجمانی کے لئے نہ تو کیمونسٹوں سے خوف زدہ ہیں لور نہ ہی ان کے کوچہ گرد پیروکاروں سے ہمیں کوئی خطرہ ہے۔

آج جبکہ ہم بیسویں صدی میں زندگی بسر کررہے ہیں اگر ہم تاریخ کے جھروکوں میں سے جھانک کر ماضی بعید پر نظر ڈالیں تو ہمیں رسن بستہ انسان رومۃ الکبریٰ کے گلی کوچوں میں بکتے ہوئے نظر آئیں گے لور اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھ سکیں گے کہ ان کے مالک ان سے وحشیانہ لور غیر انسانی سلوک روا رکھے ہوئے ہیں لور چشم تاریخ سے یہ خونچکاں منظر دیکھنے کے بعد ہم اپنے مذہب کی طرف ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں لور حیران ہوکر یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے اس ظالمانہ نظام کو باقی کیوں رہنے دیا لور اس غیر انسانی نظام کو جڑ سے اکھاڑ کر کیوں نہ پھینکا جبکہ اسلام کا منشور ہی انسانی آزادی پر مبنی تھا؟

اس وقت ہمارے دل کی گہرائیوں سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے کہ اے کاش اسلام غلامی کو ختم کرکے ہمارے دل کو سکون لور عقل کو مطمئن کرتا۔

جی ہاں! تاریخی حقائق کے سامنے کچھ دیر کے لئے رک جائیے لور غلامی

کے موضوع پر اچھی طرح سے غور کیجئے تو آپ کو اس حقیقت کا جلد ہی ادراک ہو جائے گا کہ رومۃ الکبریٰ کے ایوانوں سے جو احکام غلاموں کے بارے میں جاری ہوئے اور ان احکام کے نتیجے میں غلاموں سے جو وحشیانہ اور غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا تھا اسلام نے اس سلوک کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر ہم سلطنت روما کے دورِ غلامی کا جائزہ لیں اور اسلامی دور میں غلاموں کی زندگی کا جائزہ لیں پھر دونوں ادوار کا باہمی موازنہ کریں تو ہمیں دونوں ادوار میں دن رات کا فرق دکھائی دے گا۔

اگر آپ یہ بھی فرض کرلیں کہ اسلام نے غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے کوئی اقدامات نہیں کیئے اس کے باوجود بھی رومی غلاموں اور مسلم غلاموں میں آپ کو واضح فرق نظر آئے گا۔

سلطنت روما میں غلام کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا اور اسے تمام انسانی حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا اور تمام مشکل کام غلام سے کرائے جاتے تھے۔ آیئے مل کر یہ جائزہ لیں کہ قدر انسانیت سے یہ محروم طبقہ کس وجہ سے اِس پُر فساد مملکت میں لایا جاتا تھا اور اس کی غرض وغایت کیا تھی۔

اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے کہ خونی جنگوں اور "تمدن ساز" رومیوں کی لشکر کشی کی وجہ سے ہزاروں بے گناہ افراد کو پابند سلاسل بناکر ان کے گھر بار سے گرفتار کر کے روم میں لایا جاتا تھا۔

رومیوں کی یہ جنگیں کسی فکری پیش رفت اور آئین نو کے لئے نہ تھیں۔ ان تمام جنگوں کا مقصد صرف یہ تھا کہ رومیوں کی عیش و عشرت قائم و دائم رہے اور ان کے ناز و نعمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ ان کے جسم لباس فاخرہ سے مزین دکھائی دیں اور وہ گرم و سرد حماموں کی لذت سے مستفید ہوتے رہیں۔ سلطنت روما کے وارثوں کے دستر خوان خوش ذائقہ کھانوں سے بھرے رہیں اور رومی شہزادے مختلف قسم کی

شرابوں سے لذت حاصل کرتے رہیں، فسق و فجور میں ڈوبے رہیں، پری پیکر حسیناؤں کے ساتھ داد عیش دیتے رہیں، جشن مناتے رہیں اور اپنی راتوں کو باشکوہ انداز میں گزارتے رہیں۔

اہل روما کی یہ تمام تر آسائش غلاموں کے وجود پر منحصر تھی۔ وہ اپنی وحشیانہ آسائش کے لئے ان بے چاروں کا خون بہا کر لذت حاصل کرتے تھے۔

ہماری گفتگو کی گواہی قدیم مصر سے ملتی ہے جس وقت وہ رومیوں کے تسلط میں تھا اور ابھی اسلام نے اسے گناہگاروں کے چنگل سے آزاد نہیں کرایا تھا۔ اس وقت مصر رومیوں کے لئے ایک زرخیز کھیتی کی طرح تھا کہ جب کبھی ان کی ہوس زور کرتی تھی تو وہ مصریوں کے مال و دولت کو تاراج کردیتے تھے۔ روز اول سے ہی رومی استعمار اس غلیظ شہوترانی کے ساتھ پیدا ہوا تھا اور ان کریہہ آداب و رسوم کا خوگر تھا اور یہ ظاہر ہے کہ غلامی اور منحوس محصولات کا نظام اسی جفاکار استعمار کا جاری کردہ تھا۔ اس طرح غلام اس وحشیانہ سلوک کے ساتھ ایک حقیر مخلوق کی حیثیت رکھتے تھے۔ سلطنت روما کے حکام کو جہاں زندگی کی تمام نعمتیں حاصل تھیں وہاں غلام کو انسانی حقوق تک میسر نہ تھے اور سارا دن وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر صرف معمولی سا لنگوٹ باندھے ہوئے چلچلاتی دھوپ میں کھیتوں میں کام کرتے اور ان کو فرار ہونے سے روکنے کے لئے ان کے پاؤں زنجیروں سے باندھ دیئے جاتے تھے۔ انہیں سارے دن کی محنت کا صلہ قوت لایموت کی صورت میں ملتا تھا۔ انہیں صرف اتنی ہی غذا فراہم کی جاتی جس سے وہ زندہ رہ سکیں اور ان کے کاموں میں جتے رہیں۔

ان کو اس لئے غذا نہیں دی جاتی تھی کہ غذا ان کا حق تھا گویا وہ جانوروں اور جمادات کی طرح تھے جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور کام لیا جاتا ہے۔ ان پر تازیانے برسائے جاتے اس لئے نہیں کہ وہ کسی جرم کے مرتکب ہوتے تھے بلکہ اس لئے کہ

رومی رئیس اور ان کے کارندے اس مخلوق کو صف انسانیت سے خارج تصور کرتے
تھے اور ان کو تکلیف پہنچا کر لذت حاصل کرتے تھے۔

رات کے وقت ان کے سونے کی جگہیں متعفن اور تاریک گڑھے ہوتے
تھے۔ ایسے گڑھے جن میں چوہے اور دیگر حشرات الارض رہتے تھے اور اس سے بڑھ
کر یہ کہ ان گڑھوں میں بھی پچاس پچاس آدمیوں کو ظالمانہ انداز میں زنجیر سے باندھ
دیا جاتا تھا۔ اس طرح کہ دو آدمیوں کے درمیان گائیوں کے دوسروں کے برابر بھی
فاصلہ نہ ہوتا حالانکہ جانوروں کے درمیان بھی اتنا فاصلہ رکھا جاتا ہے بلکہ رومیوں
کے وحشتناک مظالم اس سے بھی زیادہ دل خراش تھے اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے
کہ قدیم روم اور اس کے امراء کی اس وحشتناک روش کو آج جدید یورپ نے اپنالیا
ہے اور رومیوں سے وراثتاً حاصل کرلیا ہے۔ چنانچہ استعمار نے اپنے حق سمجھتے ہوئے
بے وسائل اور کمزور قوموں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

رومیوں کے بے شرمی کے جرائم میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ بے آسرا
غلاموں کو مقابلہ کے میدانوں میں لاتے تھے، ان کے ہاتھوں میں تیز دھار والی
تلواریں اور جگر شگاف نیزے پکڑاتے تھے اور خود ان میدانوں کے اطراف بیٹھ جاتے
تھے۔ اراکین حکومت، صاحبان دولت اور کبھی کبھی خود بادشاہ بھی ان انسانیت سوز
اجتماعات میں شرکت کرتے تھے تاکہ غلاموں کے حقیقی مقابلے کا قریب سے مشاہدہ
کریں اور دیکھیں کہ یہ حقیر مخلوق بغیر کسی حفاظتی لباس کے کس طرح ایک دوسرے
سے جنگ کرتی ہے اور کس طرح شمشیروں اور نیزوں کی ضربات ان کے بدنوں پر
پڑتی ہیں اور کس طرح وہ اس میدان میں مرجانے والوں سے بے پرواہ ہو کر ایک
دوسرے کے جسموں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں۔ بلکہ جب کوئی ایک مقابلے کی
دعوت دینے والا اپنے مخالف پر غالب آتا اور اس کے بے روح جسم کو خون میں

غلطاں کر کے زمین کا پیوند کر دیتا تو تماشائیوں کے انتہائی سرور و انبساط کا باعث ہوتا،
ان کی خوشی کی چیخیں اور تحسین کی آوازیں ہوا میں بلند ہوتیں وہ ان مقابلہ کرنے
والوں کے لئے ہاتھ ہلاتے جو ابھی تک اپنی جانوں سے کھیل رہے ہوتے اور ان کی
تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں فضا کو بھر دیتی تھیں۔

یہ ان غلاموں کی خون رلا دینے والی داستان کی ایک جھلک ہے جو ان دنوں
روم کی سلطنت میں عام تھی اور اس بیان کے بعد ضرورت نہیں ہے کہ قانونی غلامی
کے طریقے اور بردہ فروشی کے متعلق گفتگو کی جائے۔ ان کے مالک ان سے فائدہ
اٹھاتے میں، ان کو تکلیف پہنچانے میں، ان کو قتل کرنے میں آزاد تھے حالانکہ غلام
بیچارہ نہ حق شکایت رکھتا تھا نہ فریاد کرسکتا تھا اور اگر کبھی وہ تکلیف کی شدت سے فریاد
یا شکایت کرتا تو کوئی اس کی فریاد پر کان دھرنے والا نہ ہوتا اور کوئی ایسی جگہ نہیں
تھی جہاں وہ اپنی شکایت پہنچا سکتا۔

تمام ممالک مثل ایران و ہندوستان میں بھی حقوق انسانی کو ضائع کرنے کے
سلسلے میں اور طاقت شکن کام لینے میں غلاموں سے وہی سلوک کیا جاتا تھا جو سلطنت
روم میں رائج تھا اور اس میں چنداں کوئی فرق نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی ان ممالک میں
اس صورتحال میں کمی و زیادتی کا فرق بھی دیکھا جاتا تھا۔ تب اس فساد سے پر اور
تاریک دور میں اسلام آیا۔

اسلام اس لئے آیا کہ انسانیت کو اس بے خود اور حد سے بڑھ جانے والے
انسان سے آزاد کرائے۔ اسلام اس لئے آیا کہ آقا اور غلام دونوں کو یہ بتائے کہ تم
سب ایک ہی جسم کے ٹکڑے ہو۔ اسلام اس لئے آیا کہ آدم فروشوں کو یہ بتائے کہ
جس نے اپنے غلام کو قتل کیا اس کو ہم قصاص میں قتل کردیں گے اور جس نے غلام
کے کسی عضو بدن کو کاٹا تو ہم بھی اس کے عضو بدن کو اس کے جسم سے جدا کردیں

گے۔ اسلام اس لئے آیا کہ انسانوں کو ان کی سرنوشت سے آگاہ کرے اور بلند آواز سے اسلام نے خطاب کر کے کہا: اے بردہ فروشو! اے ناموس انسانیت کے غارتگرو! اے غلامو! اور اے غلامی کی وادیٔ غفلت میں پڑے ہوئے لوگو! تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ اسی تاریک خاک سے پیدا ہوئے تھے۔ اسلام یہ بتانے کے لئے آیا کہ کسی مالک کو اپنے غلام پر مالک ہونے کی وجہ سے کوئی برتری حاصل نہیں ہے۔ برتری کا معیار صرف تقویٰ اور پاکدامنی ہے۔ اسلام اہل جہان کو یہ بتانے کے لئے آیا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ فضیلت کا معیار قوم قبیلہ اور رنگ و نسب نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

اسلام بردہ فروشوں کو یہ پیغام دینے کے لئے آیا: وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَاتُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰی وَ الْيَتٰمٰی وَ الْمَسَاكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالاً فَخُوْرًا. (النساء ۳۶) "اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی شے کو اس کا شریک نہ بناؤ اور والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرو اور قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں، مسکینوں، قریب کے ہمسایہ، دور کے ہمسایہ، پہلو نشین، مسافر غربت زدہ اور اپنے غلاموں اور کنیزوں سب کے ساتھ نیک برتاؤ کرو کہ اللہ مغرور اور متکبر لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اسلام اہل جہان کو یہ بتانے آیا کہ مالک و مملوک کا رشتہ آقا و نوکر کا نہیں اور تحقیر و حقارت پر یہ رشتہ مبنی نہیں ہے بلکہ یہ رشتہ بھائی بندی کا ہے اور اسی لئے مالک و مملوک اور غلام و کنیز اسلام کی نگاہ میں ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور خاندانی وحدت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ غلام و کنیز کی شادی کی اجازت بھی

احتراماً مالک سے حاصل کی جائے کیونکہ وہ باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔

شادی و رشتہ کے متعلق اسلام نے یہ پیغام دیا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلاً اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيَاتِكُمْ الْمُؤْمِنَاتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذَاتِ اَخْدَانٍ .... (النساء ۲۵) "اور جس کے پاس اس قدر مالی وسعت نہیں ہے کہ مومن آزاد عورتوں سے نکاح کرے تو وہ مومنہ کنیز عورت سے عقد کرے۔ خدا تمہارے ایمان سے باخبر ہے تم سب ایک دوسرے کا حصہ ہو۔ ان کنیزوں سے ان کے اہل کی اجازت سے عقد کرو اور انہیں ان کا مناسب مہر دے دو۔ ان کنیزوں سے عقد کرو جو عفیفہ اور پاک دامن ہوں نہ کہ کھلم کھلا زناکار ہوں اور نہ چوری چھپے دوستی کرنے والی ہوں ....."

(یقیناً یہ ترغیب کا بہترین اسلوب ہے کہ صاحب ایمان آزاد و کنیز میں فرق نہیں کرتا اور صرف ایمان پر نگاہ کرتا ہے اور جانتا ہے کہ کنیزیں بھی آدمؑ و حواؑ کی اولاد ہیں اور انہیں بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ از مترجم)

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: مالک و مملوک بھائی ہیں۔

اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا: اپنے زیردست افراد سے برادرانہ سلوک کرو جس کے پاس کوئی زیردست غلام و کنیز موجود ہو تو جو وہ خود کھائے انہیں کھلائے اور جو خود پہنے وہ انہیں بھی پہننے کے لئے دے اور جو کام ان کی استطاعت سے باہر ہو اس کے لئے انہیں مجبور نہ کرے اور مشکل کاموں میں ان کی مدد کرے۔

اس مظلوم طبقہ کی دلجوئی کے لئے پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: کوئی شخص یہ نہ کہے کہ یہ میرا غلام یا کنیز ہے بلکہ یہ کہے کہ یہ میری جوان لڑکی اور جوان لڑکا ہے۔

انہی پاک احساسات نے ابوہریرہ جیسے ایک معمولی انسان کے وجدان کو اس

طرح بُد کر دیا تھا کہ وہ جب کسی مالک کو سواری پر سوار اور غلام کو اس کے پیچھے پیدل چلتے ہوئے دیکھتا تو آواز دے کر کہتا تھا: اسے بھی اپنے ساتھ سوار کرلے کیا وہ تیرا بھائی نہیں اور کیا تیری روح اور اس کی روح میں کوئی فرق ہے؟

غلاموں کے ساتھ اسلام کے حسن سلوک کے سمندر کا یہ ہلکا سانمونہ ہے۔

فصل آئندہ تک پہنچنے سے قبل ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام سے قبل معاشرہ میں غلاموں کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ اسلام کی وجہ سے انہیں صنف بشریت کا فرد شمار کیا جانے لگا۔ اسلام نے یہ بتایا کہ مالک و مملوک کی روح ایک جیسی ہے جبکہ دوسری اقوام و ملل غلام کو مالک کی جنس کا فرد بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھیں اور وہ یہ خیال کرتی تھیں کہ غلام ایک ایسا موجود ہے جسے اس کے آقا کی خدمت اور ذلیل ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس مظلوم طبقہ میں خوئے غلامی پختہ تر کرنے کے لئے انہیں ہر وقت جسمانی اور روحانی اذیتیں دی جاتی تھیں تاکہ ان کے احساس حریت کو مردہ بنادیا جائے۔ (بات بات پر ان کی کوڑوں سے پٹائی کی جاتی تھی اور سزا کے طور پر ان کے اعضاء کاٹ دیئے جاتے تھے، جلتے ہوئے انگاروں سے ان کو داغا جاتا تھا اور بعض اوقات مالک انہیں قتل بھی کر دیتے تھے۔ اس سنگدل معاشرے میں کوئی نہ تھا جو ان کی داد رسی کرتا اور کوئی نہیں تھا جو سنگدل آقاؤں کو رحم کی تلقین کرتا اور کوئی نہ تھا جو انہیں قتل ہونے سے بچاتا۔ غرضیکہ غلام بے چارہ ہر لحاظ سے اپنے آقا کے رحم و کرم پر تھا۔ از مترجم)

اسلام نے اپنی تعلیمات سے اسے حیوانوں سے بدتر مقام سے نکال کر انسانیت کا مقام دیا۔ اسے "اسفل السافلین" سے نکال کر "اعلیٰ علیین" کا مقام دیا۔

ہماری یہ باتیں تصوراتی نہیں ہیں بلکہ ہماری یہ معروضات حقائق پر مبنی ہیں۔ متعصب عیسائی مورخ بھی آج اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ صدر اول میں

اسلام نے غلاموں کو جو عزت و احترام دلایا اس کی کہیں مثال نہیں ملتی تھی اور غلاموں سے اتنا حسن سلوک کا مظاہرہ کیا گیا کہ جب انہیں آقا کی طرف سے آزادی ملتی تو وہ آزاد ہونے پر تیار نہ ہوتے تھے کیونکہ مسلمان غلاموں کو نہ صرف انسان بلکہ انہیں اپنے خاندان کا ایک فرد تصور کرتے تھے۔

اسلام کی شفقت و سرپرستی کی وجہ سے غلاموں نے اپنے آپ کو انسان سمجھنا شروع کیا اور انہوں نے انسانیت کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ اسلامی قانون کے سائے میں انہیں احترام و سعادت نصیب ہوئی اور اسلام نے ان کے حقوق سے تجاوز کرنے کو ممنوع قرار دیا۔

اسلام غلاموں کے لئے کس قدر خیر سگالی اور شفقت کا جذبہ رکھتا ہے اس کا اظہار پیغمبر اسلامؐ کے اس فرمان سے ہوتا ہے کہ آپؐ نے غلامی کی ذلت سے ان کے ذہنوں کو پاک کرنے اور خانوادہ کی محبت قائم کرنے کے لئے یہ حکم دے دیا تھا کہ لوگ اپنے غلاموں کو "یاغلام" کہہ کر صدا نہ دیں اور کسی کنیز کو "یاامه" کہہ کر نہ بلائیں اور انہیں جب بھی صدا دینی مطلوب ہو تو بیٹا یا بیٹی کہہ کر پکارا جائے۔

اس حکم کا مقصد صرف یہی تھا کہ زیردست طبقہ کو شدید ترین احساس کمتری سے نجات عطا کی جائے اور اس کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ نے آقاؤں کو یہ درس دیا: اللہ نے آج تمہیں ان کا مالک و مختار بنایا ہے اگر وہ چاہتا تو تمہیں ان کی غلامی میں دے سکتا تھا۔ لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ غلامی ایک علت خارجی ہے جو انسانی معاشرے پر طاری ہوئی ہے اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ انقلاب زمانہ سے حالات کا رخ بدل جائے اور آقا غلام اور غلام آقا میں بدل جائے۔

پیغمبر اکرمؐ کی ان حکیمانہ تعلیمات کا مسلمانوں پر گہرا اثر ہوا۔ اس سے غلامی کلی طور پر تو ختم نہ ہوئی البتہ آقاؤں کا تکبر ختم ہوگیا، مالکوں کا غرور ٹوٹ گیا، وہ

غلاموں کو اپنی برادری اور خاندان کا ایک فرد سمجھنے لگے اور ان کے تعلقات کی نوعیت آقا و غلام سے بدل کر باپ بیٹے کی سی ہو گئی۔

اسلام نے غلاموں کے جسم و جان کو آقا کے ظلم و ستم سے نجات دلائی۔
اسلام کے روشن ضمیر پیغمبرؐ نے فرمایا: جو اپنے غلام کو قتل کرے گا ہم اسے قتل کریں گے۔

آنحضرتؐ کا یہ حکیمانہ فرمان اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ مالک و مملوک اصول انسانیت میں ہر لحاظ سے مساوی اور یکساں ہیں اور اس گروہ کو اپنے ساتھ شامل کر لینا ان کی زندگی کی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح ان کی تمام زندگی بیمہ شدہ ہو جاتی ہے اس کی نسبت وہ لوگ بھی تھے جو اس قسم کا معمولی سا بھی طور طریقہ نہ رکھتے تھے اور غلاموں کو اصلی صفات بشری سے خارج سمجھتے تھے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اپنے خانوادہ میں شامل کر لینا غلاموں کے لئے پختہ حفاظت کا ضامن تھا اور یہ حق ان کو بے حد عجیب انداز میں ملا تھا کیونکہ اب تک دنیا کے کسی قانون اور نظام میں نہ اسلام سے پہلے اور نہ اسلام کے بعد اس کی کوئی نظیر ہے۔ کیونکہ اس آسمانی قانون میں غلاموں کے لئے تمام انسانی حقوق کی مراعت کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ بغیر تادیب کے ایک تھپڑ مارنا بھی، جو تربیت فرزند کے دائرے سے باہر نہیں ہے، غلام کی آزادی کا باعث ہو جاتا ہے۔

مذکورہ حقائق کے بعد ہم اگلی فصل کے عنوان پر روئے سخن کو موڑنا چاہتے ہیں۔ اسلام نے غلاموں کو ان کی زندگی کا شعور عطا کیا اور خوئے غلامی کی وجہ سے ان کے سوئے ہوئے ضمیر و وجدان کو بیدار کیا اور انہیں یہ بتایا کہ وہ بھی نوع انسانی کے فرد ہیں اور وہ بھی معاشرے میں آبرو مندانہ مقام حاصل کر سکتے ہیں اور آزادی کی نعمت سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں اور انہیں یہ باور کرایا کہ آقا بھی کسی دوسری نوع کا فرد

نہیں، دونوں ایک ہی نوع اور نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلام نے اپنے حکیمانہ احکام سے غلاموں کے لئے آزادی کی منزل کو آسان بنایا اور غلاموں کے لئے جس آزادی کا تصور کرنا بھی دشوار تھا، اسلام نے اسے ان کے لئے سہل بنا دیا۔ پھر اسلام نے غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے اپنے دو قانون پیش کئے جن میں پہلے قانون کو "عتق" اور دوسرے کو "مکاتبت" کہا جاتا ہے۔

قانونِ عتق

قانون عتق سے مراد یہ ہے کہ مالک اپنے غلام کو کسی شرط کے بغیر رضائے خداوندی کے حصول کے لئے آزاد کر دے۔ اسلام نے لوگوں کو غلام آزاد کرنے کی ترغیب دی ہے اور اس کار خیر کی ابتدا پیغمبر اکرمؐ سے ہوئی۔ آپؐ نے اپنے بہت سے غلاموں کو یکبارگی آزاد کر دیا اور یوں آپؐ نے اسلام میں عام معافی کا اجرا کیا۔

آپؐ کے اس عمل کو دیکھ کر صحابہ کرامؓ نے بھی آپؐ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے غلاموں کو آزاد کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی دولت کا ایک خطیر حصہ غلاموں کی آزادی کے لئے وقف کر دیا تھا اور وہ قریش سے ان کے غلام خرید کر کے اللہ کی راہ میں انہیں آزاد کر دیتے تھے اس کے علاوہ صدر اول کے مسلمان حکمرانوں نے بیت المال میں سے ایک رقم غلاموں کو آزادی دلانے کے لئے مختص کر دی تھی۔

یحییٰ بن سعید کا بیان ہے کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ حکومت میں افریقہ کی زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور کیا گیا۔ میں نے افریقہ سے زکوٰۃ جمع کی۔ اس کے بعد میں نے مستحقین زکوٰۃ کو تلاش کیا مگر مجھے پورے افریقہ میں ایک بھی مستحق زکوٰۃ نہ مل سکا۔ پھر میں نے زکوٰۃ کی تمام رقم کو غلاموں کے لئے مخصوص کر دیا اور اس رقم سے میں نے لوگوں سے ان کے غلام خرید کئے اور انہیں اللہ کی راہ میں آزاد کر دیا۔

جنگ بدر کے تعلیم یافتہ قیدیوں سے رسول خداؐ نے یہ شرط رکھی کہ وہ

مسلمانوں کے دس دس افراد کو ابتدائی لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا اور ان سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔

غلامی کی آزادی کے عمل کو مزید وسعت دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے چند گناہوں کے کفارے میں غلام آزاد کرنے کی شرط عائد کی اور پیغمبر اکرمؐ لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ کفارہ مخیّرہ میں غلام کو آزاد کریں۔ اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ انسان اور گناہ کا تعلق بہت قدیم ہے اور گناہوں کے نتیجے میں غلاموں کی آزادی کو یقینی بنایا گیا۔

ہم یہاں ایک کفارہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے قتل خطا (بلا ارادہ قتل) کے کفارے میں دو اقدامات کا حکم دیا ہے اور قرآن مجید کے واضح لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے : وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلاَّ خَطَأً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلاَّ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (النساء ۹۲) "اور جو کسی مومن کو قتل کر دے مگر غلطی سے اور جو غلطی سے قتل کر دے تو اسے چاہئے کہ ایک مومن غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا ادا کرے مگر یہ کہ وہ معاف کر دیں۔ پھر اگر مقتول کا تعلق ایسی قوم سے ہو جو تمہاری دشمن ہو اور قتل ہونے والا مومن ہو تو صرف ایک مومن غلام آزاد کرنا ہوگا اور اگر قتل ہونے والا ایسی قوم کا فرد ہو جس کا تم سے معاہدہ ہے تو اس کے اہل کو خون بہا (دیت) دینا ہوگا اور ایک مومن غلام آزاد کرنا ہوگا اور اگر غلام نہ ملے تو دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا ہوں گے۔ یہی اللہ کی طرف سے توبہ کا راستہ ہے اور اللہ سب کی نیتوں سے باخبر ہے اور

اپنے احکام میں صاحب حکمت ہے۔"

درج بالا قرآنی آیت میں گہرے فکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص غلطی سے کسی شخص کو قتل کرتا ہے تو قرآنی فلسفہ کے مطابق اس سے دو فریق متاثر ہوتے ہیں۔ مقتول کا خاندان اس کے مالی فوائد سے متاثر ہوتا ہے اور معاشرہ ایک انسان کے فقدان سے متاثر ہوتا ہے اور اسلام نے دونوں نقصانات کی تلافی اس طرح سے کی کہ مقتول کے خاندان اور وارثوں کو مقتول کا خون بہا دے کر ان کی مالی محرومیوں کا تدارک کیا اور معاشرے کا تدارک کرنے کے لئے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔ گویا اسلام کی نظر میں غلامی موت ہے اور غلام کو آزاد کرنا اسے زندگی عطا کرنا ہے اور اسلام ایک مردہ شخص کی تلافی کے لئے ایک غلام کو جو درحقیقت مردے کی طرح تھا آزاد کر کے اسے حیاتِ نو بخش کر معاشرے کے حوالے کرتا ہے۔

درج بالا آیت میں آپ نے یہ خدائی حکم پڑھا کہ اگر مقتول کے وارث خون بہا معاف کر دیں تو صرف غلام آزاد کرنے پر اکتفا کیا جائے۔

دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام وارثوں کی اجازت سے خون کی قیمت معاف کرنے پر آمادہ ہے لیکن غلام کی آزادی پر کوئی مصالحت نہیں کرتا اور اسی مسئلے میں قتل خطا کی دوسری شق یہ بیان کی گئی کہ مقتول کا تعلق تمہارے دشمن خاندان سے ہو اور وہ خون بہا لینے پر راضی نہ ہوں تو بھی غلام کو آزاد کیا جائے اور اس میں بھی یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ ایک انسان کے قتل ہونے کی وجہ سے معاشرے کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کی بس یہی صورت ہے کہ دوسرے مردہ یعنی غلام کو آزاد کر کے زندگی بخشی جائے۔

آیت بالا کی تیسری شق میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر مقتول کا تعلق ذمّی افراد سے ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے اور غلام آزاد کیا جائے اور غلام میسر نہ

آنے کی صورت میں دو ماہ مسلسل روزہ رکھا جائے۔[1]

مذکورہ بالا قتل خطا کی تینوں شقوں میں غلام آزاد کرنے کا حکم موجود ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام کے اس خردمندانہ اعلان سے بہت سے غلاموں کو آزادی کی دولت حاصل ہوئی جس کی نظیر تمام اقوام کی تاریخ میں نہ اسلام سے پہلے تھی اور نہ بعد میں نظر آئی۔ جیسا کہ تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ اس قیدی گروہ کی آزادی فقط انسانی بھلائی کے لحاظ سے تھی جو مسلمانوں کے پاک ضمیر کے سرچشمہ سے ہوئی تھی اور اس کا ہدف و منشاء صرف خدا کی خوشنودی تھا اور کچھ نہیں۔

قانون مکاتبت

مکاتبت مالک و مملوک کے درمیان پائی جانے والی قرارداد کو کہا جاتا ہے جب کوئی غلام یہ چاہے کہ اسے آزادی ملنی چاہئے تو وہ اپنے مالک سے یہ شرط طے کر سکتا ہے کہ وہ اسے آزادی دے اور آزادی کے بدلے میں وہ مالک کو ایک مخصوص رقم ادا کرے گا اس رقم کی کوئی مقدار معین نہیں ہے۔ جس مقدار پر دونوں فریق مصالحت کرلیں غلام کو وہی رقم ادا کرنی پڑے گی۔

مذکورہ رقم حاصل کرنے کے بعد مالک کو غلام پر کسی قسم کے تصرف کا حق نہیں رہتا اور اسے فوراً آزادی دینی ضروری ہے۔ اگر کوئی مالک رقم لینے کے بعد بھی

---

[1] اسی طرح سے اسلام نے قسم توڑنے کے کفارے میں غلام کی آزادی کی شرط رکھی اور روزہ توڑنے کے کفارہ میں بھی غلام کی آزادی کی شرط رکھی گئی اور مصارف زکوٰۃ میں سے ایک مصرف غلاموں کی آزادی کو قرار دیا اور اس طرح سے ہزاروں غلاموں کو قید غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔ اسلام کے عظیم القدر پیغمبرؐ نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ غلام کی آزادی اس غلام کی آزادی ہی نہیں بلکہ آزاد کرنے والے کو دوزخ کے عذاب سے بھی آزادی نصیب ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان نے مسلمانوں کے دلوں میں گہرا اثر کیا اور اس سے غلاموں کے لئے آزادی کا دروازہ کھل گیا۔ (از مترجم)

غلام آزاد کرنے میں پس و پیش کرے تو غلام کو حق حاصل ہے کہ وہ قاضی کی عدالت سے رجوع کرے، اور قاضی کا بھی شرعی فرض ہے کہ وہ غلام کو فوراً آزاد کردے۔

اور یہ عاقلانہ قانون بھی اسلام میں اس لئے متعارف کرایا گیا کہ جو شخص اتفاق سے غلام بن جائے تو وہ بے چارہ اس انتظار میں نہ بیٹھا رہے کہ کب مالک سے قتل خطا سرزد ہوتا ہے یا کب وہ روزہ توڑتا ہے یا کب وہ قسم توڑتا ہے اور اس کے صلے میں اسے آزادی ملتی ہے کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مذکورہ چیزوں میں سے کوئی بھی امر وقوع پذیر نہ ہو اور یوں بے چارہ غلام بے بسی کی زندگی بسر کرتا رہے۔ اسی طرح سے یہ بھی ممکن ہے کہ مالک اپنے بخل کی وجہ سے رضاکارانہ طور پر اسے آزادی دینا پسند نہ کرتا ہو۔ دوسری طرف ان حالات میں حکومت اسلامی نے کوئی خلل مالک کے آرام میں ڈالنا نہیں چاہا ہے بلکہ جیسے ہی مالک و مملوک میں معاہدہ طے پاجائے گا اس کے بعد اگر غلام اپنے مالک کے پاس کام کرنا چاہے تو وہ اجرت کا حقدار ہوگا اور اگر وہ محسوس کرے کہ اس کا مالک اسے کم اجرت دے رہا ہے تو وہ کسی اور جگہ اچھی اجرت پر کام کرنے کا مجاز ہوگا اور جیسے ہی وہ معاہدہ کے مطابق رقم ادا کردے گا وہ اسی وقت آزاد ہوجائے گا۔

گو یہ درست ہے کہ غلامی کے خلاف قانون یورپ میں چودھویں صدی میں سامنے آیا یعنی اسلام کی طرف سے جاری کردہ قانون کے سات صدی بعد لیکن ایک بڑے فرق کے ساتھ جس کا اسلام کے علاوہ کہیں وجود نہیں اور وہ یہ تھا کہ آزادی دینے والوں کی توجہ فقط رضا اور تقرب خدا کی طرف مبذول کرائی گئی تھی۔

جیسا کہ ابھی ہم نے اشارہ کیا کہ قرآن مجید نے اسلامی حکومت کو بھی اس امر کا پابند بنایا ہے کہ وہ بیت المال کے زکوٰۃ فنڈ سے غلاموں کو آزادی دلائے۔ اور اس میں حکمت یہ ہے کہ کسی غلام کو مالک کے کسی گناہ کے کفارے میں اگر آزادی نہ مل

سکے اور وہ خود اپنی قیمت ادا کرنے سے بھی قاصر ہو تو اس وقت اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ مداخلت کرے اور زکوٰۃ فنڈ سے رقم ادا کر کے اسے آزادی دلائے۔

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (التوبہ ۶۰) "صدقات (و زکوٰۃ) بس فقراء و مساکین اور عاملین زکوٰۃ اور جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، اور غلاموں کو آزادی دلانے اور قرضداروں کا قرض اتارنے اور راہ خدا اور غربت زدہ مسافروں کے لئے ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے اور اللہ خوب جاننے والا اور حکمت والا ہے۔"

اسلام نے عتق اور مکاتبت کے حکیمانہ قانون کے ذریعے سے غلاموں کی آزادی کے لئے بڑی خدمات سرانجام دیں اور (دور جدید کے "بقراطوں" کو اس سے اختلاف ہو تو کم از کم انہیں یہ تو تسلیم کرنا چاہئے کہ) غلاموں کو آزادی دلانے میں اسلام یورپ سے سات سو سال آگے ہے۔ نیز اس کی کفالت اور حمایت کی بدولت غلام حکومت کے عہدوں تک پہنچے [1]۔

---

[1] واضح ترین لفظوں میں ہم اگر یہ کہیں تو حق بجانب ہوں گے کہ اسلام میں غلامی کو جواز، مالک کے مفادات کے لئے نہیں دیا گیا بلکہ مالک سے زیادہ مملوک کو شرف انسانیت سکھانے کے لئے دیا گیا اور اس غلامی کو باقی رکھنے میں یہ حکمت کارفرما تھی کہ ایک وحشی انسان کی صحیح تربیت کر کے اور اسے مفید شہری بناکر معاشرے کے حوالے کیا جائے۔

اسلام ہر کمزور اور زیردست طبقے کے لئے شفقت و محبت کے جذبات رکھتا ہے۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں میں ایک سورۃ بلد بھی ہے۔ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی بخیل کیوں نہ ہو پھر بھی اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ دولت خرچ ضرور کرتا ہے اور کوئی شخص خواہ کتنی بھی دولت خرچ کیوں نہ کرے وہ قیامت کی گھاٹیوں کو پار نہیں کر سکتا البتہ اگر وہ قیامت کی دشوار گزار گھاٹی کو پار کرنے کا خواہش مند ہو تو اسے درج ذیل کام کرنے چاہئیں:

فَلاَ اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرَاكَ مَاالْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعَامٌ فِيْ يَوْمٍ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی پرورش بیت المال سے ہوتی تھی جب کہ دنیا نے ان عوامل کی فضیلت کو اب آکر پایا ہے اور اسی طرح دیگر سودمند عوامل نے ان حکیمانہ اقدام سے افزائش پائی ہے جبکہ دنیا اب تک ان سے بے خبر ہے۔ جن کے نتیجے میں غلاموں نے اپنی شخصیت کو پہچانا اور اپنے مالکوں کے ہاتھوں آزاد ہو کر انسانی معاشرہ میں جگہ پائی بغیر اس کے کہ اس مقصد کو پانے میں کسی اقتصادی بحران یا سیاسی فشار کا سامنا ہوتا۔ جیسا کہ مغربی دنیا کو غلامی کو ممنوع قرار دینے اور غلاموں کو آزاد کرنے میں ان مشکلات کا سامنا ہوا اور ان دو حکیمانہ قوانین کے منظور کرنے اور اجراء کرنے سے کمیونسٹ یاوہ گویوں کے منہ پر سخت طمانچہ پڑا اور اس فلسفہ مادی کے ماننے والوں کے تمام دعوے باطل ٹھہرے۔

تمام بیہودہ گوئی کرنے والے جو اب تک ہم خیال ہیں کہتے ہیں کہ اسلام اقتصادی حوالوں سے جبر کا حامل ہے جس کے نتیجے میں طبیعی طور پر مادیت وجود میں آتی ہے۔

اسی طرح رسوا لوگ اب بھی گمان کرتے ہیں کہ ہر نظام حتیٰ کہ اسلام اقتصادی تبدیلیوں کے ایک رشتہ سے اپنے زمانہ میں منعکس ہوتا ہے اور ہر نظام کے افکار و عقائد کا کلیہ اقتصادی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے کو سازگار کرلیتا ہے۔

ہاں وہ کہتے ہیں کہ کوئی نظام یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اقتصادی تبدیلیوں پر

(گزشتہ سے پیوستہ)

ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَامَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَامَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اُولٰئِكَ اَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ۔ (البلد ۱۱ تا ۱۸) "پھر وہ گھاٹی پر سے کیوں نہ گزرا اور تم کیا جانو یہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی گردن کا آزاد کرانا، یا بھوک کے دن میں کھانا کھلانا، کسی قرابت دار یتیم کو، یا خاکسار مسکین کو، پھر... ان لوگوں میں شامل ہو جاتا جو ایمان لائے اور انہوں نے صبر اور مرحمت کی ایک دوسرے کو نصیحت کی۔ (از مترجم)

سبقت لے جائے (اور ان سے اثر پذیر نہ ہو) اس گروہ کی دلیل یہ ہے کہ "کارل مارکس" ہمارے خوش نام رہبر نے جسکی عقل غلطی نہیں کر سکتی ہم سے ایسا ہی کہا ہے۔

حالانکہ اسلام اور اس کی تاریخ یہ رہی ہے کہ وہ ہرگز اپنے زمانے کے اقتصادی نظام سے آلودہ نہیں ہوا ہے، نہ جزیرہ عرب میں، نہ تمام نقاط عالم میں، نہ غلاموں کی زندگی میں اور نہ دولت لٹانے میں، نہ حاکم و محکوم کے روابط میں نہ مزدور اور آجر کے تعلقات میں، بلکہ اسلام نے اپنے نظام اقتصادی و اجتماعی کو بغیر کسی اقتصادی بحران کے کمال دور اندیشی سے بنایا ہے اور اب بھی اس کے اکثر قوانین تاریخی حیثیت کے حامل اور بے مثال ہیں۔ مثلاً اسلام نے "غلامی ختم" کے فلسفے کی پیدائش سے سات صدیاں قبل اپنا وظیفہ انجام دیا تھا جس کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔

ایک سوال

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو ہمیشہ افکار و وجدان بشر کو حیران کرتا ہے اور وہ یہ کہ جب اسلام زیردست طبقہ کے لئے رحم کے اتنے جذبات رکھتا ہے اور وہ غلاموں کو آزادی دینے کا بھی شدید خواہش مند ہے تو آخر اس نے واضح الفاظ میں غلامی کو حرام کیوں نہ قرار دیا کہ ایسا قدم اٹھانے سے عالم انسانیت کی ایک بے مثال خدمت انجام دی جاسکتی تھی اور اس طرح خود کو دنیاوی نظاموں میں کامل ترین نظام کے طور پر منوالیا جاسکتا تھا اور پھر کسی کو اس سلسلے میں گفتگو کی جرأت نہ ہوتی۔

واقعاً بجا اور شائستہ ہوتا اگر خدا جو فرزندان آدم کو محترم قرار دیتا ہے اور اپنی تمام مخلوقات میں انہیں مقدم شمار کرتا ہے۔ ایسا حکم صادر فرما دیتا۔

ہم قبل اس کے کہ خود کو اس سوال کا جواب دینے پر آمادہ کریں بہتر ہے کہ ان معاشرتی اور سیاسی حقیقتوں کو آشکار کریں جو غلامی کے موضوع کا احاطہ کئے

ہوئے تھیں اور اس حکم کی تاخیر کا باعث ہوئیں۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ غلامی کا خاتمہ جو اسلام کا حقیقی مقصود تھا، بعض رعایتوں کی رو سے واقعاً دیر میں وقوع پذیر ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام معاشرتی طور طریقوں کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے اس طرح غلط کار گروہ کی کج رفتاری اور ہوائے نفسانی اس کی ترقی میں رکاوٹ نہ بن سکیں۔ آخرکار یہ انتظار اختتام کو پہنچا اور "غلامی ختم" کا حکم دنیا میں جاری ہوگیا۔

اس حقیقت کے اعتراف کے بعد سب سے پہلے ضروری ہے کہ جواب میں ہم عرض کریں کہ :

۱۔ جس زمانے میں اسلام طلوع ہوا اس زمانے میں غلامی کو عیب ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس وقت نہ صرف عرب معاشرہ بلکہ رومی و ایرانی و ہندوستانی معاشروں میں بھی غلامی کا رواج موجود تھا بلکہ یہ اقتصادی اور معاشرتی ضرورت سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس ذریعے سے خصوصی فائدے اور بڑے اجتماعی اور سیاسی عوامل تک رسائی ہوتی تھی اور کسی کی نظر میں غلاموں کا کاروبار کرنا شرمناک نہیں تھا نہ کبھی کسی نے یہ سوچا تھا کہ ممکن ہے کہ کسی روز یہ منحوس نظام تبدیل ہوجائے۔ غرض کہ ہر جہت سے اس کو غلط قرار دینا یا اس میں تبدیلی لانا ایک طویل عرصے اور تدریجی عمل کا محتاج تھا۔

حالانکہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ شراب نوشی ایک ذاتی اور فردی کام تھا لیکن اس کو حرام قرار دینے میں چند سال گزارے گئے۔ ہاں اگرچہ شراب عام اجتماعات میں خودنمائی کے ایک طریقہ کے طور پر رائج تھی لیکن جاہلیت کے دور میں بھی بعض عرب نہ صرف شراب خوری سے بچتے تھے بلکہ اسے وجہ فساد گردانتے تھے اور اسے باعزت لوگوں کے شایان شان نہیں سمجھتے تھے پھر بھی اس کو کافی عرصے کے بعد حرام قرار دیا گیا۔

اس زمانے میں غلامی معاشرے اور فکر انسانی کی گہرائیوں میں ہر چیز سے زیادہ مضبوطی سے جڑ پکڑ چکی تھی۔ یہاں تک کہ کوئی اسے شرمناک نہیں سمجھتا تھا

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا اور ہر جہت سے غلامی کو ممنوع قرار دینے کے لئے پیغمبر اسلام کو جس وقت کی ضرورت تھی وہ میسر نہ تھا اس لئے کہ آپ کی زندگی مختصر تھی جو وحی کی ترتیب میں گزر رہی تھی اور آنجنابؐ ہمیشہ قوانین کی تنظیم اور احکام کی تشریح میں مشغول رہتے تھے اور فرصت کے لمحات آپ کو میسر نہ تھے۔

دوسری طرف خدائے قوی اپنی مخلوقات سے زیادہ واقف ہے اور ان کی بھلائی کو بہتر جانتا ہے۔ اگر وہ جانتا کہ شراب کو حرام قرار دینے کے لئے ایک حکم کافی ہے تو یقیناً جلد از جلد اسے جاری کرتا اور چند سال تک نہ رکتا۔ اسی طرح پروردگار مہربان اگر جانتا کہ غلامی کی ممانعت کے لئے ایک حکم کافی ہے تو ہرگز اس کے جاری کرنے میں مضائقہ نہ کرتا۔

جو کچھ کہا گیا اس میں شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام عالم انسانیت کے فائدے کے لئے نازل ہوا تھا اور ہر زمانے کے لئے سازگار ہے اور وہ انسان کی کمال اور بقا کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام تمام جزوی مسائل میں تفصیلی قوانین مرتب کرتا ہے کیونکہ یہ تمام قوانین ان تمام مواقع اور موارد میں لازم ہیں جن میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

لیکن جو موارد ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں وہاں اسلام نے یہ ایک اصول کلی مقرر کردیا ہے کہ انسان اپنی زندگی گزارنے میں تمام اصول پیش نظر رکھے۔ اسلام مسئلہ غلامی میں بھی اسی طریقہ پر کاربند رہا۔ غلاموں کی آزادی کے لئے اس نے عاقلانہ قوانین کا اجراء کیا جن میں اس قدیم مشکل سے نکلنے کے لئے قریب ترین راہ جسے عالم انسانیت برداشت کرسکے بتادی تاکہ بہتر مورد پر پہنچا جاسکے اور انسان فروشی کی ممانعت کا قانون جاری نہیں کیا۔ سب پر واضح ہے کہ اسلام انسانی طبیعتوں کے بدلنے کے لئے نازل نہیں ہوا تھا بلکہ انسانی فطرت و طبیعت کو مہذب بنانے کے لئے

آیا تھا۔ اس لئے آیا تھا کہ ہر طرح سے جبر کرنے والے اور فساد پھیلانے والے انسان کو انسانیت کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچائے حتیٰ کہ بطور نمونہ بعض افراد (اعلیٰ مدارج طے کرتے ہوئے) حد اعجاز کو پہنچ گئے اور ایسا مقام حاصل کیا کہ تاریخ میں کسی نظام کے پیروکاروں کو وہ مقام حاصل نہ ہوسکا۔

اس کے باوجود اسلام اس پر مامور نہ تھا کہ تمام افراد کو تہذیب اخلاق میں اس مقام تک پہنچادے کیونکہ اگر خدا چاہتا تو روز اول سے بشر کو فرشتہ بنا کر خلق کرتا اور فرشتوں کی ذمہ داریاں اس پر ڈال دی جاتیں جو ہرگز خطا نہیں کرتے ہیں اور جو لولوتاً اچھے کام کرنے پر مامور ہیں لیکن وہ جو انسان کا پیدا کرنے والا ہے اور اس کی صلاحیت سے واقف ہے بہتر جانتا ہے کہ پرورش انسان کے لئے کس حد تک کوشش لازم ہے۔

بہرحال یہ افتخار اسلامؑ کے لئے کافی ہے کہ اس نے غلاموں کی آزادی کی تحریک خود اپنی قلمرو میں دوسروں کے اس کے فوائد سے آگاہ ہونے سے سات سو سال پہلے شروع کی اور اس عاقلانہ اقدام سے غلامی کی تمام جڑوں کو جزیرۂ عرب سے کاٹ دیا۔ اگر دنیا کے تمام مقامات میں دیگر منابع غلامی کی پرورش میں مشغول نہ ہوتے تو یہی بہتر ہوتا کہ مستقبل قریب میں عالم اسلام میں غلامی کے باطل ہونے کا رسمی اعلان کردیا جاتا۔ لیکن اس وجہ سے اس زمانے میں دنیا میں غلامی کے خاتمے کا اعلان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ صرف عالم اسلام اس سے مخصوص نہ تھا بلکہ اس کے دشمن بھی جو احاطہ ء اسلام سے باہر تھے اسی خصوصیت کے حامل تھے۔

ہم اس کے بعد کچھ تفصیل سے اس سلسلے میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ ہمیں علم ہے کہ آزادی کبھی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی بلکہ ہمیشہ جبر کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ بھی ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے کہ غلام کو آزاد کرنے کے

لئے ایک معمولی فرمان کو جاری کر دینا کافی نہیں ہوتا۔ اس بات کا بہترین تجربہ امریکیوں کو ہو چکا ہے جب غلاموں کو آزاد کر دینے کے لئے "ابراہم لنکن" نے اپنے قلم سے فرمان جاری کیا۔ گو کہ لنکن کے فرمان کے جاری ہونے سے وہ بظاہر آزاد ہو گئے لیکن ان میں یہ حوصلہ نہ تھا کہ اپنی آزادی کی حفاظت کر سکیں اور اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ اپنے مالکان کی طرف گئے کہ وہ دوبارہ ان کو اپنی غلامی میں قبول کر لیں اور عملاً غلامی کا تقاضہ کیا۔ یہ اس لئے کہ آزادی ان کے ضمیر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ مگر یہ کہ وہ واقعاً آزاد ہوتے اور ہر جہت سے احساس آزادی پر مائل ہوتے۔[1]

پوشیدہ نہ رہے کہ ابتدا میں یہ مسئلہ بعید از فکر محسوس ہوتا تھا لیکن اگر جاری و ساری حقیقتوں اور قانون فطرت کو پیش نظر رکھا جائے تو قطعاً مشکل نہیں ہے کیونکہ انسانی زندگی ایک سادہ اور بے رنگ خصلت ہے اور رسوم و رواج کے عوامل اس بات کا باعث ہوتے ہیں کہ وجدان و افکار اور بشر کے اندرونی احساسات ان سے متاثر ہوں۔

اسی وجہ سے ایسا ہے کہ غلام کی شخصیت اور ہستی ایک آزاد انسان کی شخصیت اور ہستی سے بہت بڑا فرق رکھتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ غلام کوئی اور جنس ہے بلکہ اس نقطہ نظر سے کہ ان کی زندگی غلامی کے اثر سے اس طرح گزری کہ وہ خود کو نہ پہچان سکے ان کے افکار و وجدان نے صرف بندگی کے طور طریقوں کو اپنایا اور پست

۱۔ ممکن ہے کہ ماسلام نے یکدم غلامی کو ختم کرنے کا اعلان اس لئے نہ کیا ہو کہ اسلام یہ چاہتا تھا کہ پہلے ان دل شکستہ افراد کی دلجوئی کی جائے اور انہیں ذہنی طور پر آزاد رہنے کا طریقہ سمجھایا جائے کیونکہ اگر وہ ذہنی طور پر خوئے غلامی میں مبتلا رہ گئے تو ظاہری آزادی ان کے چنداں مفید ثابت نہ ہوگی۔

لنکن کے اعلان آزادی کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ غلامی کو ختم کرنا اور بات ہے لیکن غلام سے احساس غلامی کا ہٹانا اور بات ہے۔ اور غالباً اسلام کی یہی منشا ہوگی کہ پہلے انہیں خود اعتمادی دی جائے اور جب ان میں مکمل طور پر خود اعتمادی پیدا ہو جائے تو پھر غلامی کے خاتمہ کا اعلان کر دیا جائے۔

ہم یہ بات وثوق سے کہتے ہیں کہ اگر چند خارجی عوامل نہ ہوتے تو غلامی کے خاتمہ کا اعلان امریکہ کی بجائے کسی اسلامی ریاست سے ہوتا۔ (از مترجم)

اخلاق کے ساتھ انہوں نے عبودیت کا بار اٹھایا۔ اس لئے کہ اطاعت و فرمانبرداری ان کی سرشت میں آخری ممکنہ حد تک جڑ پکڑ چکی تھی اور اس کے مقابل ہر طرح سے احساس ذمہ داری اور زندگی کی زحمتوں کی برداشت ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ آپ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ گو کہ غلام جس وقت اپنے آقا کی طرف سے دشوار اور طاقت فرسا کاموں کی انجام دہی پر مامور ہوتا ہے تو وہ بغیر کسی احساس ناراحتی کے ان کاموں کو اچھے طریقے پر انجام دیتا ہے کیونکہ وہ سوائے احساس اطاعت و فرمانبرداری کے اپنی سرشت میں اور کچھ نہیں پاتا۔ لیکن اگر یہی غلام، یہی طاقتور انسان جب خود ذمہ دار بنا دیا جاتا ہے تو کوئی کام اس طرح انجام نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ اس کے لئے آسان ترین کام ہوتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ اس کا جسم ان کاموں کے لئے ناتواں اور کمزور ہوتا ہے اور اس کی فکر حالات کو سمجھنے میں پیچھے رہ جاتی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا نفس کبھی حکم کے بغیر کام پر آمادہ نہیں ہوتا اور حکم پائے بغیر وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ذمہ داریوں کی مشکلات اور زندگی کی سختیوں کو خود سے جھیل لے۔

کیونکہ حکم کا ماننا اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کی پیروی اور فکر حلقہ بگوشی اس کی بشریت کی گہرائیوں پر تسلط جمائے ہوئے ہے اور جب حکم اور حکم دینے والا اس کے سر پر نہیں ہوتے تو ذمہ داری کے موہوم خطرات اسکی نظر میں مجسم ہو جاتے ہیں اور بے بنیاد مشکلات اسکے ضمیر کو مشکل میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اسی لئے وہ کم ہمتی کا شکار رہتا ہے خطرات کا سامنا نہیں کر پاتا اور فرائض کی ادائیگی سے باز رہتا ہے۔

جسمانی آزادی اور ذہنی غلامی

اگر آپ ذہنی غلامی کو ملاحظہ کرنا چاہتے ہوں تو اکثر نو آزاد شدہ مشرقی ممالک پر نگاہ ڈالیں اور خاص طور پر مصر پر نگاہ ڈالیں۔ آپ دیکھیں گے کہ تاریخی اہمیت رکھنے والا یہ ملک بظاہر آزاد ہے لیکن پلید استعمار کی صدیوں کی غلامی کا اثر آج

بھی اہل مصر کے ذہن میں موجود ہے۔ وہ ذہنی طور پر اس وقت بھی غلام ہیں۔ کسی بھی منصوبہ سازی کے وقت جب تک مغربی ممالک کے مشیروں سے مشورہ حاصل نہ کیا جائے تو حکومت اس پر عمل نہیں کرتی۔[1]

اسی طرح اہل فکر ذلت کے ان آثار کو اس سرزمین میں اکثر معطل شدہ امور میں بخوبی ملاحظہ کرسکتے ہیں اور اسکی بنیادی وجہ صرف موہوم خطرات کا سامنا کرنے کا خوف ہے۔ یہاں تک کہ حکومتیں رواں مملکتی امور میں بغیر انگریزی یا امریکی مشیروں کے مشوروں کے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاسکتیں کیونکہ یہ حکومتیں گمان کرتی ہیں کہ جب تک بیرونی ماہرین کی نگرانی نہیں ہوگی ان کے کاندھے اس بوجھ کو نہیں اٹھا سکیں گے۔ اس طرح اس خطرناک فکر نے حکومت کے کارکنان کو جکڑ رکھا ہے اور ان کو نان جویں کا محتاج بنا دیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی بغیر بیرونی نگرانوں کی اجازت و منشا کے خود کو کسی کام کے کرنے پر قادر نہیں پاتا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس کے کرنے سے عاجز ہیں بلکہ اس لئے کہ احساس ذمہ داری اور اسی طرح احساس آزادی ان میں ختم ہوچکا ہے اور غلامی اور سر جھکانے کی عادتیں ان میں مضبوط ہوچکی ہیں۔ درحقیقت وہ آزاد نہیں ہیں بلکہ آزادی کے لباس میں غلام ہیں اور یہ سب روح کی شکستگی اور احساس حقارت ہے جو غلام کو کھلی غلامی کی ذلت میں رکھے ہوئے ہے۔

یہ واضح ہے کہ خود کو پست اور حقیر گرداننا، غلام کی ذاتی صفت نہیں ہے بلکہ اس کی آلودہ زندگی اور بیرونی عوامل کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ طوق اطاعت

ا۔ بات یہ ہے کہ اللہ نے اہل مصر کو عقل اور ذہن سے نوازا ہے اور وہ کسی بھی بات میں اہل مغرب سے کم نہیں ہیں لیکن ایک طویل عرصے تک غلام رہنے کی وجہ سے ان میں خود اعتمادی کا فقدان پیدا ہوچکا ہے اور جب تک ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہوگی اس وقت تک وہ اپنے فیصلے آزادانہ طور پر کرنے کے قابل نہیں ہوں گے اور حالات کی رفتار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہی مغربی مشیر موجود رہے تو اس ملک کے ذہنی افلاس میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا اور یہ ملک تمام ضروریات کے لئے مغرب کا دست نگر بن کر رہ جائے گا۔ (از مترجم)

اس کی گردن میں پڑا ہوا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اس ذلت میں پڑا رہے بلکہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھ لینے اور ذاتی ہمت پر بھروسہ کرنے کے بعد آزادی اور اپنی شخصیت کی حفاظت کرسکتا ہے۔ درخت کی اس شاخ کے مانند جو بادحوادث کی سختیوں سے ٹوٹ جاتا ہے اور صرف تنا کھڑا رہ جاتا ہے جس کا ایک سرا زمین میں موجود رہتا ہے جو زمانہ گزرنے کے ساتھ بارآور ہوتا ہے اور آخرکار دوبارہ تنومند درخت کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ ہمارے دوستوں پر روشن ہے کہ روحانی کسالت کا علاج ہرگز کسی حکومت کے فرمان جاری کرنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ نئے افکار کے ضمیر میں داخل کرنے اور ان کی پرورش کرنے میں مضمر ہے تاکہ غلام کی سرشت کی اس بیماری کا مداوا ہوسکے۔

اسلام غلاموں کو ایسی آزادی نہیں دینا چاہتا تھا جہاں صرف ان کے جسم آزاد ہوں اور ذہن غلام ہوں۔ اسلام نے جسمانی آزادی سے قبل محبت و الفت سے ان کی دل شکستگی کا مداوا کیا اور ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو محبت و پیار سے جوڑا اور ان میں خود اعتمادی پیدا کی اور انہیں یہ یقین دلایا کہ وہ بھی ہر لحاظ سے دوسرے انسانوں کے برابر ہیں بلکہ انہیں یہ باور بھی کرایا کہ اگر وہ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں تو آزاد انسانوں پر حکومت بھی کرسکتے ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام نے غلاموں کو بلند کرداری اور اعتبار بشریت میں اعجاز کی حد تک پہنچایا جیسا کہ آیات قرآنی اور اسلام کے آزادی بخشنے والے پیغمبرؐ کی احادیث کی روشنی میں ذکر کیا گیا۔ آیئے اب اس قانون کے واقعی اجراء کے بارے میں گفتگو کریں:

اسلام نے زیردست اور محروم طبقہ کو احساس کمتری سے نجات دلانے کے لئے کئی عملی اقدامات کیئے۔ رسول اللہؐ نے بزرگان عرب اور غلاموں میں بھائی چارہ

قائم کیا۔ آپؐ نے حبشی غلام بلالؓ بن ریاح کو خالد بن رویحہؓ کا بھائی بنایا اور اپنے غلام زیدؓ کو اپنے محترم چچا حمزہ بن عبدالمطلبؓ کا بھائی بنایا اور خارجہ بن زیدؓ کو حضرت ابوبکرؓ کا بھائی بنایا اور مواخات کا بندھن رابطۂ خون اور قرابت کی مانند اتنا مضبوط تھا کہ میراث میں بھی انہیں ایک دوسرے کا وارث مقرر کیا گیا۔

اسلام کے روشن ضمیر پیغمبرؐ نے صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس سے بھی بڑا انقلابی اقدام کیا۔ آپؐ نے اپنی پھوپھی کی لڑکی زینبؓ کا نکاح اپنے غلام زیدؓ سے کر دیا۔

واضح رہے کہ شادی کا مسئلہ زوجین کے لئے حساس مسئلہ ہوتا ہے خاص طور پر عورت اس کی حساسیت سے زیادہ متاثر ہوتی ہے کیونکہ عورت اپنے سے بالا شخص کے ساتھ نکاح کو اپنے لئے فخر سمجھتی ہے لیکن اپنے سے پست شخص سے نکاح کرنے پر عورت کسی قیمت آمادہ نہیں ہوتی اور اگر کہیں ایسا ہو جائے تو عورت ایسے شوہر کو اپنے لئے ننگ و عار سمجھتی ہے اور ایسے شوہر کے متعلق اس کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ اس نے میری ذاتی عزت کو بھی کم کر دیا ہے۔

حضرت رسول اکرمؐ اس مسئلے کی حساسیت سے آگاہ تھے لیکن حضور اکرمؐ اس ذریعے سے غلاموں کی ذہنی حالت کو پستی سے نکال کر عام افراد کے برابر لانا چاہتے تھے اور انہیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ خدا نے انہیں ذلت و رسوائی کے لئے پیدا نہیں کیا وہ بھی اس معاشرے کے افراد ہیں اور عزت و تکریم میں وہ کسی سے کم نہیں ہیں اور وہ ایک آزاد عورت کے کفو بننے کے بھی قابل ہیں۔

قارئین کرام! پیغمبر اکرمؐ نے صرف زیدؓ کو رشتہ دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آپؐ نے مقامِ بندگی کو اس طور بلند فرمایا کہ آقا اپنے غلاموں پر رشک کرنے لگے۔ آپؐ نے زیدؓ کو بہت سے سرایا کا امیر بنایا اور آزاد قریشی اور غیر قریشی افراد کو ان کی

ماتحتی میں دیا۔ (آپؐ زیدؓ کے فرزند اسامہ سے بھی بے حد محبت فرماتے تھے اور) ایک غزوہ میں جب زیدؓ کو امیر لشکر مقرر کیا تو فرمایا: اگر زیدؓ شہید ہو جائے تو اسکا بیٹا اسامہ امیر لشکر ہوگا۔[1] اس طرح اسلام کی باعظمت فوج غلام اور غلام زادہ کی زیر کمان ہوگئی تاکہ دنیا والوں کے سامنے غلاموں کی آزادی اور عزت کا اعلیٰ ترین نمونہ ظاہر کیا جا سکے۔ اس صورت میں کہ صاحبان عظمت صحابہ کرامؓ جو سب صاحبان رتبہ عالی تھے، اس فوج میں زیدؓ کی زیر کمان تھے۔ اس طرح اسلام کے ہوشمند پیغمبرؐ نے اس حکیمانہ کردار کی بدولت نہ صرف غلاموں کو انسانوں کے مساوی قرار دیا بلکہ آزاد لوگوں پر حکومت اور سرداری بھی عطا کی اور یہ گروہ جو صف انسانیت سے خارج سمجھا جاتا تھا اس کو اتنا بلند کیا کہ تمام ملت اسلامی بلکہ تمام عالم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! کان کھول کر اس حقیقت کو سن لو اگر سیاہ چہرے والا حبشی غلام بھی تمہارا حکمران ہو تو جب تک وہ احکام خدا کی مخالفت نہ کرے اسکی اطاعت کرتے رہنا۔"

حضرت پیغمبر اکرمؐ نے غلاموں کو مقام بادشاہی عطا کیا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے شوریٰ کی تشکیل کے وقت کہا تھا:

"اگر ابو حذیفہؓ کا غلام سالمؓ زندہ ہوتا تو میں اسے اپنا جانشین مقرر کر دیتا۔"

اسلام نے غلاموں کو کتنا بڑا مقام عطا کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں

---

[1] اس مقام پر فاضل مؤلف کو اشتباہ ہوا ہے۔ غزوہ موتہ کے وقت آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا: اگر زید شہید ہو جائے تو جعفر بن ابی طالبؓ سالار ہوگا اور اگر وہ شہید ہو جائے تو عبداللہ بن رواحہؓ سالار لشکر ہوگا اور اگر وہ بھی شہید ہو جائے تو مسلمان اپنے سالار کا خود ہی انتخاب کریں گے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت زیدؓ کی شہادت کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے اسلامی پرچم کو بلند کیا اور جب وہ بازو کٹا کر شہید ہوئے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے علم اسلام اٹھایا اور جب وہ بھی شہید ہوگئے تو فوج نے خالد بن ولیدؓ کو اپنا امیر مقرر کیا۔ اس جنگ میں اسامہ بن زیدؓ موجود نہیں تھے۔ البتہ حضور اکرمؐ نے اپنے آخری وقت میں اسامہ بن زید کو لشکر اسلام کا سالار بنا کر تمام سرکردہ افراد کو (سوائے علی علیہ السلام کے) ان کی ماتحتی میں دے دیا تھا۔ (عرض مترجم)

کہ ایک بار حبشی غلام حضرت بلالؓ نے بیت المال کے مسئلے پر حضرت عمرؓ پر سخت قسم کے اعتراض کیئے۔ حضرت عمرؓ اس کے جواب دیتے دیتے تنگ آگئے اور آسمان کی طرف منہ کر کے کہا: "خدایا! مجھے بلالؓ اور اس کے دوستوں کے شر سے محفوظ فرما۔"

آپ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ اس وقت خلیفۃ المسلمین تھے مگر انہوں نے حضرت بلالؓ کا احترام ملحوظِ خاطر رکھا۔ا

البتہ ان مثالوں کے ظاہر کرنے سے اسلام کا مقصد یہ تھا کہ غلاموں کے وجدان اور ضمیر کو آزاد کردے اور ان کی سرشت میں آزادی کے انقلاب کو برانگیختہ کرے۔ جیسا کہ بحث کے شروع میں اشارہ کیا گیا کہ وہ خود اپنی شخصیت کو پہچانیں اور اپنی آزادی کا مطالبہ کریں اور یہ حقیقی ضمانت تھی جو اسلام نے غلاموں کو آزادی کے سلسلے میں دی۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ اسلام نے تمام ضروری وسائل کے ساتھ لوگوں کو

ا۔ حضرت بلالؓ کو اتنی حریت فکر اسلامی تعلیمات کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی کہ وہ ہمہ مقتدر شخصیت کے منصب کی پروا کیئے بغیر اس پر تنقید کرنے لگے تھے۔

قارئین کرام! اس مقام پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جایئے اور اسلام اور دیگر آزادی منش ممالک کے انداز کا فرق ملاحظہ فرمایئے۔

اسلام نے غلاموں کو ویسے ہی آزاد نہیں کیا۔ آزادی سے قبل انہیں خود اعتمادی کی دولت عطا کی اور اپنے اقدامات سے انہیں قابل بنایا کہ وہ بڑی سے بڑی ذمہ داری بھی ادا کرنے کے قابل ہوں اور اس کے برعکس امریکہ کے پہلے صدر ابراہام لنکن نے انہیں خود اعتمادی دیئے بغیر آزادی دے دی جبکہ وہ ذہنی طور پر آزادی سے متمتع ہونے کے قابل تک نہیں تھے اور اعلان آزادی کے بعد بھی وہ اپنے آقاؤں کی غلامی کرنے پر بصد شوق آمادہ تھے۔

اسلام نے صرف خارجی آزادی نہیں دی بلکہ ان کے ضمیر و قلب میں آزادی کو داخل کیا پھر ان کیلئے آزادی کا دروازہ کھولا اور ابراہام لنکن نے صرف خارجی آزادی کو کافی سمجھا۔

دونوں نظاموں کے موازنہ سے ہمارے قارئین خود ہی نتیجہ برآمد کرسکتے ہیں کہ ان میں سے حقیقت آشنا کون تھا اور حقیقتوں سے بے خبر کون تھا۔

غلاموں کی آزادی پر رغبت دلائی۔ لیکن حقیقتاً یہ عمومی آمادگی اور تربیت ایسی تھی کہ غلاموں نے بخوبی سمجھ لیا کہ انہیں بھی اپنے آقاؤں کی مانند نعمت آزادی سے مستفید ہونا چاہیئے۔

ان عاقلانہ اقدامات کا نتیجہ تھا کہ روز بروز غلاموں کو زیادہ سے زیادہ آزاد کیا جارہا تھا، ان کی آزادی طلب کرنے کو قبول کیا جارہا تھا اور اس ذمہ داری کی ادائیگی سے کوئی خوف نہیں محسوس کیا جارہا تھا اور یہی موقع تھا جب اسلام نے آزادی عطا کرنے میں جلدی کی کیونکہ اب غلام آزادی کے مستحق ہوگئے تھے اور کسی زحمت کے بغیر اس قابل تھے کہ اس کی حفاظت کرسکیں۔

ہم لوگ جانتے ہیں کہ ان دو نظاموں میں غلاموں کی آزادی کا مسئلہ ایک سا نہیں ہے۔ ایک جگہ آزادی دینے کی تحریک پھیلائی گئی اور اس سلسلے میں ضروری وسائل مہیا کیئے گئے اور جب حالات مناسب ہوگئے اور لوگ اس کام کے لئے آمادہ ہوگئے تو وہ بلا تامل ان کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور آزادی دینے والوں کو عمومی اختیارات سونپ دیئے گئے۔

دوسرے لوگ اگرچہ خوش نیت تھے لیکن انہوں نے ان عواقب کو پیش نظر نہیں رکھا جو بلا منصوبہ آزادی دینے پر پیش آنے والے تھے اور غلاموں کو خود ہی مشکلات کا سامنا کرنے اور معاشرے کے مفاسد میں غلطاں رہنے کے لئے چھوڑ دیا جس کے نتیجے میں خونی اقتصادی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوئے اور ہزارہا بے گناہ جانیں ضائع ہوئیں۔ پھر بردہ فروشوں کو غلاموں کی جبری آزادی کو برداشت کرنا پڑا حالانکہ ابھی تک ان غلاموں کو اس آزادی کی حفاظت کی قدرت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

چنانچہ اسلام کی ایک افتخار آمیز فضیلت یہ ہے کہ اس نے غلامی ختم کرنے کے لئے پہلے معاشرہ کو داخلی اور خارجی طور پر تحریص دلائی اور ابراہم لنکن کی طرح

صرف خوش نیتی پر اکتفا نہیں کیا۔

لنکن نے امریکہ میں ایک فرمان کے ذریعے جس کی اہمیت غلاموں پر واضح نہیں ہوئی تھی، اچانک قدم اٹھا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہاتھ آیا جو پسندیدہ نہیں تھا اور یہ ان بہت سے محکم دلائل میں سے ایک ہے جو ثابت کرتا ہے کہ اسلام حقیقت مطلب سے کتنا باخبر تھا اور اس نے کس خوبی سے انسانیت کی اس بیماری کی تشخیص کی اور کس حکیمانہ انداز میں انسانوں کی ان تکالیف کا علاج کیا اور ان بیماروں کی بہبودی کی خاطر تا حد اعجاز کوشش کی۔

علاوہ ازیں مسلّم حقوق بشریت کو بغیر احسان جتائے اور بغیر ضائع کئے انسانوں کے اختیار میں دے دیا اور اس عمل کی انجام دہی سے قبل غلام کی اس طرح تربیت کی کہ اسے خود آزادی کی طلب ہوئی، اور اس کے بعد آنے والی مشکلات کا سامنا کرنے کے قابل ہو گیا اور سب لوگ میزان محبت اور دوستی میں ہم پلہ ہو گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔

ادھر یورپ میں اس عمل سے ایسا ناگوار حادثہ گزرا جس نے ایک عالَم کو جلا کر راکھ کر دیا۔ انسانی شعور و افکار کے منابع خشک کر دیئے اور کینہ اور عداوت کی ایسی علامت بنا دیا کہ انسان کے نصیب میں جو کچھ فوائد ممکن تھے انہیں ان کے حصول سے پہلے ہی تباہ کر دیا۔

اب ہم اپنے اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کون سے علل و اسباب تھے جن کی وجہ سے اسلام نے غلامی کو جائز رکھا تھا اور اسلام کی ایسی کونسی مجبوریاں تھیں جس کی وجہ سے اس نے غلامی کے خاتمے کا اعلان نہیں کیا تھا؟

ہم نے گزشتہ صفحات میں اختصار سے یہ بتایا کہ اسلام نے اپنی اعلیٰ ہمت

سے غلامی کے تمام منابع کو خشک کر دیا تھا۔ مگر ایک منبع جو اس کی پہنچ سے باہر تھا وہ جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے قیدی تھے جنہیں غلام بنا لیا جاتا تھا۔

مزاج تاریخ کو جاننے والے تمام افراد اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اس تاریک دور میں اسیران جنگ کو غلام بنانے کا رواج تھا اور اگر اسیران جنگ کو غلام نہ بنایا جاتا تو انہیں قتل کر دیا جاتا تھا اور یہ اس تاریک دنیا کی پرانی رسم تھی۔ جب اسلام دنیا میں آیا تو اس وقت بھی یہی حالات تھے اور بعض اوقات مجبور ہو کر اسلام کو دشمنان اسلام سے جنگیں کرنا پڑیں اور ان جنگوں میں کئی بار ایسا ہوا کہ بہت سے مسلمان دشمن کے ہاتھوں قید ہو گئے اور اس دیرینہ رسم کی بنا پر ان کو غلام بنا لیا گیا اور ان کے ساتھ بھی دشمنوں نے وہی سلوک روا رکھا جو کہ غلاموں کے ساتھ قدیم الایام سے روا رکھا جاتا تھا اور اگر اتفاق سے کوئی خاتون دشمنان اسلام کے ہتھے چڑھ گئی تو انہوں نے اس پر کوئی رحم نہ کیا اور اس کی چادر عصمت کو تار تار کیا گیا اور اس کی اجتماعی آبروریزی کی گئی۔ نہ اس سلسلے میں کسی رسم یا قانون کا خیال کیا گیا اور نہ احترام انسانیت کرتے ہوئے کوئی چھوٹی سی چھوٹی رعایت انہیں دی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ معصوم بچے بھی اگر ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو انہیں غلامی کی ذلت میں پرورش کیا جاتا تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے لئے فائدہ کا باعث بنیں۔

ایسے تنگ و تاریک اور ننگ انسانیت ماحول میں اسلام کو بھی مجبوراً غلامی کے مسئلے پر مصالحت کرنا پڑی کیونکہ اسلام حقیقت پسند دین ہے اور وہ اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ اغیار تو اس کے پیروکاروں کو غلام اور کنیز بنا کر طاقت فرسا شکنجوں میں کستے رہیں اور قسم قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کرتے رہیں اور وہ دشمن کو ہاتھ تک نہ لگائے اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے اور میدان جنگ میں گرفتار ہونے والے افراد کو واپس روانہ کر دے تاکہ وہ دوبارہ مرکز اسلام پر حملہ آور ہوں۔

البتہ اس صورت میں اسلام نے عادلانہ ترین بلکہ یگانہ روش کو اپنایا تاکہ دشمن کے اس حربے کا توڑ کر سکے۔

اسی مجبوری کے پیش نظر اسلام نے غلامی کو جائز قرار دیا۔ سادہ الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں غلامی کا جواز عمل نہیں بلکہ رد عمل ہے۔ دشمنوں کی "جزائے مثل" کے لئے ایسا کرنا انتہائی ضروری تھا۔

واضح رہے کہ اسلام اپنے دشمنوں پر ایسا قابو نہیں رکھتا تھا کہ عالم بشریت کی اس مشکل کو حل کر سکے۔ چنانچہ اسے مجبوراً وقت کی ضرورت کے مطابق انہی سخت مشکل حالات میں گزارا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ خود دنیا نے جنگی قیدیوں سے متعلق اپنے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی اور ان انسانیت سوز فوائد حاصل کرنے سے خود کو روکا۔

البتہ آہستہ روی کے باوجود اسلام قانونِ جنگ اور جنگی قیدیوں کے بارے میں دوسروں سے واضح فرق رکھتا تھا۔ غیر مسلم جب بھی جنگ کرتے تھے تو سوائے قتل و غارت، خونریزی اور قیدیوں کے حصول کے ان کا مقصد کچھ نہ ہوتا تھا۔ جنگ کے شعلوں کو اس لئے بھڑکایا جاتا تھا کہ ایک قوم چاہتی تھی کہ دوسری قوم کو نیست و نابود کردے اور اپنی قلمرو کو وسعت دیدے یا دوسروں کی حکومت کو غارت کردے اور ان کو آزادی کے حق سے محروم کردے یا فقط اس لئے کہ ایک ڈکٹیٹر یا خونخوار فرمانروا اپنی شہوت کی آگ بجھانے کے لئے ایسے حالات پیدا کردیتا تھا کہ اپنے غرور اور طاقت کو دوسروں پر ظاہر کرے اور کبھی انتقام کی آگ بجھانے کے لئے امن و چین کے مقامات کو جنگ کے شعلوں کی نذر کردیا جاتا تھا۔ غرض تمام ایسے اہداف کے لئے جو انسانیت کے خلاف تھے وقتاً فوقتاً جنگ کی آگ بھڑکائی جاتی تھی۔

یہ بھی واضح ہے کہ اس دار و گیر میں قید ہونے والے غلامی کی ذلت کے ساتھ گرفتار ہوتے تھے اور وہ اتنی ہمت نہیں رکھتے تھے کہ اپنے حقوق حاصل کرنے

کیلئے قیام کرتے اور اس لئے بھی کہ فتح مند غارت گروں کی سطح اخلاق اور افکار پست ہوتے تھے (اور وہ اپنے حقوق کیلئے بلند ہونے والی آوازوں کو برداشت نہ کرسکتے تھے) جبکہ قیدیوں کا جرم فقط یہ ہوتا تھا کہ جسمانی طاقت میں کمتر ہوتے تھے اور میدان جنگ میں دشمن سے مغلوب ہوچکے ہوتے تھے۔ ان جنگوں میں کسی قانون اور قاعدے کا پاس نہیں کیا جاتا تھا کہ جس کے ذریعے عزت و ناموس کی بے حرمتی، شہروں کی ویرانی، بے سہارا عورتوں اور بچوں اور عاجز بوڑھوں کے قتل سے روکا جاسکے۔

یہ ان جنگوں کی خون رلانے والی ایک ہلکی سی جھلک تھی جن میں کوئی مضبوط عقیدہ یا عالی ہدف سامنے نہیں ہوتا تھا۔

ایسے انقلاب اور طغیان کے دور میں اسلام آیا اور ان تمام معرکوں کو باطل اور ایسی تمام جنگوں کو حرام قرار دیا۔ مگر جہاد کو جو راہ خدا میں کیا جائے یا دشمنوں کو مسلمانوں کی سرزمین سے نکالنا ہو یا اس فتنہ یا آشوب کو ختم کرنا ہو جو مسلمانوں میں در آیا ہو۔ قرآن مجید فرماتا ہے: وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ. (البقرہ ۱۹۰) "اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور زیادتی نہ کرو بیشک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اسی مسئلے کو دوسرے مقام پر ان الفاظ سے بیان کیا گیا: وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ. (الانفال ۳۹) "اور ان لوگوں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ کا خاتمہ ہو جائے اور دین سب خدا کا ہو جائے۔"[1]

۱۔ اسلام جنگ کی بجائے جہاد کا علمبردار ہے۔ لفظ "جہاد" جہد سے بنا ہے جس کے معنی کلمۂ حق کی سربلندی کی منظم کوشش کے ہیں اور عام طور پر یہ جدوجہد ذاتی محنت اور انفاق فی سبیل اللہ سے سرانجام دی جاتی ہے اور "قتال" اس کا آخری مرحلہ ہے اور قتال فی سبیل اللہ کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب کوئی دشمن مسلمانوں کو ان کے مرکز میں امن و چین سے رہنے کی اجازت نہ دے تو اپنے مرکز کو بچانے کے لئے مسلمانوں کو مجبوراً تلوار اٹھانا پڑتی ہے۔ (از مترجم)

اسلام ایک طرح کی سلامتی کی دعوت ہے اور اس نے کسی کو بھی خود کو قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا: لَاۤ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ. (البقرہ ۲۵۶) "دین میں کوئی جبر نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے۔" اور اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صدر اسلام اور بعد میں اسلامی مراکز میں یہود و نصاریٰ موجود تھے مگر اسلام نے انہیں بزور شمشیر مذہب تبدیل کرنے کا حکم صادر نہیں کیا تھا۔

اگر کوئی شخص اسلام کی صداقت سے متاثر ہو کر خود بخود اسلام قبول کر لے تو اسے اسلام کی طرف سے وہ جملہ حقوق مل جاتے ہیں جو دوسروں کو حاصل ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں کسی پرانے اور نئے مسلمان میں کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا۔ نہ عربی کو عجمی پر نہ عجمی کو عربی پر مگر یہ کہ کوئی تقویٰ اور پاک دامنی میں بڑھ جائے۔

اگر کوئی قوم قبیلہ اسلام قبول نہ کرنا چاہے تو بھی اسلام اس پر زبردستی نہیں کرتا اور وہ اس کی مکمل حفاظت پر بھی اپنی آمادگی کا اعلان کرتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جو افراد اور اقوام اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو وہ سال میں ایک مختصر اور حقیر سی رقم جزیہ کے طور پر اسلامی حکومت کو ادا کریں اور اس کے بدلے میں اسلامی حکومت ان کی جان و مال اور عزت و ناموس کا تحفظ کرے گی اور انہیں داخلی اور خارجی دشمنوں سے محفوظ رکھے گی اور اگر اسلامی مملکت ان کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی تو ان سے جزیہ کی رقم وصول نہیں کی جائے گی۔

اس کے باوجود بھی اگر کوئی قوم نہ تو اسلام قبول کرے اور نہ ہی اسلامی حکومت کو جزیہ ادا کرے تو اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ ایسی قوم ہر قیمت پر اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو چکی ہے اور اسلام کی امن و آشتی کی پیش کش کو ٹھکرا رہی ہے اور وہ اپنے اس رویہ سے اسلام کے روشن ستارے کو خاموش کرنا چاہتی ہے

اور اس معاشرے میں جو لوگ ہدایت اور انصاف کے خواہش مند ہیں وہ ان کے سامنے رکاوٹ کھڑی کر رہی ہے۔ اس صورت میں اسلام جنگ کو ضروری سمجھتا ہے اور جب اسلام کی فوجی قوت کے سامنے وہ سر تسلیم خم کر لیں تو اسلام مزید خونریزی کی اجازت نہیں دیتا اور قرآن مجید نے اس صورتحال کے متعلق اپنی پالیسی یہ بیان کی ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (الانفال ۶۱) "اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو کہ وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

بس یہ ہے اسلامی جنگ کا مفہوم اور اسلام جنگ کو اس لئے جائز قرار نہیں دیتا کہ حدود سلطنت میں توسیع کی جائے جنگ اسلامی کسی جنگجو فرمانروا کی ہوس رانی یا کسی مطلق العنان بادشاہ کی سوچ کے تحت شروع نہیں کی جاتی بلکہ یہ جنگ فقط راہ خدا میں جہاد ہوتی ہے جس کا مقصد بشریت کے کاروان کی رہنمائی کرنا ہے اور جنگ کی اجازت بھی صرف اس وقت دی جاتی ہے جب مصالحت کی ہر پیش کش ناکام ہو چکی ہو اور جنگ کے باوجود بھی اسلام انسانی حقوق کو فراموش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

پیغمبر اکرمؐ نے اپنے لشکر کو رخصت کرتے وقت انہیں نصیحت کی: "خدا کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ اور رضائے خداوندی کے لئے ان لوگوں سے جنگ کرو جو رب العالمین کے منکر ہیں۔ میدان جہاد میں مردانہ وار لڑو اور کسی کو حیلہ اور مکرو فریب سے قتل نہ کرو اور مقتولین کی لاشوں کا حلیہ مت بگاڑو اور کسی مقتول کے کان ناک وغیرہ کو مت کاٹو اور خبردار بچوں کو قتل کر کے "عاجز کش" کا لقب اختیار کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ اسلام میں غیر فوجیوں کو قتل کرنا حرام ہے اور شہروں اور گھروں کو ویران کرنا اور دوسروں کی عصمت و ناموس کو تباہ کرنا جائز نہیں ہے اور جنگ کو اپنی خواہشات کی تکمیل اور شر و فساد برپا کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ کیونکہ طاقت رکھنے والا خدا

فساد پھیلانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

مسلمان اپنی جنگوں کے دوران ان اصولوں کی سختی سے پاسداری کرتے تھے اور حد یہ ہے کہ مسلمانوں نے صلیبی جنگوں میں بھی اپنے اعلیٰ اقدار کو قائم رکھا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے جب مسیحی افواج نے القدس پر قبضہ کیا تو انہوں نے مسلمانوں کی عصمت دری سے بھی احتراز نہیں کیا تھا اور مسجد اقصیٰ میں پناہ لینے والے افراد کا قتل عام کیا تھا حالانکہ مسجد میں پناہ لینے والے درحقیقت خدا کی پناہ میں تھے۔ مگر صلیبیوں نے نہ تو خانہ خدا کا لحاظ کیا اور نہ ہی پناہ لینے والوں پر رحم کیا اور غیر مسلح افراد کے ناحق خون کی ندیاں بہائی گئیں۔

اب آیئے مسلمانوں کا بھی کردار ملاحظہ فرمائیں:

تھوڑے ہی عرصے میں مسلمان فوج کو دوبارہ فتح و نصرت حاصل ہوگئی تو مسلمانوں نے وہاں بھی اپنے اعلیٰ اقدار کو قائم رکھا جبکہ حکم قرآنی کے تحت انہیں "جزائے مثل" کی اجازت تھی کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ... فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ... (البقرہ ۱۹۴)" ... پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنا اس نے تم پر کی ہے...."

مگر اس اجازت کے باوجود بھی مسلمانوں نے اعلیٰ اہداف کی خاطر دشمن سے انتقام لینا پسند نہ کیا۔

آج جب کہ جنیوا کنونشن کی قراردادیں بھی موجود ہیں مگر ان قراردادوں پر اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہلانے والی قومیں بھی عمل نہیں کرتیں۔ مگر مسلمانوں نے اس طرح کی عالمی قراردادوں کی عدم موجودگی میں بھی میدان جنگ میں ناحق ظلم کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔

جنگی قیدیوں کے متعلق یہاں قرآن مجید کی ایک آیت پیش کرنا ضروری

ہے۔ جو جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کو واضح کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ... (محمد ۴) "پس جب کفار سے مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں اڑادو یہاں تک کہ جب زخموں سے چور ہو جائیں تو ان کی مشکیں باندھ لو پھر اس کے بعد چاہے احسان کر کے چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے لیا جائے۔ یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ یہ یاد رکھنا اگر خدا چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا لیکن وہ ایک کو دوسرے کے ذریعے آزمانا چاہتا ہے۔"

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس آیت میں کہیں غلامی کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ اگر آیت مجیدہ میں جنگی قیدیوں کو غلام بنانے کا حکم دیا جاتا تو وہ دائمی قانون کی صورت اختیار کر لیتا۔ اس آیت میں جنگی قیدیوں کے لئے دو قسم کے حکم دیئے گئے ہیں: (۱) احسان کر کے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ (۲) یا ان سے فدیہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔

اس حکم کے ذریعے سے قرآن مجید نے جنگی قیدیوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل کیا ہے کیونکہ دونوں قانون دائمی قانون بننے کے قابل ہیں۔

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اسلام نے مجبور ہو کر غلامی کو سند جواز فراہم کی تھی اور مسلمانوں نے مجبور ہو کر اس قانون پر عمل کیا تھا۔

اس پر آشوب ماحول میں بھی اسلام کا یہ شعار نہیں رہا کہ قیدیوں کو ہمیشہ غلامی کی ذلت میں رکھا جائے بلکہ جیسے ہی محسوس کیا کہ اب جنگی قیدیوں کے مزید قید رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو انہیں آزاد کر دیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے جنگ بدر کے قیدیوں کو کسی شرط و قید کے بغیر

رہا کر دیا اور نصاریٰ نجران[۱] سے فدیہ لیکر ان کے قیدیوں کو آزاد کر دیا۔[۱] اس لئے کہ اسلام کو ایک برجستہ تاریخی گواہ اور کاروان بشریت کے قافلہ سالار کا کردار ادا کرنا تھا۔

اسلام نے انسانیت کی سربلندی کی عظیم الشان مثالیں قائم کیں اور مسلمانوں نے میدان جنگ میں اپنی خواہشات پر کنٹرول کی بہت سی مثالیں قائم کر کے اپنی مردانگی کا ثبوت فراہم کیا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے جنگی قیدیوں سے فیاضی کا سلوک روا رکھا اور انہیں کبھی بھی اذیتوں سے دوچار نہ کیا اور ان میں کبھی حقارت و ذلت کے احساس کو پیدا نہ ہونے دیا اور اس کے ساتھ ان کے لئے آزادی کا دریچہ ہمیشہ کھلا رکھا۔ اور جب بھی قیدی آزاد ہونے کی خواہش کرتے اور آزادی کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے قابل ہوتے تو انہیں آزاد کر دیا جاتا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جنگی غلاموں کی اکثریت پہلے سے بھی آزاد نہیں ہوتی تھی ان میں اکثریت ان غلاموں کی ہوتی تھی جنہیں ایرانی اور رومی استعمار نے غلام بنایا ہوا تھا اور ان غلاموں کو میدان جنگ میں مسلمانوں کے خلاف نبرد آزمائی پر مجبور کیا گیا تھا۔

اسلام نے عورتوں کو ہمیشہ قابل احترام سمجھا اور کنیزی سے پہلے وہ جس

۱۔ مذکورہ دونوں مثالوں میں فاضل مؤلف کو تسامح ہوا ہے کیونکہ جنگ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا گیا تھا اور جو فدیہ دینے کے قابل نہ تھے انہوں نے دس دس افراد کو لکھنا پڑھنا سکھلایا تھا جبکہ نصاریٰ نجران میں سے کوئی شخص آنحضرتؐ کی قید میں نہیں تھا۔ البتہ ان کے علماء کا وفد حضور اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آپ سے بحث کی۔ جس کے نتیجے میں مباہلہ کی آیت نازل ہوئی اور جب آنحضرتؐ اپنے ساتھ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ اور امام حسنؑ و حسینؑ کو لیکر ان کے مقابلے میں گئے تو انہوں نے اپنی شکست تسلیم کرلی اور مباہلہ سے معذرت کرلی اور انہوں نے سالانہ کچھ جزیہ کی رقم اور کچھ پوشاکیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا جسے دوسرے سال وعدہ کے مطابق ادا کیا گیا۔ لہذا نصاریٰ نجران نے کسی قیدی کی آزادی کیلئے فدیہ نہیں دیا تھا بلکہ مباہلہ کی وجہ سے فدیہ دینا قبول کیا تھا۔ فافھم ولاتکن من الغافلین. من المترجم عفی عنہ.

پستی اور بے چارگی میں مبتلا ہوتی تھیں اسلام نے اپنی کنیزی میں لے کر انہیں سابقہ پستی اور بے چارگی سے نجات دلائی اور ان کی ناموس کو ناموس کے غارت گروں کے حوالے نہیں کیا۔[۱]

اسلام میں کنیز سے تمتع کی اجازت تو ہے لیکن صرف اس کے مالک کو اور مالک کے علاوہ کسی دوسرے کو اس پر تصرف کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

عورتوں کی آزادی کو قریب تر لانے کے لئے اسلام میں قانون مکاتبت موجود ہے۔ جس سے مردوں کی طرح عورتیں بھی مستفید ہوسکتی ہیں۔

اسکے علاوہ تمام "امہات الولد" کنیزوں کو خود بخود آزادی مل جاتی تھی۔ یعنی جو کنیز اپنے مالک کے بچے کی ماں بن جائے تو وہ اور اسکا بچہ دونوں آزاد شمار کئے جاتے ہیں۔

جی ہاں! کنیزوں نے ہر دور میں اسلام کی کریمانہ روش سے خوب استفادہ کیا اور پیغمبر اسلامؐ کی سفارشات سے خوب بہرہ مند ہوتی رہیں۔

اسلام میں غلامی کی یہی داستان تھی جو کہ بذات خود تاریخ انسانیت کا درخشاں باب ہے۔ اسی لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اسلام غلامی کے قانون کا کبھی بھی موافق نہیں رہا۔ اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لئے بہت سے وسائل پیدا کئے اور غلامی کے تمام سوتوں کو خشک کیا۔ اسلام کی یہ خواہش تھی کہ دنیا میں انسانوں کی خرید و فروخت نہ ہو۔ البتہ جزائے مثل کے تحت اسلام کو بادل نخواستہ نظام غلامی کو قبول کرنا پڑا کیونکہ اس دور میں غلامی صرف عالم اسلام سے ہی مخصوص نہیں تھی اکثر اقوام و ملل میں غلامی کا رواج موجود تھا اور وہ لوگ مسلمانوں کو غلام بناتے تھے اور ان سے غیر انسانی سلوک روا رکھتے تھے۔ اسی لئے اسلام اگرچہ قانون غلامی سے

۱۔ جیسا کہ اس دور میں غیر مسلم اقوام میں رواج تھا۔ مگر اسلام ناموس زن کا محافظ ہے اور اسلام مرد آزما اور مرد آفرین مذہب ہے۔ اس نے کبھی کسی فاتح کو یہ اجازت نہیں دی کہ اسیر عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کی جائے اور انہیں مفتوح قوم کے لئے درس عبرت بنادیا جائے۔ (از مترجم)

متصادم تھا پھر بھی اسے اپنی ملت کے افراد کے تحفظ کے لئے یہ اقدام اٹھانا پڑا۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ اگر دنیا کی دیگر اقوام و ملل اس وقت اس غیر انسانی فعل کی مذمت کرتیں اور اسے انسانیت سے متصادم قرار دیتیں اور ایک دوسرے کیلئے دست تعاون دراز کرتیں تو اسلام بھی یقیناً ان کی حمایت کرتا کیونکہ غلامی اسلام کے حقیقی مزاج سے موافقت نہیں رکھتی تھی اور آج چند کوتاہ فکر افراد نے جس سلوگن کو اپنایا ہوا ہے۔ یعنی "آزادی سب کیلئے" اسلام ہی سب سے پہلے یہ نعرہ بلند کرتا لیکن معاصر اقوام و ملل نے اسلام کو یہ آواز بلند کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

ہم یہاں یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ دینی جنگوں کے علاوہ جو غلامی کی صورت پیدا ہوئی تھی اور مسلم معاشرے میں طویل عرصہ تک رائج رہی غرض کہ انسان فروشی اور انسانوں کی چوری وغیرہ سے جس طرح کی غلامی کا رواج چل نکلا تھا ایسی غلامی کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور اصول اسلام کے تحت یہ غلامی خالصتاً ناجائز تھی۔

ہم کسی آمر اور ڈکٹیٹر کے افعال کی وکالت نہیں کریں گے اور ہمیں معلوم ہے کہ آج کے آمر اور ڈکٹیٹر افراد اپنا ہر ناجائز کام قانون کے نام پر سرانجام دینے کے عادی ہیں اور اپنے ہر غلط اقدام کو قانونی تحفظ فراہم کرنے کے درپے رہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے اقدامات کو قانون کی تائید حاصل نہیں ہوتی۔ لہذا ہم بھی کسی مسلمان کج کلاہ اور کسی خود ساختہ "ظل اللہ" کے فعل کو اسلام سے منسوب کرنے پر آمادہ نہیں ہیں اور یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کا ہر فعل اسلام نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اسلام کچھ ہوتا ہے اور مسلمان کا عمل کچھ ہوتا ہے۔

بحث کے خاتمے پر ہم چند نکات یاد دلانا چاہتے ہیں:

۱۔ ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ دوسری اقوام و ملل میں غلامی کے سرچشمے زیادہ تھے

اور آدم فروشی، ایک قوم کا دوسری قوم پر تسلط، جوع الارض اور حکمرانوں کی جھوٹی انا کی تسکین اور دوسروں کو غلام بنانے کی خواہش غلامی کے اصل محرکات تھے اور اس کے علاوہ فقر و فاقہ بھی اس مصیبت کا بڑا محرک تھا۔ ان تمام محرکات کی وجہ سے غلامی کو فروغ نصیب ہوا اور کچھ ایسے بدنصیب بھی تھے جنہیں غلامی ورثے میں ملی تھی اور دیگر جائیداد کی خرید و فروخت کی طرح غلاموں کی خرید و فروخت نے بھی ایک پیشہ کا درجہ اختیار کر لیا تھا چنانچہ جب غلامی نے معاشرے میں ایک پیشے کی صورت اختیار کر لی تو ہر پیشے سے وابستہ افراد کو غلام بنا کر اسی پیشے سے وابستہ لوگوں کے ہاتھوں بیچا جانے لگا۔ یعنی کاشت کاروں کو غلام بنا کر زمینداروں کے ہاتھوں فروخت کیا جاتا تھا اور اسی طرح سے دیگر اہل حرفہ بھی غلام بنا کر اپنے ہم پیشہ لوگوں کے ہاتھوں بکنے لگے۔

ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس طرح کی غلامی کو اسلام قبول نہیں کرتا وہ صرف جنگی قیدیوں کی غلامی کو قبول کرتا ہے مگر اس کا سبب بھی وہ خود نہیں ہے۔ اسلام ہمیشہ سے اس بات کا منتظر رہا کہ دنیا میں جنگوں کا خاتمہ ہو اور غلامی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

۲۔ اسلام نے مخالفین کے رویے کی وجہ سے مجبوراً غلامی کے نظام کو قبول کیا تھا لیکن یورپ میں ایسی صورتحال نہیں تھی انہوں نے صرف استعماریت کو فروغ دینے کیلئے غلامی کو جائز قرار دیا تھا اور دنیا کو اس حقیقت کا بھی بخوبی علم ہے کہ یورپ میں غلامی کے خاتمے کا اعلان انسان دوستی کے اعلیٰ ترین جذبات کے اظہار کیلئے نہیں کیا گیا بلکہ غلامی کے اعلان کا محرک یہ تھا کہ غلامی کی صنعت میں منفعت کا پہلو ختم ہو گیا تھا اور غلام حاصل کرنے پر خرچ زیادہ اٹھتا تھا اور اس سے فائدہ کم ہوتا تھا۔ جب یورپی سود خوروں نے اپنے نفع و نقصان کی شرح کو ملاحظہ کیا تو انہیں یہ سراسر گھاٹے کا

سودا محسوس ہوا اسی وجہ سے غلامی کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔ یہ ہمارا اپنا پیدا کردہ نظریہ نہیں ہے بلکہ یورپ کے اخبارات و رسائل کے مضامین کا ماحصل یہی ہے۔

غلامی کے خاتمہ کا اعلان کسی حسن نیت کا مظہر ہرگز نہیں تھا، اس سے جنس بشر کا احترام مقصود نہیں تھا بلکہ غلاموں کی تجارت کے غیر منفعت بخش ہونے کی وجہ سے یورپ کو مجبوراً یہ کڑوی گولی کھانی پڑی تھی۔

اس کے علاوہ اس گروہ کے لئے اس قدر زندگی کی مشکلات اور وسائل کے فقدان تھے کہ اس سیاہ دور سے آزادی حاصل کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود یورپ نے سادگی سے اپنا ہاتھ غلاموں کے گریبان سے نہیں ہٹایا۔ نہ صرف آزادی کو مفت انہیں نہیں سونپا بلکہ ایک نئے انداز سے غلامی کا طریقہ بدل دیا۔ یعنی خصوصی غلامی کو عمومی غلامی میں تبدیل کر دیا اور وہ اس طرح کہ پہلے شخصی غلامی ہوتی تھی لیکن ان کے اس اقدام سے غلامی زرعی زمینوں کے قطعات کے تابع ہو گئی۔ چنانچہ افراد کی خرید و فروخت زمینوں کی خرید و فروخت کے ضمیمہ کے طور پر ہوتی تھی اور کسی کو حق نہیں تھا کہ اپنے احاطہ سے باہر نکلے اور اگر کوئی اپنے مخصوص احاطے سے باہر نکل جاتا تو اس پر فرار ہونے کا الزام لگا کر اس کے ہاتھ، پاؤں کاٹ دیتے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو نیز فرار ہونے والے افراد کو لوہا گرم کر کے داغ دیتے تھے۔ یہ صورت حال اٹھارہویں صدی میں انقلاب فرانس تک برقرار رہی۔

۳۔ یہ درست ہے کہ انقلاب فرانس سے یورپ میں شخصی غلامی کا خاتمہ ہو گیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ابراہام لنکن نے غلامی کو غیر قانونی قرار دیدیا تو کیا اب خون کے ان پیاسوں نے اپنی سابقہ عادت کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے؟

اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے بلکہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ براعظم یورپ اور امریکہ کے سود خوروں نے دنیا میں انفرادی غلامی کی بجائے اجتماعی غلامی کو رواج دیا

ہے پہلے اشخاص کو غلام بنایا جاتا تھا اور اب اقوام کو غلام بنایا جانے لگا۔ اگر یہ انسانیت سوز سیاست دنیا میں باطل قرار دے دی گئی تھی تو ان غم انگیز حوادث کو کیا نام دیا جائے جو ہر آن اطراف عالم میں ظاہر ہو رہے ہیں؟

حکومت فرانس جو کچھ اسلامی ممالک میں کر رہی ہے یہ وہی غلامانہ سلوک نہیں ہے تو اور کیا ہے اور کیا کوئی شخص ہمیں یہ بتانا پسند کریگا کہ "تمدن کے گہوارے" امریکہ میں سیاہ فام افراد کے ساتھ اس وقت کیا سلوک کیا جارہا ہے اور کیا اس کے علاوہ غلامی کسی اور شے کا نام ہے اور ہم دنیا کے ضمیر سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جنوبی افریقہ پر قبضہ کر کے انگریز انسانیت کی کونسی خدمت کر رہے ہیں؟ کیا غلامی کی حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ ایک قوم جبراً دوسری قوم سے اپنی پیروی کروائے؟ کیا مکمل حقوق سے محروم کر دینے کا نام انسانیت ہے؟ آیا عالم بشریت کے غارت گروں کا منشا اور وادیٔ انسانیت کے رہزنوں کا مقصد ان شرمناک افعال انجام دینے سے غلامی مسلط رکھنے کے سوا اور کچھ ہے جو خواہ ذلیل غلامی کے عنوان سے ہوں یا آزادی و برادری و مساوات کے درخشاں عنوان سے سامنے لائے جائیں؟

ان رنگا رنگ فریب انگیز نعروں سے جن کے پیچھے تلخ ترین حقائق اور تاریخ بشریت کے ناپاک ترین عقائد پوشیدہ ہیں، معاشرے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

مگر اس کے برعکس اسلام دورنگی کا ہرگز قائل نہیں ہے، وہ حسین نعروں سے کسی کو فریب دینے کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اسلام نے برملا کہا ہے: "لوگو! یہ سراسر غلامی ہے اور اس کے ختم کرنے کا یہی راستہ ہے کہ دنیا کی اقوام جمع ہو کر جنگ نہ کرنے کا اعلان کریں اور جب دنیا سے جنگ ہی موقوف ہو جائے گی تو یہ منحوس نظام بھی اپنی موت آپ مرجائے گا۔"

لیکن یہ بے روح تمدن جس کے زیر سایہ ہم آج زندگی بسر کرنے پر مجبور

ہیں ایسا سوچنا بھی گوارا نہیں کرتا اور اس کے برعکس اس کا بس ایک یہی وظیفہ ہے کہ حقائق میں تحریف کر کے شریف کو بدمعاش اور قاتلوں کو شریف بتلائے اور بظاہر خوبصورت اور دلفریب نعرے بلند کرے اور اگر اس کے مکروہ چہرے پر پڑی ہوئی زرین نقاب کو ہٹایا جائے تو اس کا چہرہ چنگیز اور ہلاکو سے بھی بدتر دکھائی دے گا۔

کون نہیں جانتا کہ تیونس اور مراکش اور الجزائر میں تہذیب کے علم برداروں نے کتنے بے گناہ افراد کو ہلاک کیا ہے اور دنیا کے تمام حریت پسند افراد ہمیں یہ بتائیں کہ ان ممالک میں ہزارہا افراد کو قتل کرنے کا آخر کیا مقصد تھا؟ اور کیا الجزائر، تیونس اور مراکش میں رہنے والے انسان نہیں ہیں اور انہیں انسانی حقوق سے محروم رکھنا انسانیت کے تقاضوں کی توہین نہیں ہے؟

ان ممالک کے باشندوں کا جرم بس یہی ہے کہ وہ حق آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہی ہے کہ وہ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر اپنے امور خود نمٹائیں اور وہ صرف یہی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں میں اغیار کی نظروں سے دور ہو کر اپنی مادری زبان میں گفتگو کریں اور اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کریں اور اپنی محنت کا ثمرہ خود کھائیں اور اپنے قدرتی وسائل سے وہ خود مستفید ہوں اور اپنی خواہش اور مرضی کے تحت اقوام عالم سے خارجہ تعلقات قائم کریں۔ اس معصوم خواہش کے جواب میں آج ان کا قتل عام کیا جا رہا ہے اور آزادی کے متوالوں کو تنگ و تاریک زندانوں میں محبوس کیا جا رہا ہے اور خانماں برباد خواتین کی عصمت دری کی جا رہی ہے۔ یہ معلوم کرنے کیلئے کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی ہے، ماؤں کے شکم چیرے جا رہے ہیں۔ غرضیکہ یہ تمام غیر انسانی حرکات کا ارتکاب وہ لوگ کر رہے ہیں جو اپنے آپ کو انسانی آزادی کے علم بردار کہلاتے ہیں اور کیا بیسویں صدی میں یہ غیر انسانی افعال تمدن و ترقی کی خاطر سرانجام دیئے جا رہے ہیں۔ کیا انسانی مساوات اسے ہی کہا جاتا ہے؟

جبکہ اسلام نے تیرہ سو سال قبل غلاموں کے متعلق اپنی کریمانہ روش کا اعلان کر دیا تھا اور احترام انسانیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر غلاموں کو زندگی کی دوڑ میں شامل کیا تھا اور اپنے عملی اقدامات سے دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ غلامی ایک عارضی کیفیت ہے اور انسانیت کو غلامی کی زنجیروں سے آخر آزاد ہونا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسلام نے اپنے عمل سے غلامی کے خلاف جہاد کیا جبکہ آج کے متمدن رہزن صرف زبان سے کہہ رہے ہیں کہ غلامی انحطاط ہے، غلامی پس ماندگی ہے اور غلام بنانا وحشیانہ اور بربریت پر مبنی فعل ہے۔

جی ہاں "تمدن کے گہوارے" امریکہ میں آج بھی یہ منظر آپ کو دکھائی دے سکتے ہیں کہ بعض فائیو اسٹار ہوٹلوں اور کلبوں پر بورڈ آویزاں ہیں جن کی عبارت یہ ہے: "سفید فام افراد کے لئے" اور بعض ہوٹلوں پر کمال بے شرمی سے یہ بورڈ بھی دکھائی دیتے ہیں: "سیاہ فاموں اور کتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

اس متمدن ملک میں رنگ کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ جب کسی سیاہ فام یا کسی ریڈانڈین (Red Indian) کو دیکھ لیں تو مار مار کر اس کی جان لے لیتے ہیں اور اس ملک کی پولیس جو جان و مال کی حفاظت پر مامور ہے اس منظر کو خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے حالانکہ اگر متعصب امریکی رنگ و نسل سے ذراہٹ کر سوچیں تو انہیں دکھائی دے گا کہ وہ جس شخص کے درپے آزار ہیں وہ بھی انہی جیسا انسان ہے اور ان کا ہم وطن اور ان کا ہم مذہب اور ان کا ہم زبان ہے۔ متعصب افراد کو بخوبی علم ہے کہ اس کا اس کے سوا اور کوئی جرم نہیں ہے کہ اس کی رنگت ان سے مختلف ہے۔

جن افراد نے امریکی معاشرے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات مخفی نہیں کہ ایسی سفید فام بدکار عورت جو کہ لوگوں کو دعوت گناہ دیتی ہو اور غیر مردوں کے باہوں میں جھولنا جس کا محبوب مشغلہ ہو اور جس کا کام ہی گناہ کو

فروغ دیتا ہو اگر ایسی کسی عورت کو کوئی سیاہ فام آنکھ بھی اٹھا کر دیکھ لے تو سفید فام امریکی اس کی آنکھیں نکالنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

جی ہاں! سیاہ فام کے لئے ایسی عورت کو دیکھنا ناقابل معافی جرم ہے اور سفید فام کے لئے اس سے ہم آغوش ہونا ترقی یافتہ ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ سب کچھ امریکہ میں ہو رہا ہے جسے تمدن کی بلند چوٹی کہا جاتا ہے اور جو بیسویں صدی کی تہذیب و تمدن کا روشن ستارہ ہے۔

آیئے! اب یورپ و امریکہ کی فضاؤں سے ہٹ کر ایک اور منظر دیکھیں :

ایک مجوسی غلام اپنے زمانے کے خلیفہ عمر بن الخطاب کو ڈھکے لفظوں میں قتل کی دھمکی دیتا ہے جسے خلیفہ اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں مگر قوت و اقتدار رکھنے کے باوجود نہ تو اسے قید کرتے ہیں اور نہ ہی اسے جلا وطن کرتے ہیں جبکہ وہ غلام دائرۂ اسلام میں بھی ابھی تک داخل نہیں ہوا تھا اور وہ بدستور آتش پرست تھا۔ اپنے باطل عقیدہ سے سر مو ہٹنا اسے پسند نہ تھا اور حق کی پیروی کا خواہش مند نہ تھا۔

یوں کہنا چاہئے کہ اہل مغرب کی نظر میں عمر حد درجہ سادگی کو پہنچا ہوا تھا کہ اس کی نظر میں جنس بشر کا اتنا مقام تھا کہ وہ خود یہ کہہ رہا تھا : "یہ آتش پرست غلام مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔"

پھر بھی عمر نے اسے آزاد کردیا تاکہ وہ اپنے کام کو سرانجام دے سکے اور تاریخ انسانیت میں بدترین جرم کا ارتکاب کر سکے اور عمر نے اسے اس لئے چھوڑ دیا کہ وہ اسلامی دارالحکومت میں مسلمانوں کے فرمانروا کو قتل کر سکے۔

آیئے دیکھیں آخر عمر کی کونسی مجبوری تھی کہ جس کی وجہ سے وہ اسے کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی یہ جرأت ہوئی کہ اس نے عمر کو قتل کردیا۔

جی ہاں! عمر کی بس ایک مجبوری تھی کہ اسے قانون اسلام جرم کے ارتکاب

سے پہلے کسی سے انتقام لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ عمر کی مجبوری یہ تھی کہ اسلام میں جرم سے پہلے قصاص لینا جائز نہیں ہے۔

پریس اور میڈیا کے دور میں کونسا شخص ہے جسے جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا علم نہ ہو اور جسے یہ علم نہ ہو کہ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو انسانیت کے مسلمہ حقوق سے محروم رکھا جارہا ہے؟ آخر ان کا قصور کیا ہے جسکی وجہ سے انہیں قتل کیا جاتا ہے اور اسکے ساتھ سنگدلی کی انتہا یہ ہے کہ انگلستان کے اخبارات و جرائد میں سیاہ فاموں کے قتل کو "شکار" کے لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جی ہاں! جنوبی افریقہ کے سیاہ فاموں کا یہی جرم ہے کہ انہوں نے آزادی کا نعرہ بلند کیا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ آزادی ہر انسان کا قانونی حق ہے اور ان تمام بھیانک جرائم کے باوجود کوتاہ نظر افراد برطانیہ کو انسانی حقوق کا علم بردار تسلیم کرتے ہیں اور ان سادہ لوحوں کو آج تک راہزن اور راہ نما میں تمیز کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور اس کے مقابلے میں انہیں اسلام ایک پسماندہ دین دکھائی دیتا ہے اور وہ اسلام کو وحشی قوم کا مذہب تصور کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں : ع بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے۔

جی ہاں! اسلام کا بس یہی جرم ہے کہ اس نے "جزائے مثل" کے کلیے کے تحت جنگی قیدیوں کو اسیر کیا تھا جبکہ اسلام اس ذریعے سے غلامی اور انسان فروشی کو ہرگز رائج کرنا نہیں چاہتا تھا۔

واقعی ان کوتاہ نظر افراد کی نگاہوں میں اسلام کا ناقابل معافی جرم یہ ہے کہ اس نے انسانوں کا شکار نہیں کیا تھا اور اس نے کسی کو سیاہ فام سمجھ کر اسے قتل نہیں کیا تھا اور ان کی نظر میں اسلام اس لئے پسماندہ مذہب ہے کہ اس نے اپنے پیروکاروں کو تعلیم دی تھی : "اگر ایک سیاہ فام حبشی غلام بھی تمہارا حاکم بن جائے تو

جب تک وہ حکم خداوندی کے خلاف قدم نہ اٹھائے اس کی اطاعت کرتے رہنا۔"

یہاں تک ہم نے غلاموں کے بارے میں اپنی معروضات پیش کیں۔

آیئے! کچھ کنیزوں کے متعلق بھی گفتگو کرتے چلیں کہ ان کے بارے میں اسلامی تعلیمات کیا ہیں؟

اسلام ہر اس شخص کو اجازت دیتا ہے جو میدان جنگ سے عورتوں کو گرفتار کر کے لائے کہ وہ ان عورتوں سے خدمت حاصل کر سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو ان میں سے کسی کو اپنی زوجیت کے لئے بھی منتخب کر سکتا ہے لیکن یہ اختیار صرف مالک کو ہی حاصل ہے۔

یورپ کو اس عمل سے چڑ ہے اور وہ اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ کنیزیں صرف اپنے مالکوں کے لئے ہی جائز ہوں۔ وہ ان میں عمومیت پیدا کر کے بے آسرا خواتین کو قومی ملکیت قرار دینا چاہتا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ میدان جنگ سے حاصل ہونے والی عورتوں پر سب کو تصرف حاصل ہونا چاہئے اور ہر شخص کو ان سے اپنی جنسی خواہشات پوری کرنے کی مکمل اجازت ہونی چاہئے۔

جی ہاں! یورپ نے آج تک اسلام کا یہ گناہ معاف نہیں کیا کہ آخر اس نے کنیزوں کو یہ احترام کیوں دیا اور لاوارث عورتوں پر رحم کیوں کیا اور شہوت پرستوں کے آگے انہیں نرم چارہ کے طور پر کیوں نہیں ڈالا؟ جبکہ دیگر ممالک میں ان عورتوں کو بے عفتی کی ڈھلان پر گھسیٹا جاتا تھا کیونکہ ان کا جرم یہ ہوتا تھا کہ ان کے سرپرستوں نے انہیں ہاتھ سے کھو دیا تھا اور وہ اپنے خاندان کی محبت کی گرمی سے دور پھینک دی گئی تھیں۔ دوسری طرف ان کے مالکان کو ان کی عزتوں کی حفاظت کا کوئی شعور نہ تھا اور ہرگز ان کے بارے میں کوئی غیرت نہیں رکھتے تھے۔ نتیجتاً یہ بے آسرا اور عالم بشریت سے نکالا ہوا گروہ عصمت فروشی پر مجبور کیا جاتا تھا اور ناموس کی

تجارت کے اس ناپاک ذریعے سے وہ سرشاری حاصل کیا کرتے تھے۔ مگر اسلام نے اس کی اجازت نہ دے کر اپنے پسماندہ ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اس سے بڑی پسماندگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے بے عفتی کو جائز قرار نہیں دیا اور زنا کو اجتماعی قوانین کا حصہ نہیں بننے دیا اور اسلام نے مردوں کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنی ازواج تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھیں اور اپنے جنسی تعلقات صرف اپنے جیون ساتھی تک ہی محدود رکھیں اور زنا کے قریب نہ پھٹکیں۔ اس طرح سے اسلام نے کنیزوں کو صرف ان کے مالک تک محدود کر دیا جو ان کی غذا، رہائش، حفاظت ناموس اور جنسی خواہشات پورا کرنے کے ضامن ہوں گے اور دوسروں کے لئے قدغن لگا دی۔

لیکن یورپ کا "پاک اور مہربان" ضمیر اس امر کو ہرگز جائز قرار نہیں دیتا اور نہ وہ اس کریمانہ روش کو دیکھنے کا خواہش مند ہے اور اس نے ردعمل کے طور پر زنا اور عفت فروشی کو رواج دیا اور ناموس فروشی کے اصول کو جائز قرار دیا اور اسے قانونی تحفظ فراہم کیا۔ یورپ کے استعمارگر جس میں ملک میں قدم رکھتے ہیں وہاں کے لوگوں کو "ترقی پسند" بنانے کے لئے زنا اور بے غیرتی کو رائج کرتے ہیں اور اسے قانونی تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

آج کے نام نہاد "متمدن" لوگوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا نام تبدیل کرنے سے غلامی کی حقیقت بدل جائے گی؟ اور جنس کو مادر پدر آزادی دینے کا صرف یہی مقصد ہے کہ کوئی بھی پاکباز خاتون کسی جنسی درندے کو اپنے سے دور نہ کر سکے اور وہ بلا چون و چرا اس کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر دے اور وہ روزانہ نفسانی پستی کی دلدل میں مزید دھنستی جائے اور دیو شہوت اپنی پوری جناتوں کے ساتھ ابلیسی رقص میں مصروف رہے۔

خدارا اس جنسی آزادی کا اسلام کے اس شریفانہ نظام سے موازنہ کریں جو

اس نے کنیزوں کے بارے میں قائم کیا تھا اور پھر اپنے ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کریں کہ اسلام حافظِ ناموس زن ہے یا آج کا یورپ عورتوں کے حقوق کا محافظ ہے؟ اور کیا تاریخ کے کسی دور میں بھی مسلمانوں نے اس قحبہ گری کو جائز قرار دیا تھا؟ اسلام نے کسی کو دھوکے میں رکھنا گوارا نہیں کیا اور اس نے صراحت سے یہ اعلان کیا کہ "نسل انسان کو غلام بنانے والو اور نوع انسان کی خرید و فروخت کرنے والو! غلامی کے بھی کچھ حدود و قواعد ہیں اور اسیر عورتیں بھی ان حقوق کی مستحق ہیں۔ لہذا ان سے متعلق بھی قوانین کا احترام کرنا بہت ضروری ہے۔"

اسلام نے کبھی یہ موقف اختیار نہیں کیا کہ نظامِ غلامی ابدالآباد کے لئے ہے اور اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ غلامی کو مستقبل میں بھی باقی رہنا چاہئے۔

بلکہ اسلام نے ہمیشہ سے ہی یہی پیغام دیا کہ غلامی مستقل نظام نہیں ہے یہ صرف جنگی ضرورت کے پیش نظر ایک وقتی ضرورت ہے اور جب بھی انسان متحد ہو کر یہ فیصلہ کرلیں گے کہ آئندہ کسی کو غلام نہیں بنایا جائے گا تو اس دن غلامی کے خاتمے کا اعلان کردیا جائے گا۔

مگر افسوس ہے کہ آج کا پلید تمدن زنا اور بدکاری کو رواج دے رہا ہے اور اسے انسانیت کی عظیم خدمت قرار دیتا ہے اور یہ نظریہ رکھتا ہے کہ جنسی آزادی پر کوئی قدغن نہیں ہونا چاہئے اور جنسی آزادی ایک اجتماعی ضرورت ہے جسے معاشرہ سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

ضرورت ہے کہ اس بے رحم تمدن سے یہ سوال کیا جائے کہ آخر بے غیرتی، اجتماعی ضرورت کب سے بنی ہے اور انسانوں کے لئے یہ کیوں ضروری ہے؟

اس سوال کا جواب ہمارے پاس موجود ہے۔ اہل یورپ نے بے غیرتی اور فحاشی کو اجتماعی ضرورت اس لئے قرار دیا ہے کہ آج کا "متمدن" یورپی بیوی، بچوں کی

ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ نہیں ہے اور اس کی یہ خواہش ہے کہ عورت عریاں ہوکر اس کے سامنے آئے اور وہ اس سے ہمیشہ متمتع ہوتا رہے اور اس جنسی تمتع کے عوض اسے کچھ پابندیوں سے بھی سابقہ نہ پڑے اور اسی سوچ کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس سوچ کا مرد اسطرح کے منحوس تمدن میں چارپایوں کی مانند ہوگیا جو راستوں میں آداب و رسوم کی پاسداری کئے بغیر اپنی ہم جنس مادہ سے ملاپ کرتے ہیں اور جہاں تک ہوسکتا ہے اپنی شہوت کا مظاہرہ کرتے اور اپنی راحت و آرام کا سامان کرتے ہیں۔

اسی طرح عورتیں بھی اس تاریک تمدن کے سائے میں چلتے پھرتے چوپایوں کی مانند شہوت کے مظاہروں کا باعث بنتی ہیں، کسی ایک شخص کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتیں بلکہ ہر راہ چلتا جو چاہتا ہے ان سے حاصل کر لیتا ہے۔

یورپ نے اس بے غیرتی کو عصر حاضر کی اجتماعی ضرورت قرار دے کر عورتوں پر بدترین غلامی مسلط کردی ہے (اور چراغ خانہ کو شمع محفل بناکر بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ "قرون مظلمہ" میں بھی کنیز عورتوں کا اتنا استحصال کبھی نہیں ہوا تھا جتنا کہ آج ہو رہا ہے) اگر آج یورپ کا مرد اس بے حیائی کے تالاب سے باہر نکل کر خود کو انسانیت کی لامتناہی فضا میں پہنچائے اور اپنے دیوِ شہوت پر پابندی عائد کردے تو اسے یقیناً یہ علم ہوجائے گا کہ جنسی آزادی ہرگز اجتماعی ضرورت نہیں ہے اور مذکورہ تمام معروضات سے عجیب تربات یہ ہے اور جس کا آج کل بڑے زور و شور سے پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ یورپی ممالک میں زنا کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔

اس کیلئے ہم اپنے محترم قارئین کو اصل حقیقت سے باخبر کرنا چاہتے ہیں کہ یورپ میں زنا کے غیر قانونی ہونے کا اعلان اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان کا ضمیر جنسی آزادی کو پسند نہیں کرتا تھا اور یہ اعلان اس لئے بھی نہیں کیا گیا کہ اہل یورپ پاکیزہ زندگی کے خواہش مند بن گئے ہیں یا انہوں نے اپنے نفس امارہ کو شکست دے دی ہے

اور وہ شیطان کے جال سے باہر نکل آئے ہیں۔ تو یقین کیجئے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ان کا وجدان و ضمیر مرچکا ہے جس کے زندہ ہونے کے کہیں آثار تک دکھائی نہیں دیتے۔

اصل بات یہ ہے کہ یورپ کے غیرت سوز معاشرے میں طوائفوں نے اپنے محلے بنالئے تھے جہاں جنسی درندے جاکر اپنی جنسی پیاس بجھایا کرتے تھے اور اسکے عوض انہیں تھوڑی بہت رقم دے دیتے تھے۔ مگر اسکے بعد برائی مزید پھیل گئی اور طوائفوں کی دیکھا دیکھی باقی دختران یورپ نے بھی "رضاکارانہ" طور پر اپنی خدمات معاشرے کے حوالے کردیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی عورتیں ہوس رانی میں مردوں سے کم نہیں ہیں۔ (جسکی وجہ سے وہاں کی حکومتوں نے زنا کو جرم قرار دیدیا۔ یعنی اس قانون کا مقصد یہ ہے کہ طوائفوں کے کوٹھے اب آباد نہیں رہنے دیئے جائیں گے اور "رضاکارانہ" خدمات پیش کرنے والی دختران یورپ کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔)

اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز یہ ہے کہ اس تمام رسوائی کے باوجود مغربی دنیا جو روز بروز نظام جبر اور عورتوں پر غلامی مسلط کرنے میں آگے بڑھتی جارہی ہے دین اسلام پر عیب لگاتی ہے اور ہر جگہ تحریروں میں اسے اجاگر کرتی ہے۔ حالانکہ تیرہ صدیوں قبل یہ کاروبار بند کردیا گیا تھا اور اسلام کی طرف سے اعلان کردیا گیا تھا کہ یہ نظام محض عارضی ہے اور اسے ہمیشہ نہیں چلنا۔

اس وصف کے ساتھ اب بھی اسلام ہر نظام سے زیادہ پاکیزہ ہے اور درخشاں بیسویں صدی میں مغربی تاریک دنیا اور آج کے سیاہ تمدن میں باقی ہے اور خود کو فطرت سے قریب ترین نظام کے طور پر منوا رہا ہے۔ اس طرح کہ کوئی مغربی انسان اسے پست اور گھٹیا نہیں سمجھتا نہ اسے اختیار کر لینے پر قابل ملامت ٹھہراتا ہے۔

اگر قحبہ گری کے اس نظام کے دفاع میں کوئی بدبخت یہ کہے کہ یورپ کی عورتیں آزاد ہیں اس لئے ان پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا مناسب نہیں ہے اور ایک آزاد انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو بلا روک ٹوک پورا کرسکتا ہے اور

پھر اسی دلیل کو ہم بھی اپنالیں اور یہ کہیں کہ بہت سے غلاموں کو آزادی دی گئی تھی مگر انہوں نے اپنی آزادی پر سابقہ غلامی کو ترجیح دی تھی اور آزاد ہونے سے انکار کردیا تھا لہذا وہ آزاد تھے اور اگر انہوں نے اپنے لئے غلامی کا انتخاب کیا تو انہیں اسکا پورا حق حاصل تھا۔

مگر خدا گواہ ہے کہ ہم غلامی کے جواز کے لئے اس طرح کی بودی دلیل دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ نہ دین اسلام میں، نہ دیگر تمام ادیان میں کبھی اس کا رواج رہا۔ نظام غلامی سے ہمارا مقصود ایسا نظام ہے جو انسانی معاشرہ کو سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، فکری اور روحانی طور پر غلام بنا رہا ہے یا پھر ایسے حالات پیدا ہوچکے ہیں کہ یہ قافلۂ انسانیت خودبخود انسان فروشی کا شکار ہوتا جارہا ہے کیونکہ اس کے سامنے راہِ چارہ مسدود ہوچکی ہے اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس صورتحال کو قبول کرلیا ہے۔ آج دنیا کا ہر فرد یہ جانتا ہے کہ آج کے "تہذیب پرور" یورپ نے عورتوں کا بدترین استحصال کیا ہے اور انہیں گروہ در گروہ زنا کی دلدل میں دھکیل دیا ہے اور ان کے ضمیر سے غیرت اور حیا کا مفہوم تک سلب کرلیا ہے اور زنا کو قانونی تحفظ فراہم کیا ہے۔ (جس کی وجہ سے یورپی معاشرہ میں شوہر پرست عورت اور طوائف کا فرق تک مٹ چکا ہے اور اس مادر پدر آزاد معاشرے میں کنواری ماؤں کا تناسب روز بروز بڑھ رہا ہے) اس میں رقم لیکر بدکاری کرنے والی عورتیں بھی شامل ہیں اور "رضا کارانہ" طور پر اپنے جسم کو پیش کرنے والی جنسی بلیاں بھی شامل ہیں۔

جی ہاں! یہ بیسویں صدی کے یورپ کی بدترین غلامی کی داستان ہے۔ یہ ہرگز آزادی نہیں ہے یہ مردوں اور عورتوں کی غلامی ہے۔ یہ اقوام و ملل اور ان کی نسلوں کی بدترین غلامی ہے۔ علاوہ ازیں کسی قوم کے قدرتی وسائل کو غارت کرنا بھی بدترین غلامی ہے۔ کسی سرزمین کے خام مال کی وجہ سے اس پر قبضہ کرنا اعلیٰ درجے کا استحصال ہے جس کے محرکات ہر وقت یورپ کے معاشرے میں موجود ہیں اور یقیناً اس غلامی کا محرک استعماری مقصد ہے اور اس کا محرک وہ نہیں ہے جس کی وجہ سے

اسلام نے وقتی طور پر غلامی کے نظام سے سمجھوتہ کیا تھا اور دنیا کی اس سیاہ ترین غلامی کے محرک کو اہل یورپ کے استعمار پسند قلب و ضمیر میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

آپ مصائب و آلام میں جکڑے ہوئے کمیونسٹ معاشرے کو اس کے حال پر چھوڑدیں تاکہ کمیونسٹ حکمران اپنے دلفریب نعروں سے اپنے اہل مملکت کا مکمل استحصال کر سکیں اور پورے ملک کو زندان اور بندی خانہ میں تبدیل کر سکیں جہاں کسی کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی اجازت حاصل نہ ہو اور جہاں کوئی شخص اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہ تو روزی حاصل کر سکے اور نہ ہی مکان تعمیر کر سکے۔ جہاں پورا ملک ایک وسیع تر زندان کی کیفیت میں بدل جائے اور افراد ملت استعمار گروں کے لئے نرم چارہ بنے رہیں۔

آپ کمیونسٹ بلاک اور سرمایہ دار بلاک دونوں سے علیحدہ ہو جائیں اور ان کے دلفریب نعروں کے جال میں نہ پھنسیں۔ یقیناً دونوں معاشروں کے کرتا دھرتا بظاہر روشن چہرے رکھتے ہیں لیکن ان کا اندرون چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔ آپ کی سلامتی اسی میں ہے کہ ان کے دھوکے اور فریب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

آپ نے قدیم غلامی کی داستانیں پڑھیں اور جدید غلامی کو بھی آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جسے "جدیدیت" اور اجتماعی ضرورت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جب آپ مشرق و مغرب کے ستم کاروں اور مشرق و مغرب کے منحوس الووٴں سے اپنے فکر کو آزاد کرلیں تو پھر دونوں نظاموں کا جائزہ لے کر خود ہی اپنے ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کریں کہ کیا اسلام کے نور ہدایت سے ہٹ کر انسان نے ترقی کی ہے یا بتدریج غلامی کے گڑھے میں گرتا چلا گیا ہے؟

ترقی معکوس کا یہ سفر ابھی تک جاری ہے اور انسانیت کو آج پہلے سے بھی زیادہ اسلام کی رہنمائی کی ضرورت ہے تاکہ اس وسیلے سے انسان بدبختی اور نادانی کے تاریک گرداب سے نجات حاصل کر سکے اور سابقہ اشتباہات کی تلافی ہو سکے۔